جس میں ۳۲ مشہور اسلامی خواتین کی سوانح عمریاں اور اُن کے مفید و مستند
تاریخی حالات ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً دس سال تک علی گڑھ کے رسالہ خاتون میں
شائع ہوتے رہے۔ اور اب اُن سب کا مجموعہ بترتیب و نظر ثانی

حافظ محمد اسلم جیراج پوری

شائع کیا جاتا ہے

باہتمام عبد اللطیف پرنٹر

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوئی

سنہ ۱۹۱۴ء

بار اول ۵۰۰ جلد — پبلیشر حافظ محمد اسلم جیراجپوری از علی گڑھ — قیمت فی جلد عہ

فہرست مضامین کتاب خواتین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

رسالہ خاتون کو جاری کیے ہوئے آج تقریباً دس سال کا زمانہ گزرا۔ اس عرصہ میں اس رسالہ کے ذریعہ سے تعلیم نسواں کی اشاعت کے علاوہ ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علمی۔ ادبی۔ اخلاقی۔ اصلاحی اور تاریخی وغیرہ ہر قسم کے مضامین کا عورتوں کے لیے ایک اچھا ذخیرہ فراہم ہوگیا۔ جن سے مختلف قسم کے کئی عمدہ مجموعے منتخب کیے جا سکتے ہیں۔

تاریخی مضامین کے سلسلہ میں دنیا کی اکثر قوموں کی نامی گرامی اور مشہور خواتین حالات اس رسالہ میں شائع ہوئے ہیں۔ بالفعل ہم نے چاہا کہ جس قدر مسلمان خواتین سوانح عمریاں ابتک اس رسالہ میں نکل چکی ہیں اُن کا ایک مجموعہ مرتب کر کے ئع کریں۔ تاکہ جو بیش بہا موتی جابجا بکھرے پڑے ہیں وہ ایک لڑی میں آجائیں

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جس نے دلچسپی لی وہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری ہیں۔ انھوں نے اب تک برابر خواتین اسلام کے سلسلہ کو اس رسالہ میں قائم رکھا۔ اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کام کو انھیں کے سپرد کریں اور وہی ان پر نظر ثانی کر کے ان کا مجموعہ شائع کریں۔

ہم کو امید ہی کہ اگر یہ سلسلہ خاتون میں اسی طرح جاری رہا تو آیندہ ہم مسلمان خواتین کے حالات کی دوسری جلد اور دیگر اقوام کی عورتوں کے حالات کے مجموعے بھی شائع کر سکیں گے۔

خاکسار
عبد اللہ

۲۴۔ اپریل سنہ ۱۹۱۴ء

ام المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ

یہ نام جو عنوان پر لکھا ہوا ہی کسی معمولی شخص کا نام نہیں ہی۔ بلکہ اُس مقدس خاتون کا نام ہی جس نے تمام مردوں اور عورتوں سے پیشتر اسلام کی روشن شاہراہ میں قدم رکھا۔ اور سب سے پہلے اس سچے مذہب کی حقیقت کو سمجھا۔ ارباب سیر اور محدثین بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے اوّل جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا وہ یہی مقدس خاتون ہیں۔

ان کے نسب کا سلسلہ اس طرح پر ہی۔ خدیجہ بنت خویلد۔ ابن اسد بن عبدالعزی بن قصی قریشی۔ ان کی والدہ فاطمہ بنت زائدہ بھی قریشی تھیں۔

ان کے والد خویلد قریش میں ایک معزز سردار تھے۔ اور سب سے زیادہ دولت انکے پاس تھی۔ انکے مرنے کے بعد تمام دولت حضرت خدیجہ کو ملی۔ قریش میں ان کی بہت زیادہ عزت تھی۔ نہ صرف مال کی وجہ سے بلکہ نیکی۔ حسن اخلاق میں بھی یہ ایک ممتاز درجہ

رکھتی تھیں۔ اسی وجہ سے ان کا لقب جاہلیت میں طاہرہ تھا۔

ان کا نکاح پہلے عتیق بن عابد مخزومی کے ساتھ ہوا تھا۔ اُن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جسکا نام ہند تھا۔ انھیں کے بیٹے محمد مخزومی ہیں۔ اس کے بعد دوسرا نکاح ابو ہالہ سے ہوا۔ جو تمیم میں سے تھے۔ اُن سے ایک لڑکا پیدا ہوا اُن کا نام بھی ہند رکھا گیا۔ وہ حضرت علیؑ کے ہمراہ جنگ جمل میں شریک ہو کر کام آئے۔

ابو ہالہ کے مرنے کے بعد خدیجہؓ نے پھر نکاح کا ارادہ نہیں کیا۔ دنیا سے انکی طبیعت اُچاٹ تھی۔ اکثر خانہ کعبہ میں جاتیں اور وہیں اپنی عبادت کیا کرتیں۔ طبیعت کا میلان بالکل نیکی کی طرف تھا اس لیے کاہنہ عورتیں جو اُس زمانہ میں بہت بزرگ خیال کی جاتی تھیں انکے پاس آتی تھیں۔ یہ اُن کی باتیں نہایت خوش اعتقادی سے سُنتیں، اور اُن کی خاطر و مدارات کرتیں۔

بہت سے قریش کے سردار اس خواہش میں تھے کہ ان سے شادی کریں۔ کیونکہ مالدار اور دولتمند ہونے کے علاوہ حسُن میں بھی یہ تمام قبیلہ میں بے نظیر تھیں۔ علاوہ بریں اعلیٰ درجہ کی منتظم اور نہایت عقیل تھیں۔ گھر کا۔ اور باہر کا سب انتظام بہت اچھی طرح رکھتی تھیں۔ لیکن اُنھوں نے پسند نہ کیا۔

قریش کا قبیلہ تجارت پیشہ تھا۔ اور تجارت کو وہ لوگ اسقدر ضروری خیال کرتے تھے کہ جو شخص اُن میں سے تجارت نہیں کرتا تھا اُسکو آدمی نہیں سمجھتے تھے۔ اُسوقت ملک شام تجارت کا مرکز تھا۔ قریش کا قافلہ سال میں ایک مرتبہ تجارت کے لیے وہاں جایا کرتا تھا۔ حضرت خدیجہ بھی وہیں اپنے تجارتی سامان کے اونٹ بھیجتیں۔ اُن پر کسی کو ملازم رکھدیتیں اور اپنے غلاموں کو ساتھ کر دیتیں۔

ایک سال بہت ہی سخت قحط تھا اور عرب کے لوگ نہایت پریشان تھے ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "تمھارا نام عرب میں امین دیانتدار

مشہور ہو گیا ہے۔ لوگ تمہاری سچائی اور دیانت داری پر اعتماد رکھتے ہیں کہ اسوقت شام کے ملک میں قافلہ جانے کو تیار ہے۔ خدیجہ رضہ اپنے اونٹوں کے ہمراہ ایک شخص کو اجیر (ملازم) کر کے بھیجتی ہیں۔ اگر تم اُن سے کہو تو کیا عجب ہے کہ تمہیں کو اس کام کیلیے وہ پسند کریں۔ کیونکہ بہت قحط ہے ہم لوگ تباہ ہو رہے ہیں۔ کوئی صورت آمدنی کی کرنی چاہیے کہ آپ نے جواب میں فرمایا کہ "بہت ممکن ہے کہ وہ بلا درخواست کے یہ کام میرے سپرد کریں" کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ میری امانت داری کی شہرت ہے۔ اور وہ امین آدمی تلاش کرینگی اس لیے کوئی تعجب نہیں ہے کہ پہلے ان کی نظر مجھی پر پڑے گی"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب حضرت خدیجہؓ نے اپنے ایک آدمی سے ابوطالب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کا حال سُنا تو آپ کے پاس کہلا بھیجا کہ میں اپنے تجارتی سامان کے اونٹ آپ ہی کے سپرد کرتی ہوں۔ اور پہلے لوگوں کو میں جسقدر اُجرت دیا کرتی تھی اُس کا دوگنا آپ کو دوں گی۔ یہ سُنکر ابوطالب بہت خوش ہوئے۔

قافلہ شام کی طرف روانہ ہوا۔ حضرت خدیجہ نے اپنے غلام میسرہ کو بھی آپکے ہمراہ کر دیا تھا۔ اور اُسکو تاکید کر دی تھی کہ امین (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کیونکہ اُسوقت اسی نام سے مشہور تھے) کی نافرمانی نہ کرنا اور ان کی خدمت بجالانا۔

جب شام کے متصل پہونچے تو ایک مقام پر قافلہ اُترا۔ آپ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھے۔ اُسکے قریب ہی ایک راہب (یہودی عالم) کا جھونپڑا تھا جسکا نام نسطورا تھا۔ میسرہ وہاں کسی کام کے لیے گیا۔ راہب نے پوچھا کہ اس درخت کے نیچے کون شخص اُترا ہے۔ میسرہ نے آپ کا نام لیا۔ اُس نے جُھک کے دیکھا۔ اور میسرہ سے پوچھا کہ کیا اُس شخص کی آنکھوں میں سرخی ہے۔ اُس نے کہا ہاں۔ وہ فوراً ایک ورقہ توریت کا ہاتھ میں لیے ہوئے آپ کے پاس آیا۔ شکل وصورت دیکھتا جاتا تھا۔ اور اُس ورق کو

پڑہتا جاتا تھا۔ قریش کے بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ یہ کوئی منتر پڑھ رہا ہی۔ چاروں طرف سے تلوار لیکر اُس راہب کو مارنے کے لیے دوڑ پڑے۔ لیکن وہ اپنے صومعہ میں بھاگ گیا دروازہ بند کرلیا۔ اور اوپر سے آکے کہنے لگا کہ تم لوگوں کا خیال غلط ہی۔ میں اس شخص کی صورت کو اپنے نبی کی پیشین گوئیوں سے ملا رہا تھا جسکو میں نے بالکل پورا پایا۔ یہ شخص وہی نبی ہی جس کی آسمانی کتابوں میں پیشین گوئی کی گئی ہی اور یہ عنقریب برہنہ شمشیر اور لمبے نیزے کے ساتھ مبعوث ہوگا۔

اس کے بعد آپ بازار میں تشریف لے گئے۔ وہاں اموال تجارت کو فروخت کیا آپ کی دیانت داری اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس سال ہر سال کی بہ نسبت دوگنے سے زیادہ نفع حاصل ہوا۔ آپ اللہ کا شکر کرتے ہوئے خوشی کے ساتھ وہاں سے واپس ہوئے۔

تمام رستہ میں آپ کا برتاؤ ہر ایک کے ساتھ خوش معاملگی کا تھا۔ میسرہ جان و دل سے آپ کا مطیع تھا۔ اور جسوقت قافلہ واپس آیا تو حضرت خدیجہ کے پاس پہونچکر اُس نے تمام حالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر کی اور نسطورا کا قصہ بیان کیا۔ اور حد سے زیادہ اُن کی تعریف کی۔ اس کے بعد سب مال و منافع پیش کیا۔ حضرت خدیجہ اس غیر معمولی نفع کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کی مقررہ اُجرت سے بھی دُگنا دیا۔

دوبارہ پھر حضرت خدیجہ نے یمن کے بازار جاشہ میں آپ کو بھیجا۔ وہاں بھی اچھا نفع حاصل ہوا۔ آپ وہاں سے کپڑے خریدتے لائے جس کی تجارت سے مکہ میں بہت فائدہ ہوا۔ یہ سفر بھی آپ کا بہت کامیاب ہوا۔

حضرت خدیجہ آپ کے حسن معاملت اور دیانت داری سے بیحد خوش ہوئیں۔ اسکے علاوہ چونکہ نسطورا راہب وغیرہ کا قصہ سُن چکی تھیں اس لیے اُن کو یقین ہوگیا

تھا کہ آنحضرت کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں اور یہی وجہ تھی جسنے اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی ترغیب دلائی۔

نفیسہ جو حضرت خدیجہ کی لونڈیوں میں تھیں کہتی ہیں کہ خدیجہ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ سے بہت قدر تھی۔ اور اُن کے اخلاق اور راستی پر وہ فدا تھیں۔ جب حضرت دوسری بار یمن کے بازار سے واپس آئے تو خدیجہ نے مجکو بطور پیغامبر کے آپ کے پاس بھیجا۔ میں نے جاکر عرض کیا کہ آپ نکاح کرنا چاہتے ہیں ؟ فرمایا کہ میرے پاس اسوقت نہ کچھ مال ہے نہ سامان۔ نکاح کیونکر کروں۔ میں نے کہا کہ اس کی ذمہ دار میں ہوں۔ اور ایسی جگہ نکاح کراؤں گی جہاں مال۔ جمال۔ شرافت اور اطاعت سب کچھ ہو۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ میں نے کہا خدیجہؓ۔ فرمایا کہ کیونکر اسکا سرانجام ہوگا۔ میں نے کہا کہ سب کچھ میں کرلونگی۔ یہ کیفیت میں نے آکر خدیجہ سے بیان کی۔ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوایا۔ اور کہا کہ مجکو آپ کی طرف صرف اس لیے رغبت ہے کہ آپ کی کوئی بات کبھی میں نے جھوٹی نہیں پائی، اور آپ کے اخلاق بہت اچھے ہیں۔

آپ اپنے چچا ابو طالب کے پاس گئے اُن سے یہ حال بیان کیا وہ بہت خوش ہوئے۔ خدیجہؓ نے بھی اپنے چچا عمرو بن اسد اور تمام قبیلے کو جمع کیا۔ ابو طالب نے نکاح کا خطبہ پڑھا۔ حضرت حمزہ نے بیس اونٹ مہر میں دیئے اور نکاح ہوگیا۔ اُسوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس سال کی تھی اور خدیجہؓ کی چالیس سال۔

اس نکاح کے بعد چونکہ آپ کو دولت مل گئی اسوجہ سے آپ کی عزت اور وقعت بڑھ گئی۔ اور دنیوی اسباب کے لحاظ سے رسالت کی کامیابی کی شاہراہ اُسی وقت سے کھُل گئی۔ کیونکہ اس کے بعد آپ کو فارغ البالی اور اطمینان کے ساتھ اپنے اُس کام کے لیے کوشش کرنے کا موقع مل گیا جسکے لیے مشیت ایزدی نے

دنیا میں آپ کو بھیجا تھا۔ اکثر غارِ حرا میں چلے جاتے اور وہیں عبادت کیا کرتے۔ حضرت خدیجہ ہر ایک کام میں آپ کی مرضی کے مطابق مدد کرنے کے لیے تیار رہتیں۔ جسوقت چالیس برس سے آپ کا سن شریف متجاوز ہوا اُس وقت رسالت عطا ہوئی۔

غارِ حرا میں آپ خدا کی زبردست نشانی (روح الامین) کو دیکھ کر ڈر گئے۔ کانپتے ہوئے گھر میں آئے۔ اور کہا کہ۔ زملّونی۔ زملّونی (مجکو چادر اُڑھاؤ) پھر جب آپ کی طبیعت کو کچھ سکون ہوا تو حضرت خدیجہ سے تمام کیفیت بیان فرمائی۔ حضرت خدیجہ نے ہر طرح پر تسکین دلائی۔ اور کہا کہ تم صدقہ دیتے ہو۔ قرابت مندوں کے ساتھ سلوک کرتے ہو۔ تمہارا شیوہٗ احسان ہے۔ تم اللہ سے ڈرتے ہو۔ کیا تم کو اللہ ضائع کریگا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ پھر آپ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو کہ گزشتہ آسمانی کتابوں کے بہت بڑے عالم تھے اُن سے سارا حال بیان کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ علامت تمہاری نبوّت کی ہے۔ تمھیں اللہ تعالیٰ سرفراز کریگا اور تمھاری قوم تم کو یہاں سے نکالدے گی۔

آپ نے تعجب سے فرمایا کہ کیا مکّے سے لوگ مجکو نکال دینگے؟ اُنھوں نے کہا کہ ہاں۔ جسقدر نبی گذرے ہیں سب کے ساتھ اُن کی قوم نے ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ تم کو لوگ ضرور نکالیں گے۔ کاش اُسوقت تک میں زندہ رہتا تو تمھارا ساتھ دیتا

ورقہ بن نوفل کا یہ کلام سُنکر اور خدیجہؓ کی باتوں سے آپ کو تسکین ہوگئی۔ اور جب کبھی کسی قسم کی گھبراہٹ آپ کی طبیعت کو ہوتی تو حضرت خدیجہ ہی تسکین دلاتیں اور ہمت بندھاتیں۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ "میں جب کفار سے کوئی بات سنتا تھا اور وہ مجکو ناگوار معلوم ہوتی تھی تو خدیجہؓ سے کہتا تھا وہ اس طرح سمجھاتی تھیں کہ اُس سے میرے دل کو

تسکین ہوجاتی تھی اور کوئی رنج مجکو نہیں ہوتا تھا۔ کہ خدیجہؓ کی باتوں سے وہ ہلکا اور آسان نہ ہو جائے؛؛ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ کسقدر ثابت القلب اور مستقل مزاج تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اولوالعزم اور بھاری بھرکم رسول کی ٹوٹی ہوئی ہمت بندھایا کرتی تھیں۔ اس طرح پر وہ آنحضرت کی نہ صرف زندگی کی شریک تھیں بلکہ رسالت کی کامیابی میں بھی ایک قوی اور زبردست بازو تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی وفات کے بعد اکثر اُن کی تعریف کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اکثر جب آپ گھر میں تشریف لاتے تو خدیجہؓ کا ذکر کرتے اور بیحد اُن کی تعریف فرماتے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ خدیجہؓ سے اچھی کوئی بیوی مجکو نہیں ملی۔ وہ ایمان لائی اور سب لوگ کافر تھے۔ اس نے میری تصدیق کی۔ اور سب لوگ مجکو جھٹلاتے تھے اُس نے اپنے مال سے میری مدد کی اور سب لوگوں نے مجکو محروم رکھا۔ اُس سے اللہ نے مجھے اولادیں عطا کیں اور کسی بیوی سے اولاد نہ ہوئی۔

جس طرح حضرت خدیجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانُ دل سے مددگار مطیع اور فرماں بردار تھیں۔ اسی طرح حضرت بھی اُن کی قدر کرتے تھے۔ اپنے تمام معاملات میں اُن سے مشورہ لیتے اور ان کی رائے سے کام کرتے اسی وجہ سے اُن کی وفات سے آپ کو سخت صدمہ ہوا۔ کیونکہ اُن سے ہر طرح کا آپ کو آرام و اطمینان حاصل تھا۔ اُن کی صاحب رائے اور تدابیر کی وجہ سے کفار مکہ آپ کو زیادہ تکلیف نہیں پہونچا سکتے تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد ہی ابوطالب بھی مر گئے۔ اور چاروں طرف سے کفار نے سر اُٹھایا اور ستانا شروع کیا۔

حضرت خدیجہ نے ۶۵ برس کی عمر میں ہجرت سے تین سال پیشتر رمضان کے مہینہ میں وفات پائی اور مکہ کے مشہور قبرستان حجون میں دفن کی گئیں۔ اُسوقت

جنازہ کی نماز بھی نہیں پڑھی جاتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولادیں سوا ے حضرت ابراہیم کے انہیں سے تھیں۔ سب سے پہلے قاسم پیدا ہوئے جو چار برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انھیں کے نام سے آپ کی کنیت ابو القاسم ہوئی۔ پھر زینب۔ اس کے بعد عبد اللہ۔ پھر رقیہ۔ پھر ام کلثوم۔ پھر فاطمہ زہرا۔ عبد اللہ نے بھی جن کا لقب طیب و طاہر تھا دو برس کی عمر میں انتقال کیا۔

حضرت خدیجہ ان بچوں کی پرورش اور تربیت نہایت محبت اور پیار کے ساتھ کرتی تھیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ "کانت ربۃ البیت وام العیال" (گھر کی مالک اور بچوں کی ماں تھی) رحمہا اللہ ورضی عنہا۔

ان کی فضیلتیں حدیثوں میں بہت کثرت سے ہیں۔ بخاری میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے بہتر اس امت کی عورتوں میں خدیجہؓ ہیں اور گزشتہ امت میں مریمؑ۔

بیشک اسلام کی جڑ جمانے کی ابتدائی کوششیں۔ تن۔ من دھن سے رسالت کی مدد۔ اور اولیت اسلام یہ ایسی خصوصیتیں ہیں جو ہر طرح پر حضرت خدیجہؓ کو اس امت کی تمام عورتوں سے بہتر ہونے کا درجہ دیتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں وجوہات سے فرمایا تھا کہ خدیجہ اللہ تعالی تم کو بشارت بھیجتا ہے کہ تمھارے لیے جنت میں ایک محل تیار ہے۔

ان کی وفات کے بعد آنحضرت ہمیشہ ان کی تعریف اور انکے لیے دعا فرماتے اور جب کوئی قربانی کرتے تو پہلے ان کی سہیلیوں کو گوشت بھیجدیتے اسکے بعد کسی کو دیتے اُن کا کوئی رشتہ دار جب آپکے پاس آتا تو بہت زیادہ اُس کی خاطر مدارات کرتے جبتک خدیجہؓ حضرت کے نکاح میں تھیں اُسوقت تک آپنے دوسرا نکاح نہیں کیا

حضرت فاطمہؓ

نام فاطمہؓ۔ لقب زہرا ہے۔ نسب کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ دنیا میں سب سے بڑے باپ کی بیٹی ہیں جس پر تمام مکارم فضائل۔ انسانی شرافت اور خوبیوں کا خاتمہ ہو گیا اور ان کی والدہ خدیجۃ الکبریٰؓ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے رسالت کی تصدیق کی۔ اور جنکے فضائل اسقدر ہیں کہ اس امت میں اُن کا وہی درجہ ہے جو گزشتہ امت میں حضرت مریمؑ کا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کل سات اولادیں ہوئیں جن میں سے آپ کے صرف ایک بیٹے ابراہیمؑ ماریہ قبطیہ سے تھے۔ اور باقی کل حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے تھیں۔ لیکن کسی سے سوائے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نسل نہیں چلی۔ حضرت فاطمہؓ اپنے تمام حقیقی بھائی بہنوں سے چھوٹی ہیں۔ ان کی ولادت مکہ میں ہوئی۔ اُسوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سن مبارک ۳۵ سال کا تھا۔

بچپن ہی سے حضرت فاطمہؓ کی طبیعت میں بہت زیادہ متانت اور سادگی تھی ان کی اور بہنیں کھیلنے لگتیں لیکن ان کا جی کھیل میں نہ لگتا۔ وہ اکثر اپنے قبیلہ کے اور گھروں میں چلی جاتیں لیکن یہ کہیں جانا پسند نہ کرتیں۔ ہمیشہ اپنے محترم والدہ کے پاس ہی رہتیں۔ اُن کی یہ سادگی متانت اور استغنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد پسند تھی۔ اسلیے آپ ان کو بتول (تارک الدنیا) کہا کرتے تھے۔ اور انکے ساتھ جسقدر آپ کو محبت تھی اُتنی اور کسی اولاد کے ساتھ نہ تھی حالانکہ ان کی بعض دوسری بہنیں انسے زیادہ خوبصورت اور تیز فہم تھیں۔

ابھی ان کی عمر پورے پندرہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ محترم والدہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اسی سال قضا الٰہی سے ابو طالب نے بھی انتقال کیا جو حضرت علیؓ کے باپ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور زبردست حامی تھے۔ ان دونوں واقعات سے آنحضرت کو اسقدر رنج ہوا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ ہم کو خوف تھا کہ آپ کی حالت غیر نہ ہو جائے ایسی حالت میں حضرت فاطمہؓ کے رنج وغم کا اندازہ لگانا ایک مشکل امر ہے۔ ادھر ماں کی وفات کا صدمہ۔ اُدھر باپ کی پریشانی۔ علاوہ بریں ابو طالب کے مرنے سے کفار مکہ حضرت کو ستانے لگے تھے اسکا رنج۔ غرض ایک مصیبت کا پہاڑ تھا جو اُن کے اوپر ٹوٹ پڑا۔ مگر باوجود ایسے سخت روحانی آلام کے اُنھوں نے نہایت صبر و استقلال سے کام لیا۔ ہر وقت اسی دُھن میں رہتیں کہ کسی طرح اپنے معزز باپ کو خوش دیکھیں۔ اور ہمیشہ اسی ٹوہ میں لگی رہتیں کہ ایسا نہ ہو کہ کفار کہیں اُن کو کوئی تکلیف پہونچائیں۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ عُتبہ اور شیبہ وغیرہ نے جو کفار کے سرگروہ تھے او حضرت کو تکلیف پہونچانے کی کوشش میں رہا کرتے تھے۔ اونٹ کا پوٹا جو اسی دن ذبح کیا گیا تھا سجدے کی حالت میں آپ کی گردن پر لاکر ڈالدیا۔ آپ اسکے بوجھ سے سر نہ اُٹھا سکے۔ یہ دیکھ کر فاطمہؓ دوڑیں اور اُس کو آپ کی گردن پر سے ہٹادیا۔ اور اُن کفار کو جو وہاں کھڑے ہنس رہے تھے بددعائیں دیں۔ حضرت نے بھی اُٹھ کر اُن پر بددعا فرمائی اور آخر احد کی لڑائی میں وہ سب کے سب واصل جہنم ہوئے۔

حضرت فاطمہ ہمیشہ سے اپنے تمام انداز۔ کھانے پینے۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ بول چال لباس وغیرہ۔ غرض ہر ایک بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری تقلید کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ "میں نے تمام حرکات وسکنات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ فاطمہؓ ہی کو پایا" ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ "رفتار و گفتار میں

بہترین نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فاطمہؓ ہیں۔ یہی اسباب ہیں جنکی وجہ سے
آنحضرت ان سے بہت زیادہ الفت رکھتے تھے۔ جب کبھی کسی سفر یا لڑائی سے
واپس آتے تو مسجد میں دوگانہ ادا کر کے سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کو دیکھنے جاتے
اسکے بعد ازواج مطہرات کے پاس تشریف لاتے۔ اور ان کی اسقدر وقعت کرتے
تھے کہ جب وہ آپکے پاس آتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے اور اُن کو اپنے پاس بٹھاتے۔
اور اُن کی سر آنکھوں پر بوسہ دیتے۔ ویسا ہی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُنکے
گھر جاتے تو وہ کرتیں۔

جسوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں آئے اُس وقت
حضرت فاطمہ کنواری تھیں۔ بعض لوگوں نے نکاح کا پیغام دیا۔ لیکن سرور کائنات
خاموش رہے۔ پھر انصار نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آمادہ کیا کہ تم خود آنحضرت
سے اپنے متعلق کہو۔ حضرت علی تشریف لے گئے اور فاطمہؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا
آپ خوش ہوئے اور حضرت فاطمہؓ سے جا کر فرمایا کہ علیؓ تمہاری نسبت ذکر کرتے
تھے وہ خاموش ہو گئیں۔ حضور نے انکے سکوت کو رضامندی قرار دیکر حضرت
علیؓ کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ یہ نکاح ہجرت سے پانچ مہینے بعد ہوا۔ اُسوقت
حضرت فاطمہؓ کی عمر اٹھارہ سال چھ مہینے کی تھی۔ اور حضرت علیؓ کا سن اکیس برس
پانچ مہینے کا تھا۔

حضرت علیؓ اُسوقت بہت تنگدست تھے۔ اور کچھ پاس نہ تھا۔ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تم کو ایک زرہ دی تھی وہ کہاں ہے۔ اُنھوں نے
کہا کہ وہ تو موجود ہے۔ آپ نے حکم دیا کہ اُسی کو فروخت کر دو۔ حضرت علیؓ وہ زرہ بیچنے
کو لے گئے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اسکو چار سو درہم پر خرید لیا۔ اور جب پہنا تو کہا
کہ اے علیؓ! یہ زرہ بہ نسبت میرے جسم کے تمہارے جسم پر زیادہ زیب دیتی ہے اسلیے

میں قیمت دینے کے بعد یہ زرہ بھی تم کو ہبہ کرتا ہوں۔ حضرت علیؓ وہ زرہ اور چار سو
درہم لائے۔ وہی چار سو درہم حضرت فاطمہ کا مہر قرار پایا۔
نکاح کے بعد حضرت نے ایک طشت خرما منگایا اور اپنے اصحاب میں لٹا دیا۔
بعد ازاں حضرت سعدؓ نے ایک مینڈھا لا کر دیا۔ اور حضرت علیؓ اپنی زرہ گرو رکھکر
ایک یہودی کی دکان سے تھوڑا سا جو لائے جس سے ولیمہ کا سامان کیا گیا
حضرت علیؓ نے ایک چھوٹا سا مکان جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان سے
کسی قدر فاصلہ پر تھا کرایہ پر لیا۔ آپ نے اپنی لونڈی ام ایمنؓ کے ہمراہ حضرت فاطمہؓ
کو حضرت علیؓ کے گھر رخصت کر دیا۔
اس دین و دنیا کے بادشاہ کی معزز بیٹی نہایت سادگی کے ساتھ ایک لونڈی
کے ہمراہ پاؤں پیدل اپنے شوہر کے گھر میں آ کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ عروسانہ
لباس یہ تھا۔ زیوروں میں صرف بازوبند۔ اور کپڑوں میں چادر زعفرانی رنگی ہوئی
اور بس۔
جہیز میں ایک چادر۔ ایک چمڑے کا گدا جس میں گھاس بھری ہوئی تھی۔ ایک تکیہ
آٹا پیسنے کی ایک چکی۔ ایک مشکیزہ۔ اور دو ڈول تھے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا مکان دور واقع ہونے سے تکلیف تھی۔
کیونکہ اکثر انکے دیکھنے کے لیے تشریف لیجایا کرتے تھے۔ ایک دن آپ نے حضرت فاطمہؓ
سے فرمایا کہ میں اپنے گھر کے قریب تم کو رکھنا چاہتا ہوں۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ
آپ کے قرب و جوار میں حارثہؓ کے بہت سے مکانات ہیں اگر آپ اُنسے فرمائینگے تو وہ کوئی
مکان ہمارے لیے خالی کر دینگے۔ آپ نے فرمایا کہ حارثہؓ تو میرے لیے اسقدر مکانات
خالی کرا چکے ہیں کہ اب مجھے اُنسے کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔
یہ خبر حارثہؓ کو بھی پہونچی۔ وہ حضور کی خدمت میں آئے اور کہا کہ یا رسول اللہ

میں نے سُنا ہی کہ آپ فاطمہؓ کو اپنے قریب بُلانا چاہتے ہیں۔ اسلیے میں یہ مکان جو آپ کے متصل ہے خالی کیے دیتا ہوں۔ یا رسول اللہ قسم ہی اللہ کی کہ میں اور میرا مال سب اللہ اور اُس کے رسول کے لیے ہیں۔ میرا وہ مال جو آپ کے کام آئے مجھے زیادہ پیارا معلوم ہوتا ہی بہ نسبت اُس مال کے جو میرے کام آئے۔ چنانچہ وہ مکان اُنھوں نے خالی کر دیا اور حضرت فاطمہؓ اُس میں آگئیں۔

حضرت فاطمہؓ ایک نہایت متقی اور دیندار عورت تھیں۔ تکلیف دنیا اور مصائب کا اُن کو ذرا بھی خیال نہیں ہوتا تھا۔ اپنے گھر کا تمام کام کاج پیسنا۔ پکانا خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ جب آٹا گوندھتے گوندھتے اُن کا ہاتھ گھس گیا تھا اور چکی پیستے پیستے گھٹے پڑ گئے تھے تو حضرت علیؓ کے کہنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں تاکہ اُن سے ایک خادمہ مانگیں۔ اُسوقت حضرت کے پاس بہت سی لونڈیاں آئی ہوئی تھیں جب وہاں گئیں تو حضرت نے نہایت پیار سے بٹھایا اور باتیں کرنے لگے۔ حضرت فاطمہؓ کو لونڈی مانگتے ہوئے شرم آئی۔ تھوڑی دیر بیٹھیں۔ اسکے بعد واپس چلی آئیں اور کچھ نہ کہا پھر حضرت علیؓ خود اُن کو ساتھ لیکر گئے۔ اور عرض کیا۔ آپنے فرمایا کہ ان لونڈیوں میں سے میں تم کو نہیں دیسکتا۔ یہ اہل صُفہ کا حق ہیں۔ یہ دونوں ناکامیاب وہاں سے واپس چلے آئے۔ رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے مکان پر تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا میں تم کو ایک ایسا عمل نہ بتاؤں جو تمہارے لیے خادمہ سے بہتر ہو۔ کہا ہاں یا رسول اللہ۔ آپنے فرمایا کہ جب تم سونے لگو تو سبحان اللہ ۳۳۔ الحمد للہ ۳۳۔ اور اللہ اکبر ۳۴ بار پڑھ لیا کرو۔

اس واقعہ کو مولانا شبلی صاحب نعمانی نے نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال	گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہات کی دونوں ہتھیلیاں	چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا

سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار — گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اٹ جاتا تھا لباس مبارک غبار سے — جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا
آخر گئیں جناب رسولِ خدا کے پاس — یہ بھی کچھ اتفاق کہ وہاں اذن عام تھا
محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کر سکیں نہ عرض — واپس گئیں کہ پاسِ حیا کا مقام تھا
پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضور نے — کل کس لیے تم آئی تھیں کیا خاص کام تھا
غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ مُنہ سے کہہ سکیں — حیدر نے ان کے منہ سے کہا جو پیام تھا
ارشاد یہ ہوا کہ غریبانِ بے وطن — جن کا کہ صُفّۂ نبوی میں قیام تھا
میں اُن کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز — ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا
جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گذرتی ہیں — میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم تھا ان کا حق — جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں — جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا

”یوں کی ہر اہل بیت مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانام تھا“

حضرت علی کی ایک بہت بڑی فضیلت یہ بھی ہے کہ حضرت فاطمہ انکے نکاح میں تھیں صحابہ کرام اسکی وجہ سے ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

باوجود اسکے کہ حضرت علیؓ جناب سیدہ کی خاطرداری کا خود بہت خیال رکھتے تھے اور کوئی بات ان کی منشا کے خلاف کرنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو تاکید فرماتے رہتے تھے کہ فاطمہؓ کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھو۔ اُدھر حضرت فاطمہؓ کو بھی بار بار نصیحت کرتے رہتے تھے کہ عورت کا بڑا فرض شوہر کی اطاعت ہے۔

ایک مرتبہ کسی بات پر حضرت فاطمہ حضرت علیؓ سے رنجیدہ ہوگئیں۔ اور کہا کہ میں اس کی شکایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرونگی۔ چنانچہ وہاں تشریف لیگئیں اور کیفیت بیان کی۔ حضرت علی بھی ساتھ ساتھ گئے تھے۔ اور خاموش بیٹھے تھے۔ حضور رسالتمآب نے جناب سیدہ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "بیٹی سُنو۔ سوچو۔ سمجھو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ مرد تمام کام عورت کی منشا کے مطابق ہی کرے"!

یہ نصیحت سُنکر آپ وہاں سے واپس آئیں۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ اس کا میرے دل پر اسقدر اثر پڑا کہ میں نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ اب کبھی فاطمہؓ کے خلاف مزاج کوئی کام نہ کرونگا۔

ایک مرتبہ سرور کائنات کسی سفر سے تشریف لائے۔ اور حسب معمول پہلے حضرت فاطمہؓ کے گھر گئے۔ اُن کے یہاں ایک رنگین پردہ لٹکا ہوا تھا اور ہاتھ میں اُنھوں نے دو چاندی کے کنگن پہن رکھے تھے۔ آپ یہ دیکھتے ہی واپس چلے آئے حضرت فاطمہ آپکے اس طرح واپس چلے آنے سے رونے لگیں۔ اتنے میں آپکے غلام حضرت ابو رافع وہاں پہونچ گئے۔ انھوں نے حضرت فاطمہؓ کو روتے ہوئے دیکھ کر کیفیت پوچھی۔ اُنھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے مکان پر تشریف لائے تھے اور کبیدہ ہوکر واپس چلے گئے۔ نہ معلوم کیوں۔

ابو رافع نے کہا کہ اس کنگن اور پردہ کو دیکھ کر۔ حضرت فاطمہ نے اُسی وقت ان دونوں چیزوں کو حضرت بلال کے ہاتھ حضور کی خدمت میں بھیجدیا اور کہلادیا کہ میں نے اُن کو صدقہ کر دیا۔ آپ جسکو چاہیں دیدیں۔ آپنے اُن کو بیچ کر اُن کی قیمت اصحاب صفہ کے اخراجات میں صرف کر دی۔

حضرت علیؓ نے جبتک حضرت فاطمہ اُنکے نکاح میں رہیں دوسرا نکاح نہیں کیا۔ ایک بار ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ان کا ارادہ معلوم ہوا تھا۔ اسپر رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مشرک اور رسول اللہ کی بیٹی ایک گھر میں جمع نہیں ہوسکتیں اس لیے حضرت علی باز رہے۔

حضرت فاطمہ کی اور تین بہنیں جس طرح عین جوانی کے زمانہ میں گذر گئیں اسی طرح حضرت فاطمہ نے بھی کم عمر پائی۔ ۲۹ سال اور چند مہینے کی عمر میں رسول اللہ کی وفات کے چھ مہینے کے بعد تیسری رمضان ۱۱ھ سہ شنبہ کی رات کو انتقال کیا۔

یہی سبب ہے کہ ان سے حدیثیں بہت کم روایت کی گئی ہیں۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے۔ فاطمہؓ آئیں۔ اور کسقدر اُن کی رفتار رسول اللہ سے مشابہ تھی۔ آپ نے اُن کو نہایت پیار سے بٹھایا۔ اور کچھ اُن کے کان میں کہا وہ رونے لگیں۔ پھر دوبارہ کچھ کان میں کہا وہ ہنسنے لگیں۔ مجکو اُن کا رونا اور فوراً ہی ہنسنا دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ جب وہاں سے اُٹھیں تو میں نے پوچھا۔ کہا کہ میں رسول اللہ کا راز ہرگز نہیں افشا کروں گی۔ میں خاموش ہورہی۔ آنحضرت کے انتقال کے بعد میں نے پھر دریافت کیا۔ کہا کہ پہلے حضرت نے میرے کان میں کہا کہ یہ میری زندگی کا آخری سال ہے۔ اسپر میں رونے لگی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ کیا تم اس سے خوش نہیں ہو کہ سب سے پہلے تم میرے پاس آؤ۔ تو میں خوش ہوگئی۔

ان کے مرض الموت کے متعلق تاریخ کے صفحات بالکل خاموش ہیں مگر جہانتک ہم کو معلوم ہوسکا وہ کسی ایسے سخت مرض میں نہیں مریں جس کی وجہ سے کچھ دنوں تک صاحب فراش رہی ہوں۔ بلکہ ابن عبد البر لکھتا ہے کہ جسدن اُنکا انتقال ہوا اُسی دن اُنھوں نے اچھی طرح غسل کیا تھا اور کپڑے بدلے تھے۔

جنازے میں بہت کم لوگوں کو شرکت کا موقع ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رات کو انتقال ہوا۔ اور حضرت علی کو وصیت کر گئی تھیں کہ رات ہی کو مجکو دفن کر دینا۔ اُنھوں نے خود ہی

غسل دیا۔ حضرت عباسؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ قبر کا ٹھیک پتہ نہیں۔ مگر یہ ضرور معلوم ہے کہ مدینہ میں جنت البقیع کے قریب ہی کہیں ہے۔

ان سے چار اولادیں تھیں۔ حسنؓ۔ حسینؓ۔ زینبؓ۔ ام کلثومؓ۔ ام کلثومؓ سے حضرت عمر بن الخطابؓ نے نکاح کیا اُن سے دو ہی ایک نسل چلکر ختم ہو گئی۔ باقی اور اولاد کی نسل دنیا کے اکثر حصہ میں ہے۔

حضرت فاطمہ کی فضیلتیں بہت ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ فاطمہ میری ریحانہ ہے۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میری آنکھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فاطمہؓ سے بہتر کسی کو نہیں دیکھا۔

ایک مرتبہ کسی نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ کس کے ساتھ محبت رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ فاطمہؓ کے ساتھ۔

صحیح حدیث میں وارد ہے کہ حضرت فاطمہؓ جنتی عورتوں کی ملکہ ہیں۔

صحابہ نے ایک مرتبہ پوچھا کہ یا رسول اللہ عورتوں میں کس کا درجہ بلند ہے۔ آپ نے چار خط زمین پر کھینچے۔ اور فرمایا مریم۔ خدیجہ۔ فاطمہ اور آسیہ (زوجۂ فرعون)

اس امر میں محدثین کا اختلاف ہے کہ اس امت میں فضیلت کس کو ہے۔ کسی نے حضرت عائشہ کو افضل قرار دیا ہے۔ اور کوئی کہتا ہے کہ حضرت فاطمہ سب سے بہتر ہیں۔

لیکن عام مسلمانوں کا اعتقاد یہی ہے کہ حضرت فاطمہ افضل ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

دی کسے گفت عائشہ در فضل ۔۔۔ بہتر از بنت سید البشر است
مصرعے در جوابِ او گفتم ۔۔۔ رشتہ دیگر رگِ جگر دگر است

پھر اس امر میں اختلاف ہے کہ خدیجہؓ بہتر ہیں کہ عائشہؓ۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ

حیثیتیں مختلف ہیں۔ اولیت اسلام اور ابتدائی کوششوں کے لحاظ سے حضرت خدیجہ افضل ہیں۔ اور علم و عظمت کو دیکھتے ہوئے حضرت عائشہ کا درجہ بلند ہے۔

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ فاطمہؓ کی فضیلتیں اسوجہ سے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی تھیں۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔ ان کی ذاتی خوبیوں نے ان کے درجے بلند کیے ہیں۔ اسلام میں نسبی شرافت کا لحاظ نہیں ہے بلکہ پرہیزگاری کا ہے حضرت نے ایک مرتبہ فاطمہؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم یہ نہ خیال کرو کہ میں تمہارا باپ ہوں تو آخرت میں تمہاری مدد کرونگا۔ میں بلا اذن کسی کی شفاعت نہیں کرسکتا تم عمل کرو۔ اور صرف اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اور یہ سمجھ لو کہ عاقبت میں کوئی چیز سوائے عمل خیر کے مفید نہیں ہوسکتی۔

اُم المومنین عائشہؓ

دنیا کی تاریخ میں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے آدمی تسلیم کیے جاتے ہیں اُسی طرح عائشہؓ تاریخی لحاظ سے سب سے بڑی عورت ہیں۔ اور جس طرح اُنکے محترم شوہر نے دنیا میں ایک سچا مذہب پھیلا کر بہت بڑا احسان کیا ہے اُسی طرح عائشہؓ نے ان کی تعلیمات شائع کرکے اُمت کو مرہون منت کیا ہے چنانچہ بعض محدثین کا قول ہے کہ اگر حضرت عائشہؓ نہ ہوتیں تو نصف علم حدیث ضائع ہوجاتا۔ اُن کی عقلمندی۔ صداقت۔ ذہانت۔ صورت سیرت۔ نیکی اور بہت سے اوصاف اسی قابل تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو اپنی بہترین بیوی شمار کرتے۔ اور صدیقہ اُن کا لقب قرار پایا۔

انکے باپ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ اول ہیں جو انبیاء کے بعد بلا استثناء تمام دنیا کے

آدمیوں سے بہتر ہیں۔ ان کی والدہ ام رومان ہیں جو کنانہ کی اولاد میں سے ہیں۔ باپ کی طرف سے قریشی اور ماں کی جانب سے کنانی ہیں۔

ان کی ولادت ہجرت سے نو سال پیشتر مکہ میں ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ اسکے کئی سال پیشتر سے مسلمان ہو چکے تھے۔ اسلیے اِنؓ پر ایک لمحہ بھی کفر کا زمانہ نہیں گذرا۔ اور دنیا میں آتے ہی اپنی پرورش کے لیے ان کو اسلامی آغوش ملا۔ بچپن میں ان کی نہایت اچھی پرورش ہوئی کیونکہ ان کا حسن اور ان کی طبیعت کی تیزی یہ دو چیزیں ایسی تھیں جنکی وجہ سے ماں باپ ان کی غیر معمولی محبت کرتے تھے۔ انکے ہات پاؤں اور ان کا جسم بہت توانا تھا اسلیے انکی نشو ونما بہت اچھی ہوئی اور اپنی ہمجنسوں میں قد وقامت صورت اور ذہانت کے لحاظ سے ہمیشہ ممتاز رہیں۔ قبیلہ کی تمام لڑکیاں انھیں کے پاس جمع ہوتیں۔ گڈے گڑیاں وغیرہ کھیلتیں چونکہ ذہین لڑکے لڑکیاں عام طور پر کھیل کے بہت شائق ہوتے ہیں اس لیے یہ شوق اُنکے اندر بھی بہت تھا اور اسوقت کے معمولی کھیلوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ اپنے پاس جمع رکھتی تھیں۔ اور اس طرح پر تمام لڑکیوں کی سردار بنی رہتی تھیں۔ ماں باپ کو ان کی ہر ایک عادت بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ اپنی اس ہونہار ننھی بچی کی ہر ایک ادا کو بڑے پیار سے دیکھتے تھے۔ اور اُن کی بلند خیالی اور عالی ہمتی دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ یہ ضرور ایک معزز اور ممتاز لڑکی ہوگی۔

خاصکر اُن کے اُس خواب سے جو اُنھوں نے دیکھا تھا کہ تین چاند ٹوٹ کر میرے آغوش میں گرے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جو خواب کی تعبیر کرنے میں تمام عرب میں مشہور تھے اور بھی متحیر تھے۔ چنانچہ آخر میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا اور آپ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں دفن کیے گئے تو ابوبکرؓ نے عائشہؓ سے کہا کہ "تمہارے تین چاندوں میں سے پہلا اور سب سے اچھا چاند تمہارے آغوش میں آیا" اور اسکے کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ بعد میں دو چاند (ابوبکرؓ عمرؓ) اور بھی اُسی آغوش میں

ٹوٹ ٹوٹ کر گرے۔

جب حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے وفات پائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت عرصہ تک مغموم رہے۔ خولہؓ نے جو مشہور صحابی عثمان بن مظعونؓ کی بیوی تھیں آپ کو رنج میں دیکھ کر کہا کہ یا رسول اللہ آپ کوئی نکاح کریں۔ آپ نے فرمایا کہاں؟ کہا اگر آپ چاہیں تو کنواری سے کریں تو اور نہیں تو بیوہ سے۔ آپ نے پوچھا بیوہ کون ہے اور کنواری کون ہے؟ کہا کنواری تو عائشہؓ ہے جو اُس شخص کی لڑکی ہے جو آپ کے نزدیک اسوقت اللہ کی تمام مخلوق سے پیارا ہے۔ اور بیوہ سودہ بنت زمعہ ہے جو آپ پر ایمان لائی ہے۔ اور آپ کی رسالت اور احکام کو مانتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دونوں سے کہو۔ یہ سُنکر خولہ خوشی خوشی ابوبکرؓ کے گھر آئیں۔ اور آنحضرت کا پیغام کہا۔ حضرت ابوبکرؓ نے نہایت خوشی کے ساتھ نکاح کر دیا۔ ایک مکان جس کی قیمت کم و بیش پچاس دینار تھی ان کا مہر قرار پایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویوں میں صرف حضرت عائشہؓ کنواری آپ کے نکاح میں آئیں۔ ورنہ اور جتنی بیبیاں تھیں کوئی ایک نکاح کے بعد آپ کے نکاح میں آئی تھی۔ اور کوئی دو نکاح کے بعد۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائے اسکے ایک سال کے بعد حضرت عائشہ وداع کی گئیں۔ اُسوقت ان کی عمر کچھ زائد نو سال تھی۔ اور جب سرورِ عالم کی وفات ہوئی تو وہ چند ماہ زائد اٹھارہ سال کی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امہات المومنین کی بہ نسبت انکے ساتھ زیادہ محبت اور اُنسیت تھی اور اُن کی بہت قدر اور عزت کرتے تھے۔ لیکن باوجود اسکے حقوق آپنے سب کے ایکساں مقرر کر رکھے تھے۔ اس میں کسی قسم کا فرق نہیں تھا۔ البتہ حضرت سودہؓ نے اپنے تمام حقوق حضرت عائشہ کو دیدیئے تھے اس لیے دیگر ازواج مطہرات کی

بہ نسبت ان کا حق دوچند تھا۔

حضور اکرم کو حضرت عائشہ کے ساتھ جو محبت تھی وہ اُنکے عمدہ اوصاف و عقلمندی کی وجہ سے تھی۔ اکثر جب آپ گھر میں تشریف لاتے تو انھیں سے گفتگو فرماتے۔ اور ان کی باتیں سُنتے۔ حضرت عائشہ کی فصاحت و بلاغت ضرب المثل تھی۔ نہایت مسلسل اور معقول گفتگو کرتی تھیں۔ اسوجہ سے آپ ان کی باتوں کو بہت پسند فرماتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جسقدر حضرت عائشہ کے ساتھ محبت تھی اسقدر بلکہ اس سے زیادہ یہ اُن پر قربان تھیں اور بحیثیت شوہر ہونے کے تو عزت کرتی ہی تھیں رسالت کے آداب کا بھی ساتھ ہی ساتھ لحاظ رکھتی تھیں۔ اور کبھی اپنے مرتبہ سے تجاوز نہیں کرتی تھیں۔ جس امر کو ذرا بھی حضور کے خلاف طبع دیکھتیں کبھی اس کی جرأت نہ کرتیں اور آپ کے تمام حالات سے خواہ گھر کے ہوں یا باہر کے واقفیت حاصل کرتیں۔ اور ان کو محفوظ رکھتیں۔ ان سے دوہزار دوسو دس حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔

جسقدر عورتیں دربار نبوت میں مسئلہ پوچھنے آتیں زیادہ تر حضرت عائشہ ہی کے ذریعہ سے پوچھتیں۔ اور یہ رسوخ جو حضور کی خدمت میں ان کو حاصل تھا ان کی کمال ذہانت اور تقوے اور دینداری کی وجہ سے تھا۔ ان میں بڑی خوبی یہ تھی کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آتی۔ اُسپر دوسروں کی طرح فوراً اعتقاد نہیں کرلیتی تھیں۔ بلکہ اچھی طرح سمجھ بوجھ کر تسلیم کرتی تھیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اکثر دشوار مسئلوں میں صحابہ کرام انہیں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اور یہ اس کی دشواری کو حل کردیتی تھیں۔ بڑے بڑے صحابہ بلکہ خلفا، میراث وغیرہ کے مسئلے ان سے آکر پوچھتے تھے۔

ان کی رائے عام مسائل میں بہت بہتر سمجھی جاتی تھی۔ جاہلیت کے واقعات۔ حالات اور قدیمی شعرا کے اشعار کے علاوہ علم حدیث کی معلومات ان کو بہت زیادہ تھی۔

اور قرنِ صحابہ میں سب سے بہتر جو چند علمائے تھے اُن میں انکا شمار تھا۔

اس سے بڑھکر اس کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر۔ ابن عباس ابو موسیٰ اشعری۔ ابوہریرہ وغیرہ رضی اللہ عنہم عظیم الشان صحابہ ان سے آکر حدیثیں سُنتے اور اُن کو روایت کرتے تھے۔

امام زہری جو فن حدیث کے امام ہیں کہتے ہیں کہ "عائشہؓ سب سے بڑی عالمہ ہیں" اور حقیقت میں آنحضرت کی احادیث کا بہت بڑا حصہ ہم تک نہ پہونچ سکتا اگر حضرت عائشہؓ اس کو محفوظ نہ رکھتیں۔

ان کی تقریر نہایت فصیح و بلیغ اور پُرزور ہوتی تھی۔ تاریخ کی کتابوں میں ان کی کئی زبردست تقریریں مندرج ہیں۔ جن سے اُن کا کمال معلوم ہوتا ہے۔

انکے علم کی وجہ سے حضرت کے بعد خلافت کے زمانہ میں ان کی عزّت اور عظمت ترقی کرتی چلی گئی۔ تمام صحابہ ان کا اعزاز بہ نسبت اور امہات المومنین کے زیادہ کرتے تھے۔

حضرت عائشہ کو دنیا کے مال و جاہ کی کوئی خواہش نہیں تھی ہزاروں درہم اُنکے پاس آتے تھے اور وہ اُسی دن غربا میں تقسیم کر دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک لاکھ درہم انکے پاس آئے۔ اُنھوں نے فوراً تقسیم کر دیئے۔ اُس دن روزہ رکھا تھا ایک خادمہ نے کہا کہ آپنے ایک درہم بھی نہیں رکھا کہ گوشت منگاتے۔ کہا کہ اگر تم نے یاد دلایا ہوتا تو میں رکھ لیتی۔

عبداللہ بن زبیرؓ جو مکّہ کے حاکم تھے اور بعد میں خلیفہ ہو گئے انکے بھانجے تھے وہ اکثر لونڈی۔ غلام اور مال و اسباب اپنی اس محترم خالہ کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ ایک بار کئی سو لونڈی اور غلام بھیجے اور مال بھی بھیجا۔ اُنھوں نے تمام مال خیرات کر دیا اور لونڈی اور غلام آزاد کر دیئے۔ عبداللہ رضؓ نے جب یہ کیفیت سُنی تو کہا کہ اب نہ بھیجیں گے وہ

بہت بے دردی سے خرچ کر ڈالتی ہیں۔ یہ سُنکر حضرت عائشہ رضؓ عبداللہ رضؓ سے خفا ہوئیں اور فرمایا کہ اب سے وہ میرے سامنے نہ آنے پائے۔ آخر کئی دن کے بعد بڑی سفارش سے عبداللہ آئے پاؤں پکڑ کے رونے لگے اور اپنے قصور کی معافی چاہی۔

ان کی سب سے بڑی فیاضی یہ تھی کہ انکے حجرہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضؓ دفن ہو چکے تو ایک قبر کی جگہ خالی تھی۔ حضرت عائشہ رضؓ نے اُسکو اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ کسی مسلمان اور خاصکر حضرت عائشہ کو اس سے بڑھکر اور کیا تمنا ہو سکتی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور حضرت ابوبکر رضؓ کے قریب دفن ہوں۔ مگر جسوقت حضرت عمر رضؓ نے مرتے وقت اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضؓ کو بھیجا کہ اور کہلایا کہ آپ وہ جگہ جو اُس حُجرہ میں خالی ہے مجکو دیدیں تاکہ میں اُسی میں دفن ہوں۔ تو حضرت عائشہ رضؓ نے کہا کہ میں نے تو اُسکو اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا مگر چونکہ آپنے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی ہے اسلیے آپ کو اپنے پر ترجیح دیتی ہوں۔ اور آخر حضرت عمر رضؓ وہیں دفن ہوئے۔ یہ ایسی فیاضی ہے کہ اس کی مثال نہیں ملسکتی۔

امام قاسم جو محمد بن ابوبکر رضؓ کے بیٹے ہیں بیان کرتے ہیں کہ جب مصر میں ہمارے والد کو لوگوں نے قتل کر ڈالا تو ہمارے چچا عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضؓ مجکو اور میری بہن کو اپنے ہمراہ مدینے میں لائے تاکہ پرورش کریں۔ حضرت عائشہ رضؓ کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ آئیں اور وہ ہم دونوں بھائی بہن کو اپنے گھر لیجا کر پرورش کرنا شروع کیا اور اس محبت اور شفقت سے پالا کہ کسی کے ماں باپ کیا ایسی پرورش کریں گے۔ جب ہم دونوں سن شعور کو پہونچ گئے تو اُنھوں نے ایک دن عبدالرحمٰن رضؓ کو بُلایا اور کہا کہ میں دیکھتی ہوں کہ جب سے تمہارے گھر سے میں ان بچوں کو اُٹھا لائی ہوں تم مجھ سے کچھ خفا سے رہتے ہو۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ میں ان بچوں کو اسوجہ سے تمہارے گھر سے نہیں اُٹھا لائی کہ میں نے تمہاری محبت میں کمی یا خبرگیری میں کوتاہی

دیکھی بلکہ محض اسوجہ سے کہ تمہاری کئی بیویاں تھیں۔ ممکن تھا کہ ان نافہم بچوں کی پرورش میں کوئی امر ایسا پیش آتا جو اُن میں سے کسی کو ناگوارِ خاطر ہوتا اس لیے میں نے اپنے آپ کو ان کی نگہداشت کے لیے زیادہ مستحق سمجھا۔ اب کہ یہ بچے سن تمیز کو پہونچ گئے اور بھلائی بُرائی میں امتیاز کرنے لگے۔ ان کو میں خوشی سے تمہارے حوالے کرتی ہوں۔ اپنے ساتھ لیجاؤ اور انکے لیے ایسے ہی بنو جیسا کہ حجیہ کندی اپنے بھتیجوں کے لیے تھا۔

حجیہ کا قصہ یہ ہے کہ اسکا ایک بھائی معدان نامی تھا۔ وہ مرگیا۔ اسکے کئی بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ حجیہ اپنی اولاد سے زیادہ ان یتیم بچوں کی خاطر کرتا۔ اور بہت زیادہ خیال رکھتا۔ اسے اتفاقاً کوئی سفر پیش آیا جس میں مجبوراً اُسکو گھر سے نکلنا پڑا۔ جاتے وقت ان بچوں کی خبرگیری کی بابت بہت کچھ اپنی بیوی زینب کو تاکید کرگیا۔ لیکن جب ایک مہینہ کے بعد واپس آیا تو اُسنے دیکھا کہ اسکے بچے تو اچھی حالت میں ہیں لیکن معدان کے بچے خستہ اور لاغر ہیں۔ اُس نے زینب سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تو نے ان بچوں کو پیٹ بھر کر کھانا تک نہیں دیا ہے۔ اُس نے کہا کہ میں ان کو اور اپنے بچوں کو برابر ہی کھلاتی رہی ہوں۔ لیکن یہ سب دن بھر کھیل کود میں مصروف رہتے تھے جس سے ان کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ حجیہ نے تنہائی میں ان بچوں سے پوچھا تو وہ روئے اور کہا کہ ہم کو تمہارے جانے کے بعد پیٹ بھر کھانا نہیں نصیب ہوا۔ حجیہ زینب سے سخت ناراض ہوا۔ اور جب اس کے اونٹوں کا گلہ آیا تو وہ تمام گلہ اُسنے معدان کے بچوں کو بخشدیا۔ زینب کو اسکا بڑا قلق ہوا۔ وہ بگڑکر پردے میں بیٹھی۔ حجیہ نے کچھ پرواہ نہ کی۔ بلکہ اور زینب کی ہجو میں اشعار کہے۔ زینب آخر اسی رنج میں حضرت عمر رضہ کے عہد خلافت میں مدینے چلی آئی اور اپنے آبائی دین عیسوی کو چھوڑ کر مسلمان ہوگئی۔ حجیہ بھی اس خبر کو سُنکر مدینہ میں آیا۔ زبیر رضہ کے پاس ٹھہرا۔ اور اپنی بیوی کا حال بیان کرکے یہ چاہا کہ ان کی سفارش سے وہ واپس ملجائے۔

اس واقعہ کی اطلاع حضرت عمرؓ کو بھی ہوگئی۔ اُنھوں نے زبیرؓ سے کہا کہ تمہارے مہمان کی خبر مجکو ملی ہے۔ اگر تم نے اسے پناہ نہ دی ہوتی تو میں اس کی خبر لیتا۔ زبیرؓ نے یہ کیفیت حجیہ سے بیان کی۔ وہ ڈرا اور زینب سے نا امید ہو کر مدینے سے بھاگ گیا۔

سو میں بھی ڈرتی تھی کہ کہیں حجیہ ہی جیسا معاملہ تم کو پیش نہ آجائے! اسلیے میں بچوں کو اپنے پاس لائی۔ لیکن اب تم خوشی سے ان کو لیجاؤ۔

حضرت عبد الرحمنؓ ان کی تعریف اور شکریہ کرتے ہوئے ہم دونوں کو اپنے گھر لائے۔

حضرت عمرؓ نے ازواج مطہرات میں سے ہر ایک کے لیے دس ہزار درہم سالانہ اور حضرت عائشہ کے لیے بارہ ہزار درہم سالانہ گذارہ مقرر کیا کیونکہ وہ تمام امہات المومنین میں سب سے زیادہ معزز تھیں لیکن اُنھوں نے اس زیادتی کو منظور نہیں فرمایا۔ اور کہا کہ آنحضرت نے ہم سب کو برابر رکھا اب گذارہ بھی برابر ہی رہنا چاہیے۔ میں زیادہ نہیں لے سکتی۔

باوجود کثیر آمدنی کے بھی مہینے میں کئی کئی دن ایسے آتے تھے کہ جن میں فاقہ کرنا پڑتا تھا کیونکہ وہ ایک دن کی آمدنی دوسرے دن کے لیے نہیں رکھتی تھیں۔

پھٹے کپڑوں میں خود پیوند لگا کر پہنتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے کہا کہ اب تو کپڑوں کی کمی نہیں ہے آپ نئے کپڑے کیوں نہیں پہنتیں۔ فرمایا کہ آنحضرت کی وصیت ہے کہ جبتک پیوند نہ لگاؤ کپڑے کو مت چھوڑو۔ جو پیوند نہیں لگاتا اُسکو نئے کپڑوں کا کیا لطف آتا ہے۔

وہ ہمیشہ موٹے اور کم قیمت کے کپڑے پہنتی تھیں۔ اور اُن کو زعفرانی یا ارغوانی رنگ میں رنگ لیتی تھیں۔ ہاتھوں میں سونے اور چاندی کی انگوٹھی بھی ڈال لیتی تھیں باریک کپڑوں سے اُن کو نفرت تھی۔ ان کی بھتیجی حفصہ ایک مرتبہ انکے پاس

باریک اوڑھنی اوڑھ کر آئیں جس سے نظر گذر جاتی تھی۔ حضرت عائشہؓ نے خفا ہو کر اُسے کھینچ لیا۔ اور ایک موٹی اوڑھنی لا کر اوڑھادی۔ اور فرمایا کہ سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ نے بڑی تاکید کی ہے کہ عورتیں اپنی زینت کو چھپائے رکھیں۔

ایک شخص نے پوستین تحفہ میں پیش کی۔ فرمایا کہ مجھے مرے ہوئے جانوروں کی کھال سے نفرت ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم نے اسکو اچھی طرح پکا کر صاف کر لیا ہے تب اُسے قبول کیا اور پہنا۔

مدینے میں ایک نابینا تھے ان کا نام اسحاق تھا۔ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں مسئلے پوچھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ آپ انسے پردہ کیا کرتی تھیں۔ اُنھوں نے کہا کہ میں تو اندھا ہوں۔ آپ مجھ سے کیوں پردہ کرتی ہیں۔ فرمایا کہ میں تو اندھی نہیں ہوں۔

صائم الدہر تھیں۔ اور تلاوت قرآن انکا شغل تھا۔ تلاوت کے وقت بعض بعض آیتوں پر ان کی آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگ جاتی تھی۔

تقوے کا یہ عالم تھا کہ بیماری میں اکثر کہا کرتی تھیں کہ کاشس میں کوئی درخت ہوتی۔ کاش میں درخت کی کوئی پتّی ہوتی جسکا حساب کتاب نہوتا۔

مرض الموت میں جب گرفتار ہوئیں تو حضرت ابن عباسؓ ان کی عیادت کو گئے بہت کچھ تسلی آمیز باتیں کہیں اور اُن کے فضائل میں جو احادیث ہیں وہ بیان کیں دوسرے روز پھر جب اُنھوں نے آنے کی اجازت مانگی تو فرمایا کہ معاف رکھو ان کی تعریفوں کی ضرورت نہیں ہے۔

سہ شنبہ کی رات کو عشا کے وقت ۱۷۔ رمضان ۵۸ھ میں ۶۶ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اور اسی شب کو جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔ شاید اسقدر ہجوم مدینہ میں کسی رات کو نہوا ہوگا۔ تمام لوگ۔ بوڑھے۔ جوان۔ مرد و عورت

اور بچے سب جمع تھے۔ ہزارہا مشعلیں جل رہی تھیں۔ رات ہونے کی وجہ سے او
نیز ان کی اُس عظمت اور محبت کی کشش سے جو مدینہ کی عورتوں کے دلوں میں تھی تمام
عورتیں جمع تھیں۔ اور ایک عجیب و غریب کہرام مچا ہوا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے جنازہ
کی نماز پڑھائی۔

حضرت عائشہؓ کی فضیلتیں بہت ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا ہے کہ جس طرح تمام کھانوں میں بہتر ثرید ہے۔ اسی طرح عورتوں میں بہتر
عائشہؓ ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ جنت میں آپ کی کون کونسی بیبیاں ہونگی
فرمایا کہ تم بھی اُنھیں میں سے ہو۔

حضرت عائشہؓ کہا کرتی تھیں کہ مجکو چند خصوصیتیں حاصل ہیں جو ازواج مطہرات
میں سے اور کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ اور ان خصوصیات پر میں فخر کرتی ہوں۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے میرے کسی کنواری
عورت سے نکاح نہیں کیا۔

دوسری یہ ہے کہ میری برارت آسمان سے نازل ہوئی۔

تیسری یہ ہے کہ میں ہی صرف آپ کی وہ بی بی ہوں جسکے ماں باپ دونوں
مہاجر ہیں۔

چوتھی یہ کہ میرے ہی حجرے میں جبکہ آپ کا سر مبارک میرے آغوش میں تھا آپ نے
انتقال فرمایا۔

پانچویں یہ کہ آپ میرے ہی حجرے میں مدفون ہوئے۔

حضرت صفیہ رضؓ

حضرت صفیہ رضؓ کے والد عبد المطلب بن ہاشم ہیں اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ہیں۔ ان کی والدہ کا نام ہالہ بنت وہب ہے جو حضور اکرم کی خالہ تھیں۔ حضرت صفیہ حضور کے والد عبد اللہ کی علاتی اور حضرت حمزہ سید الشہدا کی حقیقی بہن ہیں۔

ان کی ولادت اسی سال ہوئی جس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی۔ جاہلیت کے زمانہ میں انکا نکاح حارث بن حرب کے ساتھ ہوا تھا جو ابوسفیان کے بھائی تھے۔ انکے انتقال کے بعد عوام بن خویلد کے ساتھ ہوا تھا۔ ان سے دو بیٹے پیدا ہوئے ایک تو حضرت زبیر جنکو دربار نبوت سے حواری کا خطاب ملا اور جو اُن دس صحابہ میں سے ہیں جنکے جنتی ہونے کی خوشخبری دنیا ہی میں آگئی تھی۔

دوسرے سائب جو عبد الکعبہ بھی کہے جاتے تھے۔

حضرت صفیہ ہجرت سے پہلے اسلام لائیں۔ حضرت کی چھ پھوپھیوں میں یہی ایک ایسی ہیں جنکے اسلام لانے پر تمام مورخ متفق ہیں۔ باقی برہ۔ اُمیمہ اور ام حکیم یہ تین مسلمان نہیں ہوئیں۔ اور عاتکہ اور اروی کے متعلق اختلاف ہے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ دونوں مکے میں اسلام لائیں اور پھر وہاں سے ہجرت کر کے مدینہ شریف آئیں لیکن ابن اثیر اور ابن اسحاق کہتے ہیں کہ سوائے حضرت صفیہ کے آنحضرت کی کسی پھوپھی کو اسلام لانا نصیب نہ ہو سکا۔

مدینہ شریف آنے کے بعد ۳ھ میں جنگ احد کا دردناک واقعہ پیش آیا جو مسلمانوں کا سب سے بڑا امتحان تھا۔ اس جنگ میں اسلام کا بہترین سپاہی میدان جنگ میں شہید ہوا یعنی سید الشہدا حضرت امیر حمزہ رضؓ

ہندنے جسکا باپ عتبہ بدر کی لڑائی میں مارا گیا تھا اپنے انتقامی جوش کا اس طرح اظہار کیا کہ سید الشہدا کا مثلہ کیا یعنی ناک اور کان وغیرہ کاٹ لیے سینہ چاک کر ڈالا اور تحچے کلیجے کا ایک ٹکڑا موںھ میں ڈالا لیکن نگل نہ سکی اس لیے اُگل دیا۔

میدان جنگ کی ادہر یہ کیفیت تھی اُدہر عورتوں نے نیزے مار مار کر بھاگے ہوئے مسلمانوں کا موںھ پھر میدان جنگ کی طرف پھیرا۔ جب لڑائی کا خاتمہ ہو چکا تو وہ قلبی محبت اور خونی کشش جو بھائی بہنوں میں ہوتی ہی حضرت صفیہؓ کو کھینچ کر اُس طرف لیچلی جدہر سینہ فگار بھائی پڑا ہوا تھا جس کی شکل بگاڑی جا چکی تھی ـ آنکھیں نکال لی گئی تھیں۔ اور کلیجے کے ٹکڑے ادہر اُدہر پڑے ہوئے تھے

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن   خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضور انور نے دور سے دیکھا اُسی وقت حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ دیکھو اپنی ماں کو منع کر دو ادہر نہ آنے پائے۔ حضرت زبیرؓ دوڑے اور منع کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ میں نے سُنا ہی کہ میرے بھائی کا مثلہ کیا گیا ہی اُسکو دیکھنے آئی ہوں۔ حضرت زبیرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منع فرماتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ میں رونے اور نوحہ کرنے کے لیے نہیں آئی ہوں بلکہ دیکھونگی صبر کروں گی اور مغفرت مانگوں گی۔

زبیرؓ نے دربار نبوت میں آکر عرض کیا۔ حضور نے فرمایا خیر دیکھ لینے دو۔ تب وہ قریب گئیں۔ کیفیت دیکھ کر جی بیقرار ہو گیا۔ لیکن اسلامی صبر کا دامن پکڑ کر دعاے مغفرت مانگی۔ کفن کے لیے بیٹے کو دو چادریں حوالہ کیں۔ اور وہاں سے باچشم تر مدینے کی طرف روانہ ہوئیں۔

حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ وہ چادریں ہم نے لیں کہ اُن میں حضرت حمزہؓ کو دفن

کریں لیکن نہیں کے قریب ایک انصاری شہید تھا اسکے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا تھا جو حمزہؓ کے ساتھ۔ ہم نے مروت کے خلاف سمجھا کہ ایک کو دو چادروں میں دفن کریں اور ایک کو بے کفن چھوڑیں اسلیے دونوں کو ایک ایک چادر میں لپیٹ کر دفن کیا۔

۵ھ میں شوال کے مہینے میں پھر مکّہ کے کافروں نے یہ ارادہ کیا کہ ایکبار ایسی فوج لیچلو کہ مسلمانوں کا بالکل خاتمہ کر دیا جائے۔ اُنھوں نے ہزاروں روپیے آس پاس کے قبائل کو تقسیم کیے تاکہ وہ اسلحہ خریدیں۔ سواری کے لیے اُن کو اونٹ دیئے اور تقریباً دس ہزار کی جمعیت لیکر اسلام کو مٹانے کے لیے مدینے کی طرف روانہ ہوئے۔

مشکل یہ تھی کہ مدینہ کے قرب و جوار میں جو یہودی تھے وہ بھی باوجود اسکے کہ مسلمانوں نے عہد و پیمان کر چکے تھے لیکن مکّے کے کافروں کے ساتھ شریک ہوگئے اور اُنھوں نے بھی یہی چاہا کہ لاؤ متفق ہو کر اسوقت اسلام کو مٹا ڈالیں۔

مسلمانوں کی کُل لڑنے والی جماعت تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ حضورِ اکرم نے جب کافروں کے یلغار کی خبر سُنی تو اسی قلیل جماعت کو لیکر مدینے سے باہر نکلے اور حضرت سلمان فارسیؓ کی رائے کے مطابق حفاظت کے لیے اِردگرد مورچہ بندی کی اور خندق کھودی۔

مسلمانوں کے لیے یہ بڑی مصیبت کا وقت تھا۔ ایک طرف قحط۔ دوسری طرف افلاس۔ اسپر دشمن زبردست۔ لیکن اسلام کی صداقت کی وجہ سے وہ ان مصائب کو اپنی خوشی اور دائمی راحت کا سبب سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے ان سب تکالیف کو جھیلتے تھے۔

اس خندق کے کھودنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شریک تھے کئی کئی دن جب فاقے سے گزر جاتے تھے تو جُھکتے نہیں بنتی تھی اس لیے شکم پر پتھر باندھ لیا کرتے تھے۔

کافروں سے لڑائی شروع ہوئی۔ ایک دن جبکہ تمام مسلمان لڑائی میں مشغول تھے اور عورتیں اور بچے پیچھے ایک محفوظ کوٹ میں چھوڑ دیئے گئے تھے جہاں کوئی انکی حفاظت کے لیے موجود نہیں تھا۔ چند شریر یہودیوں نے یہ سوچا کہ چلو مسلمانوں کے حرم پر چھاپا ماریں وہ لوگ اس ارادہ سے کوٹ کی دیوار سے لگ کر آ کھڑے ہوئے اور ایک شخص کو اُس کے دروازے کے قریب بھیجا کہ تم کان لگا کر سنو اور خبر لاؤ کہ اندر کچھ مسلمان تو حفاظت کے لیے نہیں موجود ہیں۔ وہ آکر چپ چاپ دروازہ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اور اندر کی آواز پر کان لگایا۔

حضرت صفیہؓ نے اسکو اوپر سے دیکھ لیا۔ وہاں کوئی مرد موجود نہیں تھا صرف حضرت حسّان جو دربارِ نبوت کے شاعر ہیں عورتوں اور بچّوں کے ساتھ چھوڑے گئے تھے۔ حضرت صفیہؓ نے انسے کہا کہ دیکھو دروازہ پر ایک یہودی کھڑا ہوا ہے اور وہ یقیناً جاسوسی کے لیے آیا ہے۔ لہٰذا تم جا کر اُسکو قتل کرو۔ حضرت حسان میں یہ جرأت کم تھی اُنھوں نے کہا کہ یہ مجھ سے نہو سکیگا۔ یہ سُنکر حضرت صفیہؓ کو بہت ہی اندیشہ ہوا اُنھوں نے خیال کیا کہ یہ جا کر ضرور خبر دیگا کہ اس کوٹ میں کوئی مرد نہیں ہے۔ اور یہودی آکر ہم کو لوٹ لینگے۔ مسلمان دشمن کے مقابلہ میں ہیں وہ ہماری مدد نہیں کر سکیں گے۔ یہ سوچکر وہ خود دروازہ پر آئیں اور آہستہ آہستہ پٹ کھولکر ایکدم اس یہودی پر حملہ کیا اور ایک ایسا لٹھ اسکے سر پر مارا کہ وہ گر کر مر گیا۔

اندر آکر اُنھوں نے حضرت حسّان کو خبر کی۔ اور کہا کہ تم جا کر اسکا سامان تو کم از کم لیلو کیونکہ اُسکے اسلحہ وغیرہ میں نے محض اسوجہ سے نہیں نکالے کہ وہ مرد ہے۔ لیکن حضرت حسّان اسپر بھی رضی نہ ہوئے۔

آخر وہ خود جا کر اسکا سر کاٹ لائیں۔ اور اُس طرف لیجا کر دیوار کے نیچے پھینکا جہاں اُسکے ساتھی اسکا انتظار کر رہے تھے۔ سر کو دیکھ کر ڈر گئے۔ اور اُنھوں نے سمجھ لیا کہ

یہاں ضرور کچھ مسلمان حفاظت کے لیے ہیں۔

حضرت صفیہؓ عربی اشعار اور روایات کا بہت علم رکھتی تھیں۔ اور خود بھی شاعر تھیں۔ آنحضرت کی رحلت پر مرثیہ میں اشعار کہے ہیں۔

سنہ ۲۰ھ میں عہد خلافت فاروقی میں وفات پائی۔ اسوقت ان کی عمر ۷۳ سال کی تھی۔ مدفن جنت البقیع میں ہے۔

حضرت اسماءؓ

حضرت ابوبکر صدّیقؓ کی بیٹی ہیں۔ ہجرت سے ۲۷ سال پہلے مکّے میں پیدا ہوئیں ان کی والدہ کا نام قتیلہ تھا جو قریش کے ایک مشہور اور نامور سردار عبد العزی کی بیٹی تھیں۔ عبداللہ ابن ابوبکرؓ ان کے حقیقی بھائی اور حضرت عائشہؓ انکی سوتیلی بہن تھیں۔

حضرت ابوبکر صدّیقؓ سب سے پہلے آنحضرت پر ایمان لائے۔ انکے مسلمان ہونے کے چند روز بعد حضرت اسماء ایمان لائیں۔ یہ سترہویں مسلمان تھیں۔ ان کی والدہ قتیلہ نے چونکہ اسلام قبول نہیں کیا اسوجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے ان کو طلاق دیدی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکّے کے کافروں نے جب بہت تنگ کیا یہانتک کہ قتل کر ڈالنے پر تیار ہوئے تو آپ نے مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جانے کا ارادہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ بھی آپ کے ہمراہ ہوئے اور رات کو دونوں آدمی نکل کر مکے سے تھوڑے فاصلہ پر ایک پہاڑ میں جسکو جبل ثور کہتے ہیں اسکے ایک غار میں چھپ رہے تاکہ کافر پیچھا کر کے پکڑ نہ لیں۔ تین دن تک اسی غار میں بیٹھے رہے۔ حضرت ابوبکر صدّیق کو اسی وجہ سے یار غار کہتے ہیں۔ کافر چاروں طرف ان کی تلاش میں گھوڑے دوڑاتے پھرے بارہا اسی غار کے موںھ پر گذرے لیکن اللہ تعالی نے ان کو محفوظ رکھا۔

حضرت اسمار چپکے سے رات کو کھانا لیکر جاتی تھیں اور غار میں اُن کو کھلا آتی تھیں
انکے بھائی عبد اللہ جو ابتک مسلمان نہیں ہوئے تھے دن بھر کافروں کے ارادوں اور مشوروں کا
پتہ لگایا کرتے تھے اور رات کو غار میں پہونچکر تمام خبریں سُنا دیا کرتے تھے۔ عامر
حضرت ابو بکر کا چرواہا رات کو اُن کی بکریاں غار کے موبھ پر لاتا تھا بقدر ضرورت
دودھ دے جاتا تھا اور حضرت اسمار اور عبد اللہ کے نقش قدم کو اپنی بکریوں کے کھروں سے
مٹا دیتا تھا تاکہ کفار کو اسکے ذریعہ سے غار کا سراغ نہ لگ جائے۔

آخر کار کافر تھک کر بیٹھ رہے۔ مگر ابھی تک اُن کو کسیقدر امید باقی تھی اُنھوں نے
سو اونٹ کا انعام اُس شخص کے لیے مقرر کیا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرکے لائے
تیسرے دن رات کو جب اسمار کھانا لیکر گئیں تو آپنے اُن سے کہا کہ تم علیؓ سے جا کر کہو
کہ وہ کل رات کیوقت ہمارے لیے تین اونٹ اور ایک راہبر تلاش کرکے یہی غار پر بھیجیں۔
حضرت علیؓ نے ایسا ہی کیا حضرت اسمار زاد راہ تیار کرکے لیگئیں۔ دسترخوان کو
باندھنے کے لیے رسّی کی ضرورت ہوئی مگر وہاں رسّی کہاں؟ حضرت اسمار نے
جھٹ اپنا نطاق (ایک رومال جسکو عرب کی عورتیں قمیص کے اوپر کمر پر باندھتی ہیں)
کھولکر اسکے دو ٹکڑے کردیئے ایک سے دسترخوان باندھا دوسرے سے مشکیزہ کا موبھ۔
اُسی دن دربار نبوت سے ان کو ذات النطاقین کا لقب ملا۔

حضرت ابو بکرؓ جب اسلام لائے تھے تو انکے پاس چالیس ہزار دینار یعنی تقریباً
ایک لاکھ روپیے تھے۔ وہ تمام دولت اُنھوں نے آنحضرت اور دین اسلام کی امداد میں
صرف کردی۔ ہجرت کے وقت کُل پانچہزار درہم یعنی ہزار ڈیڑھ ہزار روپیے انکے پاس باقی
رہ گئے تھے۔ وہ بھی اپنے بیٹے عبد اللہ سے منگا کر اپنے پاس رکھ لیے کہ مدینے میں آنحضرت
کے کام آئینگے۔ اور بال بچوں کو اللہ کے بھروسہ پر چھوڑ کر چلے گئے۔

حضرت اسمار اُن لوگوں کو رخصت کرکے گھر آئیں۔ صبح کو ابو قحافہ (حضرت

ابوبکر صدیق کے والد جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے بعد میں اسلام لائے) اُنکے گھر میں آئے۔ بہت بڈھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بہت رنج کے ساتھ کہنے لگے کہ نہایت افسوس ہے کہ ابوبکر خود بھی چلے گئے اور تمام مال بھی ساتھ لے گئے تم لوگوں کے لیے کچھ نہ چھوڑا۔ حضرت اسمار نے ان کی طبیعت کو تسکین دلانے کے لیے ایک تھیلی کنکر پتھر سے بھر کے اُسی طاق میں رکھدی جس میں حضرت ابوبکرؓ روپیے رکھا کرتے تھے اور اُن سے کہا کہ دادا میاں! وہ تو ہمارے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں اور اُن کا ہاتھ لیجاکر اُس طاق پر رکھدیا۔ ابوقحافہ سمجھے کہ حقیقت میں روپیے ہیں۔ ان کو اطمینان ہوگیا اور بولے خیر۔ تب کچھ حرج نہیں۔

مدینہ میں پہنچکر حضرت ابوبکرؓ نے تین اونٹ بھیجے۔ اور عبداللہ کو لکھا کہ تم سب کو لیکر چلے آؤ۔ چنانچہ وہ حضرت عائشہؓ اور اُن کی والدہ ام رومان اور حضرت اسماءؓ کو لیکر مدینے روانہ ہوئے۔

ان کا نکاح حضرت زبیرؓ کے ساتھ ہوا تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور جنکو حواری کا لقب ملا تھا۔ خود حضرت اسمار کی زبانی روایت نقل کی گئی ہے کہ

"جب میرا نکاح زبیرؓ کے ساتھ ہوا تو اُنکے پاس کچھ نہ تھا۔ نہ کوئی غلام تھا۔ نہ کچھ مال تھا نہ سامان تھا۔ صرف ایک گھوڑا تھا۔ میں ہی اس گھوڑے کی سائیسی کی خدمت انجام دیتی تھی۔ آنحضرتؐ نے زبیرؓ کو ایک نخلستان عطا فرمایا تھا جو مدینے سے دو میل کے فاصلہ پر تھا۔ میں وہاں سے کھجور کی گٹھلیاں روزانہ اپنے سر پر اُٹھا کر لاتی۔ خود ہی دلتی پھر گھوڑے کو کھلاتی۔ اسکو پانی پلاتی۔ اسکا ساز سیتی۔ گھر کا جو کچھ کام کاج ہوتا وہ بھی میں ہی کرتی تھی۔ مجھے اچھی روٹی پکانی نہیں آتی تھی۔ آٹا گوندھکر اپنے پڑوس میں انصار کی بیویوں کو جو نہایت خلوص اور محبت رکھنے والی بیویاں تھیں اور دسکو کام کرکے اُن کو دلی خوشی ہوتی تھی دے آیا کرتی تھی وہ پکا دیا کرتی تھیں۔ اسقدر

دشواری اور مشکل میں دیکھ کر میرے باپ نے میرے پاس ایک غلام بھیجدیا جس کی بدولت گھوڑے کی سائیسی سے مجکو سبکدوشی ہوگئی۔ انھوں نے غلام کیا بھیجا گویا مجکو آزاد کر دیا"

حضرت زبیرؓ عرب کے اُن لوگوں میں سے تھے جو بہادری میں بے مثل مانے گئے ہیں وہ آنحضرت کے زمانے میں اور اُن کے بعد بھی برابر لڑائیوں میں شریک رہے۔ شام اور مصر کی فتوحات میں انکے بڑے کارنامے ہیں۔ حضرت اسمارؓ بھی انکے ساتھ جایا کرتی تھیں۔ جنگ یرموک جو شام میں سب سے بڑی لڑائی ہوئی اس میں بھی موجود تھیں۔ حضرت عمرؓ نے ایکہزار درہم سالانہ ان کی تنخواہ مقرر کی تھی۔

جس زمانے میں سعید ابن العاصؓ مدینہ شریف کے حاکم تھے۔ اُس زمانے میں وہاں چوریاں بہت ہونے لگی تھیں۔ حضرت اسمارؓ اپنے سرہانے خنجر رکھ کر سویا کرتی تھیں۔

انکے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں، انکے نام یہ ہیں۔

عبداللہ۔ عروہ۔ منذر۔ عاصم۔ مہاجر۔ خدیجہ۔ ام الحسن۔ عائشہ رضی اللہ عنہم ان کے تمام بیٹوں کے تاریخ اسلام میں بڑے بڑے کارنامے ہیں۔ عروہؓ بہت بڑے محدث ہوئے۔ حضرت عبداللہؓ جو بعد ہجرت کے اسلام کے اوّلین فرزند ہیں خلیفہ ہی ہو گئے تھے۔

باوجودیکہ حضرت اسمارؓ کے گھر میں دولت کی کچھ انتہا نہ رہی مگر وہ اپنی اسلامی سادگی پر رہیں۔ ہمیشہ موٹا پہنتیں اور درویشی کے ساتھ بسر کرتیں۔ انکے بیٹے منذرؓ جب عراق کی لڑائی فتح کرکے لوٹے تو کچھ زنانے خوبصورت کپڑے انکے لیے لائے۔ انھوں نے نہیں منظور کیا اور واپس کر دیا، منذرؓ پھر موٹے کپڑے لیکر خود ان کی خدمت میں گئے اور پیش کیا۔ بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں کہ ہاں مجکو ایسے ہی کپڑے پہنایا کرو۔

فیاضی جو عرب کا اصلی جوہر ہے حضرت اسمارؓ کے مزاج میں بہت تھی۔ اپنے تمام

بال بچوں کو ہمیشہ نصیحت کیا کرتی تھیں کہ مال اپنا اور دوسروں کا کام نکالنے کے لیے ہے نہ کہ جمع کرنے کے لیے۔ اگر تم اللہ کی مخلوق سے اپنے مال کو روکوگے تو اللہ بھی اپنی نعمتوں کو تم سے روک رکھیگا۔ جو تم نے صدقہ کیا وہی دراصل تمہارا ذخیرہ ہے اور وہ کبھی کم نہو گا۔

ان کو کبھی کبھی درد سر کا دورہ ہوجایا کرتا تھا۔ اُسوقت جو کچھ انکے پاس ہوتا تھا غریبوں کو بانٹ دیتی تھیں اور جسقدر غلام ہوتے تھے سب کو آزاد کردیتی تھیں۔ کیونکہ صدقہ سے انسان کی بلائیں رد ہوجاتی ہیں۔

شرک کی ایسی سخت دشمن تھیں کہ اُن کی ماں قتیلہ کچھ تحفے تحائف لیکر مدینے میں انکو دیکھنے آئیں۔ انھوں نے انکے تحفے لینے سے انکار کردیا اور گھر میں نہیں داخل ہونے دیا کیونکہ وہ ابتک مشرک تھیں۔ حضرت عائشہ رضؓ کے پاس کہلا بھیجا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو کیا حکم دیتے ہیں۔ آپنے فرمایا کہ تحفے قبول کرو اور اُن کو مہمان رکھو۔ تب اُن کو گھر میں لاکر مہمان رکھا۔

سنہ۶۳ھ میں انکے بیٹے عبداللہ مدینے سے مکے میں آگئے حضرت اسماء رضؓ کو بھی جو بڑھاپے کی وجہ سے اندھی ہوچکی تھیں وہیں بُلا لیا۔ حضرت عبداللہ رضؓ جیسا فرمانبردار بیٹا ہونا بھی بہت ہی مشکل ہے وہ اپنی اس بوڑھی ماں کی بہت اطاعت کرتے تھے اور انکی رضامندی کو اپنے تمام مقاصد کی کنجی سمجھتے تھے۔

سنہ۶۴ھ میں وہ عرب اور عراق وغیرہ کے خلیفہ ہوگئے۔ سات برس خلافت کرنیکے بعد عبدالملک ابن مروان کے وزیر حجاج نے ان پر بڑی بھاری فوج لیکر چڑھائی کی اور یکم ذی الحجہ سنہ۷۲ھ کو مکے کا محاصرہ کرلیا۔ چاروں طرف سے رسد کی آمد بند کردی چھ مہینے تک لڑائی جاری رہی۔ حضرت عبداللہ رضؓ کے مددگار بوجہ کمی رسد کے ٹوٹ ٹوٹ کر حجاج سے جاملے۔ اور انکے پاس تھوڑے سے آدمی رہ گئے۔

آخر شہر پناہ کے دروازے بھی لوگوں نے کھولدیئے اور دشمن چاروں طرف سے

گھس پڑے۔ حضرت عبداللہؓ اپنی ماں کے پاس گئے اُنھوں نے کہا کہ بیٹا اگر تو سمجھتا ہے کہ حق پر ہے تو مردوں کی طرح لڑ۔ اور ذلت کی کوئی بات جان کے خوف میں آکر ہرگز برداشت نہ کر۔ عزت کے ساتھ تلوار کھانا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اسکے کہ ذلت کے ساتھ آدمی دنیا کی نعمتیں کھائے۔

حضرت عبداللہؓ بہادری کے ساتھ لڑے۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ آخر زخمی ہو کر گرفتار ہوئے۔ حجاج نے ان کا سر کاٹ کر عبدالملک کے پاس بھیجدیا اور حضرت اسماءؓ کے پاس جاکر کہا کہ تمہارے بیٹے کو میں نے اسلیے قتل کیا کہ اس نے اللہ کے گھر میں بیدینی اور بغاوت پھیلائی تھی۔ حضرت اسماءؓ نے کہا کہ واللہ میرا بیٹا بیدین نہ تھا۔ بڑا پرہیزگار عبادت گزار اور اپنی ماں کا فرماں بردار تھا۔ مگر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سُنی ہے کہ قبیلہ ثقیف سے دو دجّال پیدا ہوں گے جن میں سے دوسرا پہلے سے بدتر ہوگا۔ پہلا تو گزرچکا (مختار ثقفی) دوسرا تو ہے۔ حجاج انکے اس بے ہراس اور تلخ جواب سے جل گیا اور اُس نے عبداللہؓ کی نعش حجون پہاڑی لٹکادی اور کہا کہ جبتک اسماءؓ خود آکر نہ مانگیں وہیں لٹکی رہے۔ تین دن گزر گئے۔ تیسرے دن بھی جب حضرت اسماءؓ نے سُنا کہ ابتک نعش لٹکی ہوئی ہے تو کہا کہ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ یہ سوار اُترے۔

جب یہ جملہ لوگوں نے سُنا تو حجاج سے سفارش کی۔ اُس نے نعش اُتروادی اور وہ دفن کی گئی۔ حضرت اسماءؓ کی عمر اسوقت سو برس کی تھی۔ ان کا کوئی دانت نہیں ٹوٹا تھا اور تمام قوے صحیح و سالم تھے البتہ آنکھوں سے معذور ہوگئی تھیں عبداللہؓ کے مارے جانے کے بیس روز کے بعد ۲۷۔ جمادی الاوّل ۷۳ھ میں انتقال کیا۔ مکّہ میں دفن ہوئیں۔

امِ عمارہ رضؓ

ان کا نام نسیبہ ہے۔ لیکن یہ اپنی اسی کنیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ باپ کا نام کعب ہے جو قبیلہ بنی نجار میں سے تھے۔ ان کی والدہ رباب بنت عبداللہ قبیلہ خزرج میں سے تھیں۔ ہجرت سے تخمیناً چالیس سال قبل ان کی ولادت مدینے میں ہوئی۔

ان کا نکاح انھیں کے چچازاد بھائی زید بن عاصم کے ساتھ ہوا۔ ان سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ عبداللہ اور حبیب۔ زید بن عاصم کے انتقال کے بعد ان کا دوسرا نکاح انھیں کے قبیلے کے ایک شخص غزیہ بن عمر سے ہوا۔ ان سے ایک بیٹا تمیم اور ایک بیٹی خولہ پیدا ہوئی۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی اور آپ نے لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا تو مکے کے اکثر لوگ دشمن ہو گئے اور اُنھوں نے اسلام کی سخت مخالفت شروع کی۔ جو لوگ مسلمان ہوتے تھے اُن کو تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ انکی ایذا رسانی کیوجہ سے کوئی مسلمان مکہ میں مشکل سے ٹھہر سکتا تھا۔ چنانچہ آپ سب کو حبشہ کی طرف بھیجدیا کرتے تھے کیونکہ وہاں کا بادشاہ مسلمانوں کا بڑا حامی تھا اور اُن کو آرام دیتا تھا۔

جب آپ نے سالہا سال کوشش کر کے دیکھ لیا کہ وہ لوگ اسلام نہیں لاتے اللہ تعالےٰ نے انکے دلوں پر مُہر لگا دی ہے اور اُنکی عداوت اور دشمنی برابر بڑھتی چلی جاتی ہے تو ان کا پیچھا چھوڑ دیا۔ اور بڑے بڑے بازاروں اور مجمعوں میں جہاں عرب کے تمام قبائل جمع ہوتے تھے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کرنے لگے۔ یہ خواہش بھی تھی کہ اگر کوئی دوسرا قبیلہ اسلام کی حمایت کے لیے آمادہ ہو جائے تو آپ مکہ والوں کو چھوڑ کر انہیں میں جا لیں۔

اتفاق سے ایک سال مدینے کے چھ آدمی آپ کا وعظ سُن کر مسلمان ہو گئے۔
دوسرے سال چھ اور بڑھے۔ اب حضور نے ایک صحابی کو جنکا نام مصعب بن عمیرؓ تھا مسلمانوں کے ساتھ مدینہ کو روانہ کر دیا کہ وہاں قرآن کی تعلیم دیں حضرت مصعبؓ اور اُن بارہ مسلمانوں کی کوشش سے مدینے کے بڑے بڑے سردار اسلام لائے اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ انھیں اسلام لانے والوں میں حضرت ام عمارہؓ اور اور اُن کا گھرانہ ہے۔
تیسرے سال مدینے سے ۷۵ مسلمان مکّے پہونچے۔ مشرکوں کے خوف سے حج کے دو تین دن کے بعد رات کو پچھلے پہر ایک پہاڑی کی گھاٹی میں یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ وہاں حضور کے ہاتھ پر ان سب لوگوں نے بیعت کی اور یہ عہد و پیمان ہوا کہ "حضور مدینے تشریف لیچلیں۔ ہم جان مال اور اولاد سب کچھ اللہ کے دین کی مدد میں قربان کرینگے" اسی بیعت کو بیعت عقبہ کہتے ہیں۔ جو لوگ اسمیں شریک تھے اُن کا درجہ تمام انصار میں بلند ہے۔ اس بیعت میں دو عورتیں بھی تھیں۔ ایک تو یہی ام عمارہؓ اور دوسری ام منیع رضؓ
اس عہد و پیمان کے مطابق آنحضرت مکّے سے ہجرت کر کے مدینے چلے آئے۔ کفار مکہ نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا کئی بار چڑھائی کر کے آئے اور لڑائیاں ہوئیں یہانتک کہ بدر کی لڑائی ہوئی جس میں مکے کے کافروں کے اکثر بڑے بڑے سردار مارے گئے اور اللہ تعالیٰ نے اسلام کو کفر پر نمایاں فتح عطا فرمائی۔ کفار نے اپنے سرداروں کا بدلہ لینے کی غرض سے بڑی سخت تیاری کی اپنے آس پاس کے تمام قبیلوں کو جمع کیا سب کو ہتیار اور سواری دی اور تین ہزار سے کچھ زیادہ جنگی آدمی جمع کر کے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مدینے پر چڑھائی کی۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر سُنکر مسلمانوں کو جمع کیا۔ تقریباً ایک ہزار

آدمی تھے۔ ان کو لیکر جب لڑائی کے لیے نکلے تو ان میں سے بھی تین سو منافق راستے سے واپس چلے آئے۔ اب صرف سات سو مسلمان رہ گئے۔ منافقوں کے بھاگ آنے سے اُن کا حوصلہ بھی پست ہو گیا تھا۔ مگر آنحضرت نے اُن کو ہمت دلائی اور اللہ پر بھروسہ کر کے مقابلے کے لیے بڑھے۔

مدینے سے دو تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے جسکا نام احد ہے اسکے دامن میں شنبہ کے دن ۱۱۔ شوال ۳ھ کو مقابلہ ہوا۔ مسلمان اچھے موقع پر پہنچ گئے تھے کافروں میں سات آٹھ سو سوار تھے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ جو اسوقت تک اسلام نہیں لائے تھے ان سواروں کے سردار تھے۔ ایک نہایت محفوظ درّہ تھا اور سوائے اس درّہ کے ان سواروں کے آنے کا اور کوئی رستہ نہ تھا۔ آنحضرتؐ نے اس درّہ پر پچاس مسلمانوں کو مقرر کر دیا کہ اس طرف سے جب سوار حملہ کریں تو تم لوگ اُن کو روکنا آگے نہ بڑھنے دینا۔ اور جبتک ہم حکم نہ دیں اُسوقت تک ہرگز اس جگہ سے نہ ہٹنا۔ یہ لوگ لوہے کی دیوار کی طرح وہیں جم گئے۔ جب کفار ادھر سے آنے لگے تو ان تھوڑے سے مسلمانوں نے اُن کو تیروں پر رکھ لیا۔ مجبور ہو کر رُک گئے اور میدان میں نہ آ سکے۔ ادھر گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی۔ قریب تھا کہ مشرکوں کو شکست ہو جائے کہ اتنے میں اسلامی فوج کا علم بردار شہید ہو گیا۔ بعض کافروں نے سمجھا کہ یہی رسول اللہ تھے اُنھوں نے خوشی کا نعرہ لگایا کہ ہم نے نبی کو قتل کر دیا۔

مسلمانوں نے جب یہ آواز سُنی تو اکثر بدحواس ہو گئے۔ ان کو کسی چیز کی خبر نہیں رہی۔ کوئی جہاں تھا وہیں مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ کوئی گر پڑا۔ کوئی بیہوش ہو گیا۔ کسی کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں اور ہاتھ سے تلوار گر پڑی۔ مشرک خوشی کے جوش میں ٹوٹ پڑے۔ درّہ پر جو مسلمان تھے وہ بھی سراسیمہ ہو کر دوڑے کہ یہ کیا ماجرا گزرا ان لوگوں کا وہاں سے ہٹنا تھا کہ خالدؓ نے اپنے سواروں کو لیکر حملہ کیا اور قیامت بپا

قیامت برپا کردی۔ سرورِ کائنات کے عم محترم امیر حمزہؓ اور بہت سے مسلمان شہید ہو گئے اور بہتوں کے میدان سے قدم اکھڑ گئے۔

اس سخت وقت میں حضور کے اِردگرد صرف چند مسلمان جنکی تعداد دس سے زیادہ نہ ہوگی حفاظت کے لیے رہ گئے۔ انھیں میں ام عمارہؓ ان کے دونوں بیٹے عبداللہؓ اور حبیبؓ اور اُن کے شوہر غزیہ بن عمرؓ تھے۔ خود حضرت ام عمارہؓ کی زبانی مورخوں نے اس واقعہ کی کیفیت لکھی ہے ہم اسکا ترجمہ کرتے ہیں۔

"ام عمارہؓ نے کہا کہ میں اپنے کندھے پر مشک لیے ہوئے پیاسوں کو پانی پلا رہی تھی۔ یکایک مسلمانوں نے شکست کھائی اور ان کے قدم اکھڑ گئے۔ کفار نے چاروں طرف سے سخت حملہ کیا۔ میں نے اسی وقت مشک پھینکی۔ اور ایک تلوار اُٹھا کر آنحضرت کی حفاظت کے لیے کھڑی ہوگئی۔ میرے پاس ڈھال نہ تھی کسی پلٹ کر جانے والے کی طرف حضرت نے اشارہ کیا وہ اپنی ڈھال پھینکتا گیا۔ میں دشمنوں کے تیروں اور تلواروں کو اسی ڈھال پر روکنے لگی۔ مصیبت یہ تھی کہ ہم پیدل تھے اور غنیم سواریوں پر۔ اگر وہ بھی ہماری طرح پیدل ہوتے تو ہم آسانی سے اُن سے بھگت لیتے۔ سوار اپنی پوری قوت سے ہمارے اوپر حملہ کرتے تھے۔ اُن کا روکنا بہت دشوار تھا۔ میں نے تو یہ ترکیب نکالی کہ جب کوئی سوار وار کرتا تو اسکو روک لیتی اور جوں ہی وہ آگے بڑھتا پیچھے سے ایک ایسا وار کرتی کہ اُسکے گھوڑے کا پاؤں کٹ جاتا اور وہ مع سوار کے گر پڑتا۔ یہ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے بیٹے عبداللہ کو زور سے آواز دیتے کہ اپنی ماں کی مدد کر۔ وہ فوراً آجاتا اور میں اور وہ دونوں مل کر اس سوار کا خاتمہ کر دیتے۔"

حضرت ام عمارہؓ کے بیٹے عبداللہؓ کی زبانی روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ

"میں اور میری ماں دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہے تھے
میں دوسری طرف مشغول تھا کہ ایک مشرک نے پیچھے سے آکر میرے بازو پر
ایک تلوار ماری۔ زخم بہت کاری پڑا۔ میں نے مڑ کر اس پر حملہ کیا لیکن وہ سیدھا
نکل گیا۔ میں لڑ رہا تھا مگر میرا خون نہیں بند ہوتا تھا۔ حضور نے ام عمارہؓ کو حکم دیا
کہ اس کے زخم پر پٹی باندھو۔ وہ اپنے ساتھ اسی غرض کے لیے بہت سی پٹیاں
لائی تھیں۔ فوراً ایک پٹی نکال کر خوب مضبوط باندھی اور بولیں کہ بیٹا اُٹھو اور
اور لڑو۔ میں خون کے نکلنے سے بہت کمزور ہو گیا تھا اُٹھنے کی طاقت نہیں تھی
آنحضرت نے فرمایا کہ اے ام عمارہؓ ہر شخص میں وہ طاقت کہاں ہوتی ہے جو تجھ میں ہے
اتنے میں وہ شخص جس نے مجھے زخمی کیا تھا پھر پلٹ کر اسی طرف آیا۔ آنحضرت نے
اسکو دیکھ کر فرمایا کہ اے ام عمارہؓ دیکھ وہی شخص آ رہا ہے جس نے عبد اللہؓ کو زخمی کیا ہے
ام عمارہؓ نے لپک کر اُس پر تلوار کا وار کیا۔ اس کی ایک پنڈلی صاف کٹ گئی
اور وہ اُسی جگہ دھم سے گر پڑا۔ پھر اُنھوں نے آگے بڑھ کر اس کا سر کاٹ لیا
حضور مسکرائے اور فرمایا کہ ام عمارہؓ اللہ تعالیٰ نے بڑا تازہ بدلا تجکو عطا کیا"

کئی گھنٹے تک یہی حالت رہی حضرت ام عمارہؓ کے زخموں کا کچھ شمار نہ تھا لیکن
ان کے جسم میں فولاد کے تاروں کی رگیں تھیں۔ ذرا بھی تو ان زخموں کی پروا نہیں کرتی
تھیں۔ اور برابر چستی اور چالاکی کے ساتھ حضور کی حفاظت میں مشغول تھیں۔

اسی درمیان میں کسی کافر نے ایک پتھر پھینک مارا۔ جس سے سرورِ کائنات کا بھی
نیچے کا لب زخمی ہو گیا اور نیچے کے سامنے کے دو دانتوں میں سے داہنا دانت شہید ہو گیا
پھر ایک کافر نے جسکا نام ابن قمیئہ تھا۔ جو بہت بہادر اور مشہور سوار تھا آپ پر تلوار کا وار
کیا۔ جس سے خود کے دو حلقے رخسار مبارک میں دھنس گئے۔ حضرت ابی عبیدہ
بن الجراحؓ نے ان حلقوں کو نکالا۔ رخسار مبارک سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے۔

یہ دیکھ کر حضرت ام عمارہؓ نے بیتابی کے ساتھ اُچھل کر ابن قمئہ پر حملہ کیا۔ اُس نے انکے مونڈھے پر بھی ایک تلوار ماری جس سے ایک بڑا گہرا زخم آیا۔ باوجود اس زخم لگنے کے بھی حضرت ام عمارہؓ نے اس پر تلوار کے پیاپے کئی وار کیے لیکن وہ دشمنِ خدا دو زرہیں پہنے ہوئے تھا۔

ابن قمئہ تو بھاگ گیا۔ لیکن حضرت ام عمارہؓ کو بڑا کاری زخم لگا تھا خون میں لت پت ہو گئیں۔ حضور نے اپنے سامنے کھڑے ہو کر ان کے زخم پر پٹی بندھوائی۔ اور فرمایا کہ واللہ ام عمارہؓ کا آج کا کارنامہ فلاں فلاں (چند بہادر صحابہ کے نام لیکر) کے کارناموں سے بہت بڑھکر ہے۔ ام عمارہؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ میرے لیے دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ہمراہ مجکو جنّت میں داخل کرے۔ آپ نے دعا فرمائی۔ ام عمارہؓ نے کہا کہ بس اس کے بعد دنیا میں جو مصیبت چاہے میرے سر پر گزر جائے مجھے ذرا بھی پرواہ نہیں۔

میدان جنگ سے جن مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے تھے اُن میں سے بعض بعض مدینہ کے قریب تک پہونچ گئے۔ ایک صحابیہ جنکا نام ام ایمنؓ تھا مدینے سے مشک لیکر احد کی طرف آرہی تھیں کہ مسلمانوں کو پانی پلائیں۔ دیکھا کہ لوگ بھاگے آرہے ہیں کیفیت پوچھی اُنھوں نے واقعہ بیان کیا۔ حضرت ام ایمنؓ نے زور سے چلا کر ان کو ڈانٹا اور مٹھی میں خاک بھر کر ان کی طرف پھینکی۔ اور کہا کہ رسول اللہؐ کو چھوڑ کر تم لوگ کس مونھ سے یہاں چلے آئے۔ مرد بنے ہو۔ لو۔ یہ ہماری چوڑیاں پہنو۔ گھر کا چولھا چکی سنبھالو۔ اور اپنی تلواریں ہم کو دیدو ہم جا کر لڑیں۔ انکے اس کہنے سے وہ غیرتمند مسلمان پلٹے۔ اُدھر بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ ہیں۔ اب ان کی ٹوٹی ہوئی ہمت پھر بندھی اور میدان میں جم گئے۔ ظہر کے وقت لڑائی ختم ہو گئی۔ حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ اور بڑے بڑے صحابہ کے ساتھ آپ پہاڑ پر گئے وہاں نماز پڑھائی پھر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔

حضور کو ام عمارہ رضؓ کا بڑا خیال تھا۔ آپ نے کے ساتھ ہی عبداللہؓ بن کعبؓ کو انکے دیکھنے کے لیے بھیجا۔ معلوم ہوا کہ اب حالت اچھی ہے۔ زخم مہلک نہیں ہے۔ تب آپ کو اطمینان ہوا۔ پورے ایک سال تک علاج کرنے کے بعد یہ زخم اچھا ہوا۔

بالاتفاق تمام موّرخ لکھتے ہیں کہ واقعہ حدیبیہ۔ خیبر اور حنین کی لڑائیوں میں بھی ام عمارہ رضؓ آنحضرت کے ہمراہ شریک ہوئیں لیکن مجکو ابتک کسی کتاب سے ان لڑائیوں میں انکے کارناموں کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی ہے۔ جنگ یمامہ کا حال جو کچھ معلوم ہو ہے وہ لکھتا ہوں۔

اہل یمامہ کا سردار مسیلمہ کذاب ایک نہایت زبردست اور بڑا جابر شخص تھا۔ پہلے تو مسلمان ہوا پھر دنیا کے لالچ میں مرتد ہوگیا۔ آنحضرت کے انتقال کے بعد اس نے بڑی سرکشی پر کمر باندھی۔ اسکا قبیلہ بہت بڑا تھا لڑنے والے تقریباً چالیس ہزار آدمی تھے اس نے اپنی اس قوت کے گھمنڈ میں آکر نبوت کا دعویٰ کردیا۔ اور سب سے اپنے آپ کو نبی کہلوانا شروع کیا۔ جو نہ کہتا اُسکو طرح طرح کی سزائیں دیتا۔

حضرت ام عمارہ رضؓ کے بیٹے حبیب رضؓ عمان سے مدینہ شریف کو آرہے تھے۔ مسیلمہ نے راستے سے ان کو پکڑوالیا اور کہا کہ تم گواہی دیتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں؟ اُنھوں نے کہا کہ ہاں۔ اُسنے کہا نہیں۔ یہ گواہی دو کہ مسیلمہ رسول اللہ ہے۔ اُنھوں نے کہا ہرگز نہیں۔ تب اُس نے اُن کا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا۔ پھر یہی سوال کیا اُنھوں نے پھر وہی جواب دیا۔ دوسرا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ الغرض پھر پاؤں کاٹے۔ زبان کاٹ ڈالیں۔ لیکن اُنھوں نے اس کذاب کی نبوت کا اقرار نہ کیا پر نہ کیا۔ اور جان دیدی

حضرت ام عمارہ رضؓ نے جب یہ واقعہ سُنا تو کلیجہ تھام کے رہ گئیں اور اپنے دل میں ٹھان لیا کہ اگر مسلمانوں نے لشکرکشی کی تو اس مرتد ظالم کو میں انشاءاللہ خود اپنی تلوار سے جہنم رسید کرونگی۔

حضرت ابوبکرؓ خلیفہ نے جب مسیلمہ کذاب کے حالات سُنے تو حضرت خالد بن ولید رضؓ کو چار ہزار فوج کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ حضرت ام عمارہؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئیں اور ان سے اجازت چاہی کہ اس لڑائی میں مجھے بھی جانے دیجیے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ہم تمہاری بہادری اور جرأت بہت اچھی طرح دیکھ چکے ہیں اس لیے تم شوق سے جاؤ ہم تم کو روک نہیں سکتے۔

مسیلمہ کذاب نے بڑا سخت مقابلہ کیا اور بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ قدم قدم پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ بارہ سو مسلمان شہید ہوگئے اور آٹھ نو ہزار کافر مارے گئے۔ اس کشمکش اور ہنگامہ میں حضرت ام عمارہ رضؓ نے اپنی نگاہ کے سامنے مسیلمہ کو رکھ لیا۔ جنگی بہادروں کو اپنے سامنے سے ہٹاتی برچھی کی نوک اور تلوار کی دھار سے اپنا راستہ نکالتی ہوئی غنیم کی بیچ فوج میں گھستی چلی جارہی تھیں۔ نیزے اور تلوار کے گیارہ زخم لگے۔ اور جب مسیلمہ کے بالکل قریب پہنچ گئیں تو کلائی پر سے ایک ہاتھ بھی کٹ گیا لیکن مطلق پرواہ نہ کی اور آگے بڑھی تھیں کہ مسیلمہ پر وار کریں۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہیں کہ ایک ساتھ اس پر دو تلواریں پڑیں اور وہ کٹ کر گھوڑے سے گر پڑا۔ اُنھوں نے دیکھا تو اُن کے بیٹے عبداللہ کھڑے ہیں۔ پوچھا کہ تو نے اسکو قتل کیا ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ ایک تلوار میری پڑی ہے دوسری وحشی کی (یہ وحشی وہ ہے جسنے اپنی کفر کی حالت میں جنگ احد میں حضرت امیر حمزہؓ کو شہید کیا تھا) اب معلوم نہیں کہ کس کے وار سے وہ مرا ہے۔ یہ دیکھ کر ام عمارہؓ اُسی وقت سجدہ میں گر گئیں اور اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

زخموں کی وجہ سے اور خاصکر ہاتھ کٹ جانے سے وہ کمزور ہوگئی تھیں۔ حضرت خالدؓ جو فوج کے سردار تھے اور جن کی بہادری ضرب المثل ہے وہ ام عمارہؓ کی شجاعت اور بزرگی کی وجہ سے ان کا بڑا ادب کرتے تھے۔

انھوں نے ان کے زخموں کے علاج اور تیمار داری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ چنانچہ حضرت ام عمارہ نے بعد میں کمال شکر گزاری کے ساتھ خالدؓ کی تعریف کی کہ "وہ نہایت ہمدرد شریف النفس اور متواضع سردار ہیں اُنھوں نے بہت غمخواری کے ساتھ ہماری تیمار داری کی"۔

جب حالت کچھ ٹھیک ہوگئی تو عبدؓ اللہ ان کو مدینے میں لائے خود خلیفۂ وقت حضرت ابوبکرؓ ان کو دیکھنے کے لیے انکے گھر آتے تھے۔

حضرت عمرؓ خلیفہ دوم کے زمانے میں ایک مرتبہ مال غنیمت میں چند بیش قیمت کپڑے آئے۔ ان میں سے ایک دوپٹہ مزرکش نہایت قیمتی تھا۔ کسی نے حضرت عمرؓ کو یہ رائے دی کہ آپ اسے اپنے بیٹے عبد اللہؓ کی بیوی کو دیں۔ کسی نے کہا کہ نہیں بلکہ اپنی بیوی ام کلثومؓ کو دیجیے جو حضرت علیؓ کی بیٹی ہیں۔ غرض مختلف لوگوں نے مختلف رائیں ظاہر کیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اسکا حقدار ام عمارہ رضؓ کو سمجھتا ہوں۔ اُنھیں کو دونگا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے احد کے دن سُنا تھا (آپ فرماتے تھے) کہ میں جدہر نظر ڈالتا تھا ام عمارہؓ ہی ام عمارہؓ مجکو نظر آتی تھیں۔ دائیں دیکھتا ہوں تو ام عمارہؓ۔ بائیں دیکھتا ہوں تو ام عمارہؓ۔ چنانچہ انھیں کے پاس اُسکو بھیجدیا۔

راقم کو اس سے زیادہ حالات معلوم نہو سکے۔

حضرت ام سلیم رضؓ

ان کا نام رمیصا ہے۔ اور ملحان بن خالد کی بیٹی ہیں جو مدینہ کے باشندے اور انصار کے قبیلہ بنی نجار میں سے تھے۔ ان کی والدہ کا نام ملیکہ تھا۔ ولادت ہجرت سے تخمیناً تیس سال پہلے ہوئی تھی۔ ان کا نکاح انھیں کے قبیلہ کے ایک شخص کے ساتھ ہوا تھا جنکا نام مالک تھا۔ ان سے ایک بیٹا پیدا ہوا جسکا نام انس بن مالکؓ تھا۔

انسؓ ابھی دودھ پیتے تھے کہ مدینہ میں خبر پہونچی کہ مکہ میں ایک نبی پیدا ہوا ہے اور وہ اللہ کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے۔ مدینہ کے لوگ سال بسال مکہ کو حج کے لیے جایا کرتے تھے۔ انھوں نے جب آنحضرت کو دیکھا اور کلام اللہ کی آیتیں سنیں تو انہیں سے بعض لوگ مسلمان ہو گئے۔ ام سلیمؓ نے بھی انھیں مسلمانوں کی زبانی آنحضرت کے حالات اور کلام پاک کی آیتیں سنیں۔ ان کے دل میں بھی اسلام کی سچائی اثر کر گئی اور وہ بھی مسلمان ہو گئیں۔

اُنھوں نے اپنے ننھے بیٹے انسؓ کو کلمہ سکھانا شروع کیا۔ انکے شوہر مالک بہت خفا ہوتے تھے کہ تو خود بیدین ہوئی اور میرے بچے کو بھی خراب کرنا چاہتی ہے حضرت ام سلیمؓ کہتیں کہ یہ تو بچہ ہی ہے میں تو یہ کوشش کرونگی کہ تم بھی اسلام کی سچائی کو سمجھو اور اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرو۔

اسی درمیان میں مالک کو کہیں سفر کرنا پڑا۔ راستہ میں کسی دشمن نے ان کو قتل کر ڈالا۔

حضرت ام سلیم کو انسؓ کے ساتھ غیر معمولی محبت تھی۔ مالک کے قتل ہونے کے بعد

بہت سے لوگوں نے ان کے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن اُنھوں نے انکار کیا اور کہا کہ جب تک میرا بیٹا اس قابل نہو جائے کہ وہ مجلسوں میں بیٹھے اور گفتگو کرے اسوقت تک میں ہر قسم کی تنگی اور ترشی برداشت کرونگی۔ لیکن نکاح نہ کرونگی۔ کیونکہ ان کو خیال تھا کہ ممکن ہی کہ اگر میں نکاح کرلوں تو سوتیلے باپ سے میرے بچے کو کچھ تکلیف پہونچے۔ چنانچہ حضرت انسؓ بعد میں اپنی ماں کے اس احسان کو نہایت شکریہ کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ میری ماں نے میری محبت اور تربیت کا حق ادا کردیا۔

جب آنحضرت مکے سے ہجرت کرکے مدینے میں تشریف لائے اسوقت انسؓ کی عمر دس سال کی تھی۔ ام سلیمؓ ان کو لیکر خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ یا رسول اللہ میں نے اس اپنے بیٹے کو بڑی آرزوں سے پالا ہی اور میری دلی تمنا یہ ہی کہ یہ آپ کی خدمت گزاری کرے۔ حضور نے اسکو قبول فرمایا۔ اور انسؓ کو اپنی زندگی تک اپنی ہی خدمت میں رکھا۔ یہی حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ دس سال تک میں نے رسالت مآب کی خدمت گزاری کی لیکن اتنے زمانے میں کبھی آپنے یہ نہ فرمایا کہ انسؓ تم نے ایسا کیوں کیا۔ یا ایسا کیوں نہ کیا۔ اور اس عرصہ میں جسقدر میں نے آپکے کام کیے ہونگے اس سے زیادہ آپنے میرے کام کردیئے ہونگے۔

ام سلیمؓ جب انسؓ کو حضور کی خدمت میں سپرد کرچکیں تو انھیں کے قبیلہ کے ایک معزز آدمی نے جنکا نام ابو طلحہ تھا نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضرت ام سلیمؓ نے کہا کہ میں رسول اللہ پر ایمان لائی ہوں اور تو کافر ہے میں تیرے ساتھ کیونکر نکاح کروں۔ ابو طلحہ! افسوس ہی کہ تو بت کو پوجتا ہی۔ لکڑی کے بت کو پوجتا ہی جو زمین سے اُگتا ہے اور جسکو حبشی غلام بسولے سے گھڑ کر تیار کرتا ہی۔ جو تجکو نہ نفع پہونچا سکتا ہی نہ نقصان اور تو اس زندہ طاقتور اللہ کو نہیں پوجتا جس کی بادشاہت آسمانوں اور زمینوں پر ہے

ابو طلحہ کے دل میں بات بیٹھ گئی۔ بت کو توڑ کر چولھے میں جھونکا۔ اور آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر کلمہ پڑھا۔ اور مشرف باسلام ہوئے۔

چونکہ وہ ام سلیمؓ کے سمجھانے سے اسلام لائے تھے اسوجہ سے اُن کو نہایت خوشی ہوئی۔ باوجود غربت کے بلا مہر کے انکے ساتھ نکاح کرنے پر رضامند ہوگئیں چنانچہ ابو طلحہ کا اسلام ہی اُن کا مہر قرار دیا گیا اور نکاح ہو گیا۔

ان سے ایک بچہ پیدا ہوا جسکا نام ابا عمیر رکھا۔ یہ بڑا شوخ اور پیارا بچہ تھا۔ آنحضرت کبھی کبھی ابو طلحہؓ کے گھر جایا کرتے تھے۔ ابا عمیر کی شوخیوں سے خوش ہوتے تھے۔ ایک دفعہ آپ تشریف لے گئے۔ ام سلیمؓ نے کچھ کھانا لاکر سامنے رکھا۔ آپنے تناول فرمایا۔ پانی پینے کے لیے کوئی برتن نہ تھا۔ مشکیزہ ہی سے مُنہ لگا کر پی لیا۔ ام سلیمؓ نے مشکیزہ کا موںھ جو حضور کے دہن مبارک سے چھو گیا تھا۔ برکت کی غرض سے فوراً کاٹ کر ایک ڈبیہ میں رکھ لیا۔ ابا عمیر اُس دن کچھ غمزدہ معلوم ہوتا تھا۔ آپ نے پوچھا کہ یہ سُست کیوں ہے۔ ام سلیمؓ نے کہا کہ اس نے ایک نغیر (مثل لال کے ایک چھوٹی سی چڑیا) پالی تھی۔ اسکے ساتھ کھیلا کرتا تھا آج وہ مرگئی۔ آپ مسکرائے اور قریب بُلا کے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا۔

یا ابا عمیر ما فعل النغیر۔ اے ابا عمیر تیری نغیر کیا ہوئی؟ بچہ ہنس پڑا۔

یہی ابا عمیر بیمار پڑا۔ اور سخت بیمار پڑا۔ ایک دن صبح کے وقت اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ ابو طلحہؓ کو اُس روز کوئی ضروری کام تھا۔ مجبوراً جانا پڑا۔ ادھر لڑکا گذر گیا۔ ام سلیمؓ نے گھر کے لوگوں کو منع کر دیا کہ ابو طلحہؓ کو اس کے موت کی خبر کوئی ندے۔ میں خود ہی ان سے کہونگی۔ نہ روئیں نہ چلائیں۔ بچے کو نہلایا کفنایا۔ اور گھر کی ایک کوٹھری میں اسکا جنازہ بند کر دیا۔

شام کو ابو طلحہؓ آئے۔ آتے ہی پوچھا کہ بچہ کیسا ہے؟ ام سلیمؓ نے کہا کہ جس

حالت میں تم چھوڑ گئے تھے اُس سے اچھی حالت میں ہے۔ وہ سمجھے کہ اب اچھا ہے۔ ہاتھ منہ دھویا۔ ام سلیمؓ نے کھانا لاکر رکھا۔ جب کھا پی کر فارغ ہوئے اور اطمینان سے بیٹھے تو ام سلیمؓ نے کہا کہ اگر ہم کو کوئی چیز عاریتاً ملے اور اس سے کچھ دن تک نفع اُٹھائیں۔ پھر وہ واپس لی جائے تو کیا ہم کو رنج و غم کرنا چاہیے۔ حضرت ابو طلحہؓ نے کہا کہ اس پر رنج و غم کرنا حماقت ہے۔ ام سلیمؓ نے کہا کہ اباعمیر بھی اللہ کی امانت تھا۔ اب واپس لے لیا گیا صبر کرو۔

ابو طلحہؓ نے جو یہ سُنا تو کہا کہ اوہو۔!! ام سلیم! تم چاہتی ہو کہ آج کی رات صبر میں مجھ سے سبقت لیجاؤ۔ واللہ یہ کبھی نہو گا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم سب اللہ ہی کی امانت ہیں اور اُسی کی طرف جائینگے۔ یہ کہہ کر اُٹھے اور بچے کو دفن کیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ واقعہ سُنا تو بہت خوش ہوئے۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اس صبر کا اچھا بدلہ دیگا۔ اور اُنکے لیے برکت کی دعا مانگی چنانچہ اباعمیر کا نعم البدل ایک دوسرا بیٹا اُن کو اللہ تعالیٰ نے عنایت کیا۔ جسکا نام عبد اللہ رکھا گیا۔

یہ عبد اللہؓ عرب کے شیروں میں سے ایک شیر گزرے ہیں۔ اور اُن کی اولاد کو اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے رتبے دیئے۔

جنگ احد میں ام سلیمؓ مع اپنے شوہر ابو طلحہؓ کے شریک تھیں۔ ابو طلحہؓ آنحضرت کی حفاظت میں سینہ سپر رہے۔ دشمنوں کے تیر او نیزے اپنے جگر پر روکتے تھے۔ اور حضرت ام سلیمؓ پیاسوں کو پانی پلاتی اور زخمیوں کے زخموں پر پٹی باندھتی تھیں۔

جنگ حنین میں جو بڑا بھاری معرکہ تھا باوجود اسکے کہ عبد اللہؓ اُسوقت پیٹ میں تھے موجود تھیں ایک خنجر کمر سے بندھا ہوا تھا۔ ابو طلحہؓ نے آنحضرت سے کہا کہ دیکھیے ام سلیمؓ بھی خنجر باندھ کر لڑنے کے لیے آئی ہے۔ ام سلیم بولیں کہ میں نے یہ خنجر اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ اگر کوئی کافر میرے قریب آیا تو اسکے پیٹ میں بھونک دونگی

حضور مسکرائے اور فرمایا کہ انشاء اللہ یہانتک نوبت ہی نہ پہونچے گی۔

ایک مرتبہ آپ ابو طلحہ رضؓ کے گھر گئے۔ روزہ رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھے اس کے بعد فرمایا کہ میں نماز پڑھونگا۔ ام سلیم رضؓ نے ایک کونے میں پانی چھڑک کر چٹائی بچھادی۔ آپنے نفلی نماز پڑھی۔ سلام پھیرنے کے بعد ام سلیم رضؓ کے گھرانے کے لیے دعا مانگنی شروع کی۔ اسوقت ام سلیم رضؓ نے دریائے نبوت کو جوش میں پایا۔ عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں سب سے زیادہ انس رضؓ کو چاہتی ہوں جو آپ کا خدمتگار رہا اسکے لیے خاص طور پر دعا فرمائیے۔ آپنے دین اور دنیا کی کوئی بھلائی ایسی نہیں چھوڑی جس کی انس رضؓ کے لیے دعا نہ کی ہو۔ اور کہا کہ یا اللہ تو اسکو مال دے۔ اولاد دے اور اس کی عمر میں برکت عطا فرما۔

اس پاک دعا کا اثر دیکھیے۔ یہی مفلس خدمتگار انس رضؓ بعد میں تمام انصار سے زیادہ دولتمند ہوئے۔ اور سو سال سے زائد عمر پاکر ۹۴ھ میں تمام صحابہ کے بعد بصرہ میں انتقال ہوا۔ اولاد کا یہ حال تھا کہ ایک سو انتیس ۱۲۹ بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

جب رسالت مآب حج کے لیے تمام اہل و عیال کو ساتھ لیکر مکے کو چلے اور مدینے کے تقریباً نصف باشندے ہمراہ تھے۔ اسوقت ام سلیم رضؓ کے پاس سواری نہ تھی کہ وہ حج کو چلتیں۔ آپنے ازواج مطہرات سے کہا کہ ان کو اپنے ہمراہ سوار کرلو۔ رستہ میں عورتوں کے اونٹ پیچھے رہ گئے۔ ہانکنے والے کا نام انجشہ تھا جو حضرت کے غلام تھے۔ انھوں نے حدی خوانی شروع کی جس سے اونٹ دوڑنے لگے۔ یہ دیکھ کر باوجود اسکے کہ قافلہ سے آپ آگے تھے فوراً اتر کر تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ انجشہ آہستہ آہستہ شیشے ہیں شیشے!! یعنی عورتیں مثل شیشہ کے نازک ہیں۔ ان کو تکلیف نہ ہو۔

حج سے فارغ ہو کر مقام منا میں جب آپ نے موے مبارک ترشوائے تو ام سلیمؓ نے ابو طلحہؓ سے کہا کہ حجام سے ان بالوں کو مانگ لاؤ۔ برکت کے لیے حفاظت کے ساتھ انکو ایک شیشی میں بند کر کے رکھ لیے۔

وفات کے متعلق صرف یہ معلوم ہو سکا کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ میں انتقال فرمایا۔

عہد صحابہ میں ان کا شمار عاقل ترین عورتوں میں تھا۔

حضرت خنساءؓ

ان کا اصلی نام تماضر ہے۔ لیکن چستی چالاکی اور حسن کی وجہ سے خنساءؓ کہی جاتی تھیں جس کے معنی ہرنی کے ہیں۔

انکے باپ کا نام عمرو بن الحارث تھا جو قبیلہ بنی سلیم سے تھے۔ اور ان کی پیدائش ہجرت سے تقریباً بالیس سال پہلے ہوئی قبیلہ ہوازن کا مشہور سردار درید بن الصمۃ جو جنگ حنین میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اسنے خنساءؓ کے باپ کے پاس نکاح کا پیغام دیا۔

خنساءؓ کے والد نے کہا کہ میں تمہاری شرافت اور سرداری سے واقف ہوں لیکن وہ لڑکی اپنا معاملہ خود اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے اس لیے میں اس سے کہونگا۔ چنانچہ اس نے خنساءؓ سے ذکر کیا۔

اس زمانہ میں اہل عرب اپنے قبیلے کے سوا کسی دوسرے قبیلے میں شادی کرنے کو معیوب سمجھتے تھے۔ خنساءؓ نے جواب دیا کہ میں اپنے قبیلے کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلے میں نکاح کرنا پسند نہیں کرتی۔ درید محروم واپس آیا۔

خنساءؓ کا نکاح پہلے رواحہ کے ساتھ ہوا جس سے ایک بیٹا عبد اللہ پیدا ہوا۔ رواحہ کے مرنے کے بعد دوسری شادی مرواس سے ہوئی۔ اس سے سراقہ۔ یزید۔ معاویہ عمر اور ایک بیٹی عمرہ پیدا ہوئی۔

خنساءؓ کی جو خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ تمام شعراے عرب کا اتفاق ہے کہ کوئی عورت عرب میں انکے برابر شاعر نہیں ہوئی نہ ان سے پہلے نہ ان کے بعد۔

بشار جو عربی کا بہت بڑا شاعر گزرا ہے اس نے ایک مرتبہ کہا کہ عورتوں کے اشعار کو جب میں غور سے دیکھتا ہوں تو اُن میں ایک نہ ایک نقص یا کمزوری پاتا ہوں کسی نے پوچھا کہ کیا خنساءؓ کے اشعار کا بھی یہی حال ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ تو مردوں سے بھی بڑھکر ہیں

جریر شاعر کہا کرتا تھا کہ اگر خنساءؓ کے اشعار نہ ہوتے تو میں دعوی کرتا کہ عرب میں سب سے بہتر شاعر میں ہوں۔

ان کی شاعری کا حال یہ تھا کہ ابتدا میں کبھی کبھی دو دو چار چار اشعار کہا کرتی تھیں۔ لیکن جب قبیلہ بنی اسد سے انکے قبیلہ کی لڑائی ہوئی تو اس میں انکا حقیقی بھائی مقتول ہو گیا۔ اور دوسرا بھائی صخر جو صرف باپ کی طرف سے بھائی تھا زخمی ہو کر آیا۔ اسکے سینہ میں ایسا برچھا لگا تھا کہ اسکا پھیپھڑا باہر نکل آیا تھا۔

خنساءؓ کو اسکے ساتھ بیحد محبت تھی کیونکہ وہ نہایت عقلمند۔ سخی۔ حسین اور بہادر شخص تھا۔ اُنھوں نے اپنے زخمی بھائی کی ایک سال تک تیمارداری کی لیکن وہ اچھا نہوا اور آخر اسی زخم سے ہلاک ہو گیا۔

اس کی موت سے خنساءؓ کو بے حد رنج و غم ہوا۔ اسی وقت سے انھوں نے صخر کے مرثیے کہنے شروع کیے۔ اور ایسے کہے کہ جسکو سُنکر لوگ بیتاب ہو جاتے تھے۔ انھیں مرثیوں سے تمام عرب میں انکا شہرہ ہو گیا۔

زمانہ جاہلیت میں اہل عرب مختلف مقامات پر مجلس منعقد کیا کرتے تھے جنکو بجائے مجلس کے میلہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کیونکہ اُن میں خرید و فروخت کی بھی گرم بازاری رہتی تھی۔ اگرچہ ان کا اصلی مقصد تبادلہ خیالات اور شعر گوئی ہوتا تھا۔

ان میں مرد اور عورتیں یکساں حصہ لیتے تھے۔ ان کی ابتدا ربیع الاول سے ہوتی تھی۔ یعنی ابتدائے موسم بہار سے تمام لوگ اپنے کاروبار چھوڑ کر انہیں میلوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ غرہ ربیع الاوّل میں پہلا میلہ دومۃ الجندل میں لگتا۔ اسکے بعد وہاں سے ہجر کے بازار میں آتا۔ پھر عمان کو جاتا۔ وہاں سے حضرموت کو روانہ ہوتا۔ پھر صنعاء یمن میں پہونچتا تھا۔ کسی مقام میں دس روز کسی میں بیس روز قیام رہتا تھا۔ اس طرح پر تمام ملک میں گشت لگانے کے بعد ذیقعدہ کے مہینے میں حج کے قریب آخری میلہ بازار عکاظ میں لگتا تھا جو مکّے سے چند میل کے فاصلہ پر ہے۔

بیس روز تک یہاں بڑی گرم بازاری رہتی تھی۔ عرب کے تمام قبائل اور اُن کے سردار لازمی طور پر یہاں جمع ہوتے تھے۔ اگر کوئی سردار کسی مجبوری سے نہیں آسکتا تھا تو اپنا قائم مقام بھیجتا تھا۔

اسی مقام سے اہل عرب کے تمام امور سرانجام پاتے تھے۔ سردار یہیں پر مقرر کیے جاتے تھے۔ قبیلوں کے باہمی خون اور لڑائیوں کا فیصلہ یہیں ہوتا تھا۔ اور چونکہ اس بازار پر قریش کی عظمت تھی اسلیے وہ تمام عرب میں ممتاز تھے۔ اور گویا ایک حیثیت سے حکومت کا اقتدار اُن کو حاصل تھا۔

جب تمام جھگڑے اور معاملات ختم ہو چکتے تو ہر قبیلہ کے شاعر جمع ہوتے اور اپنی بہادری۔ فیاضی۔ باپ دادا کے کارنامے۔ شکار و خونریزی کی کیفیت فخریہ بیان کرتے۔ جو لوگ مقرر ہوتے وہ تقریر کرتے تھے۔ یہاں ہر ایک شاعر اور مقرر کا درجہ مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ بازار گویا اہل عرب کی لیاقت کے امتحان کا مقام

تھا۔ جو جس قابل ہوتا مان لیا جاتا۔ اور تمام عرب میں اس کی شہرت ہو جاتی۔
خنساءؓ کے مرثیے یہاں بھی لاجواب تسلیم کر لیے گئے تھے۔ اور جب وہ اپنے اونٹ پر سوار ہو کر آتیں تو تمام شعرا انکے گرد حلقہ باندھ لیتے اور منتظر رہتے کہ ان کے اشعار سنیں۔ پھر وہ اپنے مرثیے سناتیں۔

نابغہ ذبیانی جو عرب میں سب سے مشہور اور ممتاز شاعر تھا اور بازار عکاظ میں سوائے اسکے کوئی سرخ خیمہ نہیں لگا سکتا تھا کیونکہ یہ وہ عزت تھی جو صرف اُسی شخص کا حق ہوتی تھی جو شاعری میں مسلم الثبوت اُستاد مان لیا جائے۔ اسنے جب خنساءؓ کے مرثیے سُنے تو کہا کہ تو سب سے بہتر شاعر ہے۔

حضرت حسانؓ جو بعد میں دربار نبوت کے شاعر ہوئے نابغہ کے اس فیصلہ سے ناراض ہوئے اُنھوں نے کہا کہ تم نے غلط فیصلہ کیا۔ خنساءؓ سے بہتر میرے اشعار ہیں۔ نابغہ نے خنساءؓ کی طرف اشارہ کر دیا۔ اُنھوں نے حسان سے پوچھا کہ آپ کا سب سے بہتر شعر کونسا ہے اُسکو سنائیے اُنھوں نے سُنایا۔ اس شعر پر فوراً آٹھ اعتراض کر دیئے جن میں سے ایک کا بھی انھوں نے جواب نہ دیا۔ اور بالکل ساکت رہ گئے۔

الغرض شاعری کے لحاظ سے خنساءؓ طبقہ دویم کے شعراء عرب میں سب سے بلند ہیں۔ ان کا دیوان ادیبوں اور شاعروں میں بہت مقبول ہے اور وہ قدیم شاعری کا ایک بیش بہا ہیرا سمجھا جاتا ہے۔

جب اسلام کا ظہور ہوا تو خوش قسمت خنساءؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اسلام لائیں۔ حضور نے انکے اشعار سُنے اور انکی فصاحت و بلاغت کی داد دی۔

خنساءؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں بھی اکثر جا کر بیٹھتی تھیں۔ وہ بھی انکے

اشعار سُنا کرتی تھیں۔

ان کے سر پر بالوں کا ایک سربند پڑا ہوا تھا جو عرب میں سخت غم کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ایسا سربند منع ہے۔ خنساءؓ نے کہا کہ یہ تو مجھے معلوم نہ تھا مگر میں اسکو جو پہنتی ہوں تو اسکا ایک خاص سبب ہے۔ اُنھوں نے دریافت فرمایا۔ کہا کہ بات یہ ہے کہ میرے باپ نے جس شخص کے ساتھ میرا نکاح کر دیا تھا وہ بہت فضول خرچ آدمی تھا۔ اس نے اپنی اور میری تمام دولت صرف کر ڈالی۔ جب میں محتاج ہو گئی تو میرے بھائی صخر نے اپنے مال کے دو حصے کیے ان میں سے اچھا حصہ مجکو دیا۔ میرے شوہر نے تھوڑے ہی عرصہ میں اسکو بھی تلف کر ڈالا۔ پھر صخر نے اپنے باقی مال کے دو حصے کئے اور جو عمدہ تھا منتخب کر کے مجھے دیا۔ اس کی بیوی نے اس سے کہا کہ خنساءؓ کو ایک تو تم آپنا آدھا مال دیتے ہو وہ بھی اچھا چھانٹ کر۔ اُسنے کہا کہ ہاں کیونکہ میری موت کے بعد وہی مجکو یاد رکھے گی۔

سو اُسی کی یادگار میں میں نے اسکو پہنا ہے۔

قادسیہ کی لڑائی جو سنہ ۱۶ھ میں ہوئی جس میں ایرانیوں نے اپنی پوری طاقت سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا اُس میں خنساءؓ مع اپنے چار بیٹوں کے موجود تھیں۔ رات کے وقت اُنھوں نے اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور یہ تقریر کی۔

اے میرے بیٹو! تم اپنی خوشی سے اسلام لائے۔ اور اپنی رضامندی سے تم نے ہجرت کی قسم ہے اُس اللہ کی کہ جسکے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے کہ جس طرح تم اپنے ماں کے شکم سے پیدا ہوئے اُسی طرح تم اپنے باپ کے سچے فرزند ہو۔ تمہارا نسب بے داغ ہے۔ اور تمہارے حسب میں کوئی نقص نہیں ہے۔

تم سمجھ لو کہ عقبے جاودانی کے مقابلہ میں یہ دنیائے فانی ہیچ ہے۔ صبر کرو۔ اور صبر دلاؤ۔ متحد رہو اور اللہ سے ڈرو۔ کیا عجب ہے کہ نجات پاؤ۔

جب تم دیکھو کہ لڑائی جوش پر آئی۔ اور اُس کے شعلے بھڑکنے لگے تو بیچ میں کود پڑو۔ اور بے دریغ تیغ رانی کرو۔ عالم آخرت کی بزرگی اور فضیلت پر کامیاب ہو جاؤ گے۔

صبح کو جب لڑائی شروع ہوئی تو وہ فرماں بردار بیٹے اپنے ماں کے حکم کے مطابق میدان جنگ میں کود پڑے اور سب کے سب درجۂ شہادت پر کامیاب ہوئے۔

غنسا رضؓ نے جب سُنا تو کہا کہ

"اللہ کا شکر ہی کہ ان کو شہادت نصیب ہوئی میں انسے اس مقام پر ملونگی جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سایہ انکے سروں پر ہوگا۔"

حضرت عمر رضؓ نے ان کے بیٹوں کی تنخواہ جو فی کس دو سو درہم سالانہ تھی ان کے نام کر دی۔

غنسا رضؓ نے ۴۱ھ میں چوراسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

حضرت خولہؓ

حضرت خولہؓ کے باپ کا نام ازور تھا۔ وہ صحابہ میں سے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی شہید ہو گئے تھے۔ حضرت خولہؓ اور انکے بھائی ضرارؓ یہ دونوں بھی اپنے باپ کی طرح جام شہادت پینے کے مشتاق تھے۔ اسی غرض کے لیے شام اور مصر کے فتوحات میں یہ دونوں بھائی بہن برابر شریک رہے۔ ان کی بوڑھی ماں مدینہ شریف میں اکیلی رہتی تھیں۔

حضرت خالدؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ ان دونوں کی بڑی قدر کرتے تھے کیونکہ ان میں غیر معمولی جرائت اور بہادری تھی۔ اور تمام فوج کے سپاہیوں میں یہ ہر دلعزیز تھے۔

بھائی اور بہن دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں بہن کی رگوں میں جو خون گردش کرتا ہے اسکا ایک ایک قطرہ بھائی کی محبت میں سرشار رہوتا ہی وہ خون نہیں ہے بلکہ آسمانی پاک محبت کی شراب ہی جو بہن کو ہر وقت بھائی کی محبت کے نشہ میں رکھتی ہی۔ بہن کو بھائی کی کسقدر محبت ہوتی ہی اسکا اندازہ صرف بہنیں ہی کر سکتی ہیں بھائی نہیں کر سکتے بہنوں کا خون لطیف اور نازک ہوتا ہی۔ محبت اس کی ایک ایک ذرہ میں سمائی ہوتی ہی۔ لیکن بھائی کے خون میں مردانگی ہی وہ سخت ہوتا ہی وہ بہن کی محبت میں اتنا نہیں پگھلتا جتنا بہن کا خون بھائی کی محبت میں۔

لیکن بہادر انسان کی خاص صفت یہ بھی ہی کہ رقت اور محبت کا اسکے دل میں زیادہ مادہ ہوتا ہی۔ چنانچہ حضرت خولہؓ جسقدر حضرت ضرارؓ کو عزیز رکھتی تھیں حضرت ضرارؓ اس سے کم ان کو نہیں سمجھتے تھے۔ یہ بھی اتفاقات کے عجائبات میں سے ہے کہ شام اور مصر کی فتوحات میں یہ دونوں بھائی بہن جا بجا کافروں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوا کیے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کو جب تک چھڑا نہ لیتا اسکو چین نہ آتا تھا۔ اس موقع پر ہم ان کی چند گرفتاریوں کا حال لکھتے ہیں۔

سنہ ۱۹ھ میں مسلمانوں کا لشکر دمشق کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ ناگہاں یہ خبر آئی کہ اجنادین میں کافروں کا بڑا مجمع ہو رہا ہے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ سے کہا کہ آپ ضرارؓ کو ان کے مقابلہ کے لیے بھیجیے۔ انھوں نے اس رائے کو پسند کیا اور پانچہزار سوار ضرارؓ کو دیکر اس طرف روانہ کیا۔ ابھی یہ لوگ پہونچنے بھی نہ پائے تھے کہ راستے میں حمص کے بادشاہ وردان سے مقابلہ ہو گیا جو بارہ ہزار فوج لیے ہوئے اجنادس کو جا رہا تھا۔ ضرار نے بڑی بہادری سے حملہ کیا یہانتک کہ فوج کے اندر گھس گئے۔ وردان کا بیٹا ہمدان بھی اس فوج میں

سردار تھا اس نے ضرارؓ کو ایک نیزہ مارا جس سے ان کا بازو زخمی ہوا انھوں نے لپک کر اسکے سینہ میں نیزہ جڑا۔ جو پار ہوکر اس کی پیٹھ کی ہڈی سے گذر گیا۔ جب نیزہ کھینچا تو اسکا پھل اس کی ہڈی میں پھنسا رہ گیا۔ کفار کو موقع ملا چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور ضرارؓ کو گرفتار کرلیا۔

مسلمان سپاہی باوجود اپنے سردار کی گرفتاری کے نہایت ثابت قدمی سے لڑتے رہے۔ ایک تیز رفتار سوار نے ضرارؓ کی گرفتاری کی خبر حضرت خالدؓ کو پہونچائی۔ اُنھوں نے حضرت ابو عبیدہؓ سے اجازت لیکر ایک ہزار سواروں کو اپنے ساتھ لیا۔ اور باگ چھوڑ دی۔

خالدؓ تیزی سے ایک ہزار سواروں کے ساتھ چلے جا رہے تھے کہ یکایک اُنھوں نے دیکھا کہ فوج کے آگے آگے ایک نہایت تیز رفتار سوار جا رہا ہے جو ڈھاٹا باندھے ہوئے ہے اور ہاتھ میں ایک لمبا نیزہ لیے ہوئے ہے اس کے بدن پر سیاہ لباس ہے اور سوائے آنکھوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔

حضرت خالدؓ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون سوار ہے لیکن کسی نے کچھ نہ بتایا آخر اُنھوں نے گھوڑے کو تیزی سے اس کی طرف بڑھایا۔ اور تمام لوگوں نے اپنے گھوڑے تیز کیے تاکہ معلوم کریں کہ کون شخص ہے لیکن وہ آگے نکل گیا یہانتک کہ معرکہ میں پہونچ کر اس نے کافروں پر بیدریغ حملہ کیا۔ وہ رومیوں کی جماعت میں گھس جاتا تھا اور پھر بجلی کی طرح نکل آتا تھا۔ پھر حملہ کرتا تھا اور پھر باہر آتا تھا یہانتک کہ کفار کے خون سے اسکا نیزہ سرخ ہو گیا۔ اور کئی رومیوں کو اُس نے پست کردیا پھر وہ قلب کی طرف بڑھا اور رومیوں کی فوج کو چیرتا ہوا بیچ میں پہونچا اور کئی کافروں کو قتل کیا۔ اتنے میں حضرت خالدؓ بھی پہونچ گئے۔ اور اُنھوں نے بھی کافروں پر حملہ کیا رومیوں نے بڑی بہادری سے انکے حملہ کو روکا دوپہر تک لڑتے رہے لیکن آخر کار شکست کھاکر بھاگے

اُن کا زیادہ حصہ قتل ہو گیا۔

لڑائی کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ وہ سوار خون میں بالکل ڈوبا ہوا ہی۔ چاروں طرف سے مسلمانوں نے تحسین کی۔ حضرت رافع رضؓ نے خالد رضؓ سے کہا کہ میں تو حیران ہوں کہ یہ کون سوار ہے ایسا بہادر سوار کم دیکھنے میں آیا۔ حضرت خالد رضؓ نے کہا علیٰ ہذا میں بھی حیرت میں ہوں ذرا دریافت کرو کہ یہ کون ہی۔ ایک شخص نے بڑھ کر دریافت کیا لیکن اس سوار نے مُنہ پھیر لیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے کہا کہ اے بہادر شہسوار امیر تیرا نام دریافت کرنا چاہتا ہی اور تو موںھ پھیرتا ہے۔ یہ دیکھ حضرت خالد رضؓ خود آگے بڑھے اور پوچھا۔ تو اُس نے کہا کہ اے امیر! میں نے اسی وجہ سے مونھ پھیرا کہ مجھے شرم آئی کیونکہ میں عورت ہوں اور آپ سب لوگ مرد ہیں۔ میں ازور کی بیٹی ہوں۔ اپنے بھائی کے قید ہو جانے کی خبر سُنکر تاب نہ لاسکی اور اُس کو چھڑانے کے لیے چلی آئی۔

خولہ رضؓ نے ایک ایک مسلمان سے پوچھا کہ کہیں ضرار کو بھی تم نے دیکھا لیکن کسی سے کچھ پتہ نہ معلوم ہوا۔ تب ان کے دل کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اور انھوں نے رونا شروع کیا۔

"اے میرے بھائی! کاش مجھے معلوم ہوتا کہ کس میدان میں کافروں نے تجکو پھینکا اُنھوں نے تجھے نیزے سے مارا۔ یا تلوار سے قتل کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے میرے بھائی تیری بہن تیرے اوپر قربان۔ اگر میں تجھے دیکھ پاتی تو کافروں کے ہاتھ سے خود چھڑاتی۔ کیا خبر ہی کہ میں اب پھر تیرا دیدار دیکھونگی یا نہیں۔ یا تو اپنے باپ کے پاس پہونچا جسنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شہادت کا جام پیا تھا۔ اگر ایسا ہو تو میری طرف سے تجھ پر ہزار ہزار سلام ہوں۔

ان کا یہ نوحہ سُنکر تمام لوگ حتیٰ کہ حضرت خالد رضؓ بھی روئے۔ اتنے میں ایک چھوٹا سا

دستہ رومیوں کا پہاڑ کے دامن میں نمودار ہوا۔ مسلمانوں نے فوراً تیار ہو کر ان پر حملہ کیا۔ انھوں نے دیکھتے ہی تلواریں اور نیزے اپنے ہاتھوں سے پھینک دیئے اور اماں مانگی۔ حضرت خالد نے ان کو اماں دی اور پوچھا کہ تم کون لوگ ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم حمص کے باشندے ہیں وردان کے ساتھ تمہارے مقابلہ کے لیے آئے تھے لیکن یہاں آکر ہم کو معلوم ہو گیا کہ وہ تم سے نہیں لڑ سکتا اس لیے ہم اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہیں۔ حضرت خالد رضؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم کو ہمارے بھائی کی کچھ خبر ہے۔ جسنے وردان کے بیٹے کو ہلاک کیا تھا اور جسکو اس نے گرفتار کر لیا۔ انھوں نے کہا کہ وہی جو بلا زرہ پہنے ہوئے لڑتا تھا حضرت خالد رضؓ نے کہا کہ ہاں۔ انھوں نے کہا کہ وردان نے اسکو سو سواروں کی حراست میں قید کر کے حمص کی طرف روانہ کیا ہے۔ تاکہ وہاں سے ہرقل بادشاہ روم کے پاس بھیجا جائے۔

حضرت خالد کو یہ سنکر خوشی ہوئی۔ انھوں نے فوراً حضرت رافع کو حکم دیا کہ سو سوار لیکر حمص کے راستہ کی طرف جاؤ اور دشمنوں کے نشان قدم سے ان کا پتہ لگا کر ضرار کو چھڑا لاؤ۔

رافع رضؓ نے اسی وقت سو سوار منتخب کیے اور لیکر روانہ ہو گئے۔ حضرت خولہؓ کو جب یہ خبر ملی تو خوشی سے ان کا چہرہ دمک اٹھا گھوڑے پر سوار ہو کر ساتھ ہو لیں۔

حضرت رافع اس دستہ فوج کو لیکر بہت دور نکل گئے۔ دشمنوں کے نقش قدم کا ہر چند انھوں نے کھوج لگایا لیکن پتہ نہ چلا دور تک تلاش کرتے ہوئے چلے گئے۔ بالآخر انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ ابھی یہاں تک نہیں آئے ہیں اسلیے مناسب ہے کہ ہم لوگ گھات میں چھپ کر بیٹھ رہیں اور انکے آنے کا انتظار کریں۔

انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ یہانتک کہ مسلمانوں کو خیال گزرنے لگا

کہ ہم نے وقت کو رائیگاں کھویا کہ اتنے میں کچھ سوار آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جب قریب آگئے تو معلوم ہوا کہ یہ وہی سو سوار ہیں جو ضرار رضی اللہ عنہ کو لیے جا رہے ہیں۔ جب ٹھیک موقع پر آئے تو یکایک حضرت رافع نے حملہ کیا۔ تکبیر کا نعرہ سنتے ہی کافروں کے ہوش اڑ گئے۔ حضرت ضرار چھڑا لیے گئے۔ اور کافر ایک ایک کر کے مارے گئے۔

دمشق ہی کے محاصرہ میں یہ خبر آئی کہ اجنادین میں نوّے ہزار عیسائی فوج مسلمانوں سے لڑنے کے لیے جمع ہوئی ہے۔ حضرت ابو عبیدہ نے تمام فوج کو اجنادین کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ حضرت خالد کو فوج کے ہمراہ روانہ کیا۔ اور عورتوں اور بچوں سامان وغیرہ کو پیچھے سے خود ایک ہزار سواروں کی حفاظت میں لیکر روانہ ہوئے۔ ابھی ایک منزل آئے تھے کہ والی دمشق نے موقع پا کر چھ ہزار سوار لیکر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ پر شہر سے نکل کر حملہ کر دیا۔ سخت لڑائی ہوئی۔ عربی عورتیں جان توڑ کر لڑیں لیکن کفار کی تعداد بہت تھی۔ بہت سی مسلمان عورتیں گرفتار ہو گئیں منجملہ ان کے حضرت خولہ بھی تھیں۔

ایک تیز رفتار سوار خالد کے پاس پہونچا۔ اور چلایا کہ کفار نے عربی حرم پر چھاپا مارا اور یہی جمعیت سے آئے ہیں کہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو مقابلہ کی طاقت نہیں معلوم ہوتی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جو بات ہونے والی ہوتی ہے ہو کر رہتی ہے میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے کہتا تھا کہ آپ فوج لیکر چلیں اور ساقہ پر مجھے چھوڑیں لیکن انھوں نے نہ مانا۔ فوراً دو ہزار سوار اُن کی امداد کے لیے روانہ کیے اور ایک ہزار اپنے ہمراہ لیکر پیچھے سے چلے۔ کفار ان کو دیکھتے ہی بھاگے لیکن ان کا سردار بولص اور بہت سے عیسائی گرفتار کر لیے گئے۔

حضرت ضرار رضی اللہ عنہ نے جب یہ سُنا کہ کفار جن عورتوں کو قید کر لیے گئے ہیں ان میں

ان کی بہن خولہؓ بھی ہیں تو رنج سے بیقرار ہو کر رونے لگے۔ حضرت خالدؓ نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ انکے بہت سے ہزاروں کو تم نے گرفتار کیا ہے انکے عوض میں ہم اپنے قیدیوں کو چھڑا لینگے۔ تمام سپاہ کو مع حضرت ابو عبیدہؓ کے اُنھوں نے فوج کی طرف روانہ کیا اور خود ایک ہزار سوار لیکر اپنے قیدیوں کو چھڑانے چلے۔ ان ہزار سواروں میں حضرت رافعؓ اور ضرارؓ بھی تھے۔

ادہر بولص کا بھائی پیٹر جب مسلمان عورتوں کو قید کر کے لے گیا تو وہ ایک ندی کے کنارے فروکش ہوا۔ باقی ماندہ سپاہ اسکے ساتھ تھی اُس نے کہا کہ جبتک میرے بھائی کی کوئی خبر نہ معلوم ہو اسوقت تک یہیں ٹھہرو تاکہ اسکا کچھ سراغ لگا کر اسکے چھڑانیکی کوئی تدبیر کریں۔

اس نے مسلمان عورتوں کو ایک محفوظ خیمہ میں بند کیا۔ یہ عورتیں اکثر بوڑھیاں تھیں لیکن سواری اور جنگ میں ماہر تھیں اُنھوں نے آپس میں گفتگو شروع کی کہ اب کس تدبیر سے ہم کو نجات مل سکتی ہے۔ حضرت خولہ جو نوعمر اور پُرجوش تھیں بولیں کہ اے تبابعہ اور عمالقہ (عرب کے دو پُرانے شاہی خاندان) کی بیٹیو! کیا تم پسند کرتی ہو کہ ان کافروں کے بس میں ہو کر رہو اور تمہاری اولاد ان کی غلام بنے۔ کیا تم اس ذلت کو برداشت کرو گی کہ عرب کے قبائل تمہاری اس رسوائی کا چرچا کریں۔ کہاں ہے تمہاری آبائی شجاعت! کدہر ہے تمہاری خاندانی شہامت! تمہارے اسلاف ہمیشہ موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیتے رہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ تم سب بھی اس رسوائی کے بدلے مرنا قبول کرو گی۔ حضرت خولہ کی یہ تقریر سُنکر ایک صحابیہ نے کہا کہ اے خولہ بیشک ہم ایسے ہی ہیں۔ اور بارہا ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ہماری رگوں میں بھی وہی خون ہے جو ہمارے اسلاف کی رگوں میں تھا۔ سخت سے سخت جنگوں میں اپنی شجاعت اور شہامت ہم دکھلا چکے ہیں۔ مگر اس موقع پر جبکہ تلوار ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے کیا کر سکتے ہیں۔

حضرت خولہ رضؓ نے کہا کہ تلوار نہ ہو تو نہ سہی۔ خیمہ کی چوبیں نکال لو۔ میخیں اکھیڑ لو اور ان کو لیکر غارت گروں پر حملہ کیا۔

سب عورتوں نے ایسا ہی کیا۔ اور غول بندی کر کے ایک دائرہ بنا لیا حضرت خولہ ان کی سردار تھیں۔ اُنھوں نے کہا کہ سب ایک سے ایک ملی رہو۔ الگ نہو۔ مقابلہ کرنیوالوں کی تلواروں اور نیزوں کو توڑ ڈالو۔

اسی شکل سے یہ غول باہر نکلا۔ وہاں ایک آدمی کھڑا تھا۔ پہلے اسی پر ایک صحابیہ نے ایک چوب ماری جس سے اسکا سر پھٹ گیا اور وہیں مر گیا۔ دیکھتے ہی چاروں طرف سے رومی دوڑے۔ پیٹر کو بھی خبر ہوئی۔ بھاگا ہوا آیا۔ عورتوں کو اس طرح دیکھ کر ہنسا اور پوچھا کہ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم رسوائی اور بدنامی کی زندگی سے بچنے کے لیے تم سے لڑینگے۔ مرجائینگے لیکن تمہارے ہاتھوں میں قیدی بن کر نہ رہیں گے۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ عورتوں کو پکڑ لو۔ ان پر تلوار نہ اُٹھاؤ بلکہ زندہ گرفتار کرو۔ سپاہی چاروں طرف سے لپکے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان شیر دل عورتوں نے کئی کافروں کو جان سے مار ڈالا۔ تب پیٹر کو غصہ آیا وہ اپنے گھوڑے پر سے کود پڑا۔ اور سپاہیوں کو للکارا کہ اب تلوار اُٹھاؤ اور ان کو قتل کرو یہ سُنتے ہی رومی تلواریں کھینچ کھینچ کر آگے بڑھے۔

یہ وقت ان عورتوں کی سخت مایوسی کا تھا۔ وہ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو چکی تھیں مگر اللہ تعالیٰ بڑا مسبب الاسباب ہے رومیوں کے حملہ کرتے ہی پہاڑ کے درہ سے حضرت خالدؓ۔ اور ضرارؓ مع ایک ہزار سواروں کے نمودار ہو گئے۔ حضرت خولہ نے للکار کر کہا کہ اے ایمان والیو! شریفوں کی موت مرو۔ اور کمینوں کی طرح عاجز و خوار نہو۔ دیکھو وہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے لیے آ رہی ہے۔ میرے بھائی اور رسول پاکؐ کے صحابہ ہم کو چھڑانے آتے ہیں عورتیں اس امداد غیبی کو دیکھ کر خوشی کے مارے اُچھل پڑیں۔ کفار دہشت زدہ ہو گئے اور بھاگنے لگے۔

پیٹر بھی اپنے گھوڑے پہ بیٹھنے کے لیے لپکا۔ اور عورتوں سے بولا کہ جاؤ تم سب کو میں نے صلیب کے صدقے میں آزاد کر دیا۔

ابھی وہ گھوڑے پر بھی نہیں بیٹھ چکا تھا کہ حضرت ضرار وہاں پہونچ گئے۔ پیٹر نے بھاگتے ہوئے کہا کہ یہ عورتیں میں نے تم کو بخشیں۔ انھوں نے تیزی سے اسکی طرف گھوڑا بڑھایا اور کہا کہ اسکا کچھ شکریہ بھی لیتے جائیے۔ یکایک پیٹر کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی وہ گرنے لگا کہ اتنے میں حضرت ضرار نے اسکے کوٹھے میں ایک نیزہ جڑا جو پار نکل گیا۔ انھوں نے اسکا سر کاٹ کر نیزہ پر رکھ لیا۔ جسقدر کافر ملے مارے گئے اور عورتیں چھڑائی گئیں۔ پھر فوج اجنادین کو روانہ ہوئی۔

جنگ یرموک سب سے بڑا معرکہ ہوا ہے۔ اس میں تمام عیسائی طاقت تقریباً چھ لاکھ فوج جمع ہوئی تھی۔ اسکا افسر اعلیٰ ماہان تھا۔ اسلامی فوج چالیس و پچاس ہزار کے درمیان تھی۔ اسکے امیر حضرت ابو عبیدہ تھے۔ پہلے مقابلہ میں حضرت خالدؓ نے تھوڑے سے مسلمان لیکر ساٹھ ہزار عیسائیوں کو شکست دی۔ لیکن ان منتخب مسلمانوں میں سے پانچ آدمی گرفتار ہو گئے۔ جن میں حضرت ضرار بھی تھے۔ حضرت خولہ اس رنج سے بیقرار ہو گئیں۔ بھائی اور کیسا بھائی۔ دن بھر اسی کی فکر۔ رات بھر اسی کی رہائی کی دعا۔ طے کر لیا کہ میں بھی اسی معرکہ میں انشاء اللہ جام شہادت پیونگی۔

اتفاق سے حضرت خالد کو ماہان نے صلح کی گفتگو کرنے کو بلا بھیجا۔ وہ سو سواروں کو اپنے ہمراہ لیکر تشریف لے گئے۔ اس نے بڑا عالیشان دربار سجا رکھا تھا کہ عربوں پر رعب غالب ہو۔ لیکن صحابہ کی نگاہ میں دنیا کی کیا ہستی تھی جو اس کر و فر کو وہ خاطر میں لاتے۔ بہت عرصہ تک گفتگو رہی لیکن صلح کی صورت نہیں پیدا ہوئی ماہان نے جھنجلا کر کہا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ ہے۔ حضرت خالد کو اس کا

جھنجلانا ناگوار ہوا انھوں نے کہا کہ تم ہم سے زیادہ میدان جنگ کے شائق نہیں ہو۔ وہ وقت میری نگاہوں کے سامنے ہے جبکہ تیرے گلے میں رسی باندھکر میں حضرت عمرؓ کے سامنے لیجاؤنگا اور وہاں تیرا سر اُڑایا جائیگا۔

یہ سُنکر ماہان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اسکے درباری منتظر تھے کہ اگر ہم کو حکم دے تو ہم خالدؓ کو قتل کر ڈالیں۔ ماہان نے نہایت جوش میں آکر کہا کہ ابھی ان پانچ قیدیوں کو منگا کر میں تمہارے سامنے ان کی گردن اُڑاتا ہوں تاکہ تمہیں اپنی ہستی معلوم ہو جائے۔

حضرت خالد نے بگڑ کر کہا کہ تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ تیری کیا مجال ہے جو کسی مسلمان کا ایک قطرہ خون بھی تو بہا سکے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے اور انکے تمام ساتھیوں نے تلوار کھینچی۔ اور کہا کہ ابھی ہم تجکو اور تیرے درباریوں کو تہ تیغ کر ڈالیں گے۔

حضرت خالد کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ماہان دل میں ڈر گیا۔ ہاتھ اُٹھا کر کہا کہ اے خالد ٹھہرو۔ یہ سب باتیں تم نے اسلیے کہیں کہ تم سفیر ہو اور جانتے ہو کہ سفیر قتل نہیں کیا جاتا۔ اچھا اب تم اپنے لشکر میں جاؤ جسکو اللہ چاہے گا فتح دیگا۔

یہ نرم جواب سُنکر حضرت خالد نے تلوار میان میں رکھ لی۔ اور پوچھا کہ ان پانچ قیدیوں کی بابت کیا کہتے ہو۔ ماہان نے کہا کہ میں نے آپ کی خاطر سے ان کو رہا کیا آپ اپنے ساتھ لیجائیے۔ حضرت خالدؓ ان کو اپنے ساتھ لائے۔ خولہؓ اپنے بھائی کو دیکھکر بہت خوش ہوئیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

یرموک کی لڑائی میں مسلمان عورتیں اسلامی فوج کے پس پشت ایک ٹیلہ پر تھیں کفار کی کثرت سے کبھی مسلمانوں کا میمنہ شکست کھاتا تھا۔ کبھی میسرہ۔ اس طوفان

اور شورش میں مسلمان بعض وقت شکست کھا کر بھاگ نکلتے تھے۔ عورتیں ٹیلہ پر سے اُتر کر اُن کو روکتی تھیں۔ اور جبراً دشمنوں کی طرف پلٹاتی تھیں۔ کئی ہفتہ تک یہ لڑائی جاری رہی اور روزانہ اس قسم کی کیفیتیں پیش آتی تھیں۔ بعض وقت کفار دھکاپیل کرتے ہوئے ٹیلے تک پہونچ جاتے تھے تو مسلمان عورتیں دست بدست ان سے جنگ کرتی تھیں۔ ایک دن نہایت سخت معرکہ ہوا۔ کافر بڑھتے بڑھتے اس ٹیلے تک پہونچ گئے۔ عورتوں نے انسے لڑنا شروع کیا لخم اور خدام کی عورتوں نے شکست کھائی اور بھاگ نکلیں۔ حضرت خولہؓ نے ان کو ڈنڈوں سے مارنا شروع کیا اور کہا کہ تم ہماری جماعت سے نکلجاؤ تم ہم کو بزدل اور کمزور بناتی ہو۔ آخران بیچاریوں نے قسم کھائی کہ اچھا اب ہم مرجائینگے لیکن نہ ٹلیں گے۔

حضرت خولہ نے ایک رومی کافر پر وار کیا۔ لیکن اس کی تلوار انکے سر پر پڑی۔ اور یہ زخمی ہوکر گر پڑیں۔ تمام جسم خون سے شرابور ہوگیا۔ حضرت عفرہ نے اس کافر کو قتل کیا اور ان کو اُٹھا کر خیمہ میں لیگئیں۔ پانی پلایا آنکھیں کُھلیں تو پوچھا کہ کیسا حال ہے کہا کہ اللہ کا شکر ہے لیکن بچتی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔ کیا میرے بھائی ضرار کی تم کو خبر ہے اُنھوں نے کہا کہ میں نے کئی روز سے ان کی کوئی خبر نہیں پائی۔ حضرت خولہ نے رو کر دعا کی کہ اے اللہ میرے بھائی کو اسلام کی خدمت کے لیے محفوظ رکھنا میں اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔

حضرت عفرہ کہتی ہیں کہ خولہ کو اسی حال میں چھوڑ کر میں پھر لڑنے کے لیے نکلی رات کو جب مسلمان تھک کر آئے تو میں نے دیکھا کہ خولہ مشک لادے ہوئے ان کو پانی پلاتی پھرتی ہیں گویا کبھی ان کو کوئی زخم ہی نہیں لگا تھا۔ اتنے میں حضرت ضرار بھی آگئے پوچھا کہ کیا گذری۔ انھوں نے کہا کہ خیر گذری۔ ایک کافر نے مجھے تلوار ماری عفرہ نے اس کی گردن کاٹ لی۔ حضرت ضرار نے کہا کہ تجھے خوشخبری ہو کہ یہ تیرے لیے

ذخیرہ ہے جنت کا۔

انطاکیہ میں سخت گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ایک ایک ہزار فوج کا دستہ ایک ایک مسلمان سردار کے پاس تھا۔ حضرت ضرار بھی ایک دستہ کے امیر تھے خولہ کو کسی نے خبر پہونچائی کہ ضرار شہید ہو گئے۔ فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر مردانہ لباس پہن کر رن میں کود پڑیں۔ اتفاق سے لڑتے لڑتے وہاں پہونچ گئیں جہاں حضرت ضرار تھے۔ ان کو زندہ دیکھ کر خوش ہو کر ان کی طرف لپکیں اور کچھ بات کرنی چاہی انھوں نے بھی ان کو پہچانا۔ اور کہا کہ اے خولہ یہ وقت بات چیت کا نہیں ہے بلکہ کام کا ہے۔ اپنے گھوڑے کی باگ میرے گھوڑے سے ملاؤ۔ اور اپنا نیزہ میرے نیزے کے برابر رکھو۔ اگر ہم میں سے کوئی قتل ہوا تو حشر میں حوض کوثر پر ملاقات ہوگی تھوڑی دیر کے بعد مشرکوں نے شکست کھائی۔

ملک شام فتح ہو چکا ہے۔ حضرت ابو عبیدہ اردن کے قریب خیمہ زن ہیں عمرو بن العاصؓ اور خالدؓ وغیرہ مصر کی فتح میں مشغول ہیں۔ حضرت ضرار بیمار ہیں ان کی بہن خولہ ان کی تیمار داری میں مشغول ہیں۔ وہ رملہ کے ساحل پر جہاں گھاس چارہ بہت تھا دو ہزار فوج کے ساتھ پڑے ہوئے تھے تاکہ گھوڑے اور فوج پھر تازہ دم ہو جائیں۔

اسکندریہ کی چند جنگی کشتیاں اتفاقاً ایک رات ادھر آنکلیں۔ انھوں نے دیکھا کہ جا بجا آگ روشن ہے اور ملاحوں کے ذریعہ سے معلوم کیا کہ یہاں مسلمانوں کی ایک جماعت ٹھہری ہوئی ہے تو انھوں نے اچانک چھاپا مارا۔ کچھ مسلمان مقتول ہوئے باقی ماندہ ڈیڑھ ہزار کو انھوں نے قید کر کے کشتیوں پر لاد لیا۔ انھیں قیدیوں میں یہ

دونوں بھائی بہن تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ ضرار کی عیادت کو آئے تھے وہ کسی صورت سے بچ نکلے اور آکر حضرت ابوعبیدہ سالار فوج کو خبر کی۔ ان کو بڑا رنج ہوا۔ خاصکر ضرار اور خولہ کے قید ہونے کا۔ کیونکہ شجاعت کی وجہ سے یہ دونوں تمام فوج میں ہر دلعزیز تھے انھوں نے فوراً حضرت عمرو بن العاص کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور لکھا کہ جس طرح ہو ان قیدیوں کو چھڑانے کی کوشش کرو۔ عمرو بن العاص اور خالد کو ضرار اور ان کی بہن کے قید ہونے کا بڑا غم ہوا۔ انھوں نے فوراً خبر کے لیے اسکندریہ میں جاسوس روانہ کیے۔

ادہر یہ سب قیدی اسکندریہ میں لیجاکر مقوقس کے بیٹے کے سامنے پیش کر دیے گئے۔ اس نے حکم دیا کہ سب کو قتل کر ڈالو۔ مگر بعض مشیروں نے یہ مشورہ دیا کہ ان کا قتل کرنا مناسب نہیں ہے۔ اسلیے کہ اسوقت ہم میں اور عربوں میں لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارے آدمی بھی انکے ہاتھ میں گرفتار ہو جائیں اُسوقت ہم ان قیدیوں کو دیکر انکے عوض میں اپنے قیدی چھڑالیں گے اسکو بادشاہ نے پسند کیا اور یہ قرار پایا کہ یہ قیدی دیر زجاج میں جو اسکندریہ سے دو منزل کے فاصلہ پہ ہے رکھے جائیں دوسرے دن دو ہزار فوج کی حراست میں وہ دیر زجاج کو روانہ کیے گئے۔ یہ سب خبریں حضرت خالد کو پہونچیں۔ وہ پہلے ہی سے اس مقام پر پہونچ گئے۔ جسوقت تھکے ماندے سپاہی قیدیوں کو لیکر وہاں پہونچے اسوقت ان پر حملہ کر دیا۔ سات سو قتل اور تیرہ سو گرفتار ہوئے۔ حضرت خولہ ضرار اور تمام مسلمان قیدی رہا ہوئے۔

معرکہ بھنسا میں حضرت ضرار دو سو سوار لیے آرہے تھے کہ اچانک کفار کی دو ہزار

کی جماعت نے ان پر حملہ کیا خوب لڑائی ہوئی۔ لیکن حضرت ضرار کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ وہ گرے۔ کفار نے موقع پاکر ان کو گرفتار کر لیا۔ اور لے چلے حضرت سالم اس معرکہ سے بچ کر نکل بھاگے۔ اور ضرار کی گرفتاری کی خبر اسلامی فوج میں پہونچائی۔ فوراً حضرت رافع وغیرہ دو ہزار سوار لیکر ان کے تعاقب میں چلے حضرت خولہ بھی عربی گھوڑے پر مسلح جا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں ان پر آن ٹوٹے اور حضرت ضرار چھڑا لیے گئے۔ کافر بھاگ چلے۔ لیکن ان کی بد قسمتی سے ادہر سے بھی ایک دستہ اسلامی فوج کا آرہا تھا۔ وہ بیچ میں پڑ گئے اور سب کے سب وہیں مارے گئے۔

ام الخیر رابعہ بصریہؒ

یہ نام تقویٰ اور پرہیزگاری میں اُسقدر مشہور ہے جتنا رستم کا نام بہادری میں یا حاتم کا سخاوت میں۔

رابعہؒ عربی میں چوتھی کو کہتے ہیں چونکہ حضرت رابعہؒ اپنے باپ کی چوتھی بیٹی تھیں اسلیے یہی ان کا نام رکھدیا گیا۔ ان کے والد کا نام اسمٰعیل ہے جو قبیلہ عدوی سے تھے۔ ان کی سکونت بصرہ میں تھی۔

حضرت رابعہؒ کو زہد اور عبادت کی طرف فطرتی لگاؤ تھا۔ اور جب اُنھوں نے قرآن۔ تفسیر اور حدیث کی تعلیم حاصل کی تو بالکل اسی کی ہو رہیں۔ دن رات ریاضت اور عبادت ان کا شغل تھا۔ اسی وجہ سے ان کو ام الخیر کہنے لگے

علامہ ابن الجوزی لکھتے ہیں کہ عبدہ جو بڑی نیک اور عالمہ عورت گذری ہیں اور حضرت رابعہؒ کی خادمہ تھیں بیان کرتی ہیں کہ رابعہؒ کا یہ قاعدہ تھا

کہ رات بھر عبادت کرتی تھیں۔ بعد نماز فجر کے تھوڑی دیر کے لیے مصلے ہی پر سو جاتی تھیں۔ جب صبح ہوتی تو اُٹھتی تھیں اور نفس کو ملامت کرتی ہوئی پھر عبادت میں مشغول ہو جاتی تھیں۔

بڑے بڑے علمأ اور صلحأ انہیں کے یہاں آکر عبادت کرتے تھے اور اسکو خیر و برکت کا سبب سمجھتے تھے۔ ان کا لقب تاج الرجال تھا۔

ایک بار رات بھر عبادت ہوئی۔ ذوق و شوق کے ساتھ دعائیں مانگی گئیں جب تہجد کا وقت ہوا تو ابو سلیمان دارانی نے جو ایک مشہور ولی گذرے ہیں فرمایا کہ ایسے معبود کا کس طرح شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ جسنے رات بھر عبادت کرنے کی ہم کو قوت اور توفیق عطا فرمائی۔ حضرت رابعہؒ نے کہا کہ ایسے معبود کا شکریہ یہ ہی کہ آج دن کا اسکے لیے روزہ رکھیں۔

زہد و تصوف میں انکا وہی مرتبہ تھا جو امام حسن بصریؒ کا تھا۔ امام سفیان ثوریؒ جو بڑے مشہور بزرگ اور اعلیٰ پایہ کے محدث تھے اکثر حضرت رابعہؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اور ان کی زبان فیض ترجمان سے باتیں سُنکر روح کو خوش اور تازہ کرتے۔ حالانکہ اُس زمانہ کے تمام علما، و فضلا اور ادنیٰ سے لیکر بادشاہ تک سب امام سفیان ثوری کے سامنے زانوے ادب تہ کرتے تھے اور ان سے شرعی مسائل اور تصوف کی باریکیاں پوچھتے تھے۔ مگر باوجود اسکے امام سفیان ثوری کو جب مہلت ملتی تو رابعہ کے جھونپڑے میں پہونچتے۔ اور ان کی مجلس سے فیض حاصل کرتے۔ اس سے حضرت رابعہؓ کے علم و فضل اور زہد کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جعفر ایک مرتبہ انکے یہاں گیا تو دیکھا کہ وہ عبادت میں مشغول ہیں اور امام سفیان ثوری بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب وہ عبادت سے فارغ ہوئیں تو جعفر

نے نہایت تعجب سے کہا کہ مسلمانوں کا پیشوا اور امام بیٹھا ہوا ہی اور تم کو اس کی طرف مطلق توجہ نہیں۔ رابعہؒ نے کہا کہ میں اللہ کی طرف متوجہ تھی۔ اور جب کوئی بندہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہی تو اللہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوتا ہی۔ تو کچھ شک نہیں کہ وہ میری طرف متوجہ تھا۔ ایسی حالت میں کسی مخلوق کی طرف کیوں توجہ کرنے لگی۔

جعفر کے پاس امام ثوری بیٹھے ہوئے تھے یکایک اٹھے اور اسکا ہاتھ پکڑ کے کہا کہ مجکو اس ناصحہ مشفقہ کے پاس لیچلو کہ جس کی مجلس سے جب جدا ہوتا ہوں تو میرے دل کو چین نہیں آتا۔ جعفر نے کہا کہ کون؟ فرمایا کہ رابعہ جب اُنکے یہاں پہونچے تو امام ثوری نے دعا مانگی کہ یا اللہ میں تجھ سے سلامتی کا طالب ہوں حضرت رابعہؒ یہ سُنکر بہت روئیں۔ امام ثوری نے رونے کا سبب پوچھا انھوں نے کہا کہ تمہاری اس دعا نے مجکو رلایا۔ تم اللہ سے سلامتی چاہتی ہو اور سلامتی نام ہی ترک دنیا کا۔ جس میں تم آلودہ ہوئے ہو۔ انسان پر بہت افسوس آتا ہی کہ وہ اپنی حالت کو نہیں سنبھالتا نہ خود کوئی کوشش کرنا چاہتا۔ صرف دعا پر بھروسہ رکھتا ہے۔

صحیح چاہتے ہو

ایک مرتبہ امام سفیان ثوری نے پوچھا کہ آپکے ایمان کی کیا کیفیت ہے۔ فرمایا کہ میں نے اللہ کو نہ جنت کی امید پر پوجا ہی۔ نہ دوزخ کے خوف سے بلکہ محض محبت اور شوق سے۔ پھر انھوں نے چند شعر معرفت کے پڑھے جو خود انھیں کے تھے وہ معرفت کے اشعار نہایت عمدہ کہتی تھیں۔ شیخ شہاب الدین سہروردی نے انکے اشعار نقل کیے ہیں۔ اور تعریف کی ہی۔ اور شیخ عبدالقادر جیلانی نے بھی انکے اقوال لکھے ہیں اور مدح کی ہی۔

زہد و عبادت کے ساتھ ان کو ابتدا ہی سے کچھ ایسا شغف ہو گیا تھا کہ

نکاح نہیں کیا۔ کسی نے ایک مرتبہ پوچھا تو فرمایا کہ نکاح کسی وجود پر ہوتا ہی۔ یہاں ہم اپنی ہستی ہی مٹا چکے۔

عبدالواحد ابن زید ایک متمول شخص نے انکے زہد و علمیت کا شہرہ سنکر نکاح کا پیغام بھیجا۔ اُنھوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ اے سیاہ دل تو اپنے لیے اپنی ہی جیسی کوئی سیاہ دل عورت تلاش کر لے جس کے دل میں اللہ کے علاوہ کچھ تیری محبت کی بھی گنجایش نکل سکے۔

بروایں دام برمرغِ دگر نہ — کہ عنقا را بلند ہست آشیانہ

دراصل ایسی تارک الدنیا مریم خصائل بی بی کو دنیاوی تعلقات میں پھنسنا بھی ناموزوں تھا۔ اور یہ ترک تعلق انکے لیے زیور تھا نہ کہ ان لوگوں کے لیے جو تمام علائق دنیوی میں آلودہ ہیں شعر

درحق او مدح درحق تو ذم — درحق او شہد درحق تو سم

اصل یہ ہی کہ نہ تمام دنیا کے مرد حضرت عیسےٰ ہیں اور نہ تمام عورتیں رابعہ ہیں جو باتیں ایک تارک الدنیا اپنے لیے خلاف مصلحت سمجھتا ہی بسا اوقات ایک دنیادار کو اسکی حد سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

حضرت رابعہؒ حد درجہ کی مستغنی المزاج تھیں۔ بادشاہ وزرا اور امرا انکی خدمت میں حاضر ہوتے لیکن کبھی کسی قسم کی اپنی حاجت انسے ظاہر نہیں کی۔ اور توکل اور قناعت کے ساتھ زندگی بسر کی۔

ایک مرتبہ ان کو کسی چیز کی ضرورت پڑی اور وہ انکے پاس نہ تھی کسی نے کہا کہ اگر آپ فلاں شخص کے ہاں کہلا بھیجیں تو مل جائیگی۔ اُنھوں نے کہا کہ دنیا کی کسی چیز کا سوال تو میں اللہ سے بھی نہیں کرتی جو سارے جہان کا مالک ہے۔ تو ایسے شخص سے کیا کروں جو کسی چیز کا بھی مالک نہیں۔

ایک دفعہ بیمار ہوئیں۔ امام حسن بصریؒ ان کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ دروازے پر ایک شخص چار ہزار دینار لیے کھڑا تھا۔ اس نے امام سے کہا کہ ان برکت والی بیوی سے سفارش کر دیجیے کہ میری طرف سے یہ تحفۂ حقیر قبول فرمالیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ انہیں کی برکت سے یہاں انوار الٰہی نازل ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے سفارش کی۔ حضرت رابعہؒ نے کہا کہ اے حسن! اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو بھی روزی دیتا ہے۔ پھر کیا جس شخص کے دل میں اس کی محبت ہو اُسکو روزی نہ دیگا۔ میں یہ مال کیوں لوں جو معلوم نہیں کہ حلال ہے کہ حرام ہے۔

مالک بن دینار محدث کہتے ہیں کہ میں رابعہ کے یہاں گیا۔ دیکھا کہ ایک ٹوٹے ہوئے کوزے سے وضو کر رہی ہیں۔ ایک پُرانی چٹائی ہے کہ وہی مصلےٰ ہے وہی بستر ہے اور سرہانے تکیہ رکھنے کے لیے ایک اینٹ ہے۔ مجھے رقت آئی۔ میں نے کہا کہ میرے بعض دوست دولتمند ہیں کہو تو میں اُن سے سفارش کر کے تمہارے آرام کا کچھ بندوبست کروں۔ اُنھوں نے کہا کہ مالک! کیا میرے حال کو اللہ تعالیٰ نہیں جانتا۔ میں نے کہا کہ بیشک جانتا ہے۔ کہا کہ جسنے امیروں کو دیا ہے کیا وہ مجھے نہیں دیسکتا۔ میں نے کہا کہ ضرور دے سکتا ہے۔ فرمایا کہ بس جس حال میں وہ پسند کرے اُسی حال میں ہم کو بھی راضی و شاکر رہنا چاہیے۔

ایک دن انکے یہاں مجلس گرم تھی۔ دنیا اور اہل دنیا کا تذکرہ آگیا۔ لوگوں نے بیحد اس کی بُرائی بیان کرنی شروع کی اور دیر تک اسی کی باتیں ہوتی رہیں۔ رابعہؒ نے کہا کہ بس خاموش رہو۔ تم میں سے ہر شخص دنیا دار ہے۔ اگر تمہارے دل میں دنیا کی محبت نہ ہوتی تو تم گو مخالفانہ ہی پہلو سے سہی اسکا اسقدر تذکرہ نہ کرتے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس چیز کی انسان کے دل میں جسقدر محبت ہوتی ہے اُسی قدر اُس کا تذکرہ کرتا ہے۔

ایک دفعہ انکے یہاں ایک شخص آیا جو سر پر پٹی باندھے ہوئے تھا پوچھا کہ کیا حال ہے
اس نے کہا کہ سر میں سخت درد ہے۔ کہا کہ تمہاری عمر کیا ہے؟ اس نے کہا کہ تیس سال
فرمایا کہ اس سے پہلے بھی کبھی درد سر ہوا تھا۔ اس نے کہا نہیں۔ کہا کہ اس تیس سال
کے عرصہ میں میں نے تم کو کبھی شکریہ کی پٹی باندھے ہوئے نہ دیکھا۔ آج ایک دن کے
لیے درد ہوا تو شکایت کی پٹی باندھ لی۔

کسی نے انسے پوچھا کہ تم شیطان کو دشمن رکھتی ہو کہ نہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ
رحمٰن کی محبت نے میرے دل میں شیطان کی عداوت کی گنجایش نہیں چھوڑی۔

کسی نے ان کی محفل میں عورتوں پر اعتراض کیا کہ وہ ناقص العقل ہوتی ہیں۔
اسی وجہ سے کوئی عورت نبی نہیں بنائی گئی۔ حضرت رابعہؓ نے فرمایا کہ بیشک ٹھیک
کہتے ہو۔ لیکن اللہ کا شکر ہی کہ اگر ہم نبی نہیں ہوئے تو ہم نے خدائی کا بھی دعویٰ نہیں کیا
اور یہ بے ادبی مردوں ہی سے ہوئی۔

تین بار حج کیا۔ ایک گدھا پال رکھا تھا اسی پر سوار ہو کر حج کے لیے جاتی تھیں
کہتے ہیں کہ ابراہیم ادھم سے بھی مکہ میں ملاقات ہوئی تھی۔

بزرگوں سے بہت ہی خلوص رکھتی تھیں۔ ایک بار کھانا پکا رہی تھیں کہ امام
حسن بصری انکے یہاں آ گئے۔ کھانا چھوڑ کر ان سے باتیں شروع کیں اور کہا کہ واللہ
یہ باتیں کھانے سے بہتر ہیں۔ مغرب تک باتیں کرتی رہیں۔ نماز پڑھنے کے بعد پھر
کھانا پکایا۔

ایک مرتبہ انکے یہاں دو درویش مہمان آ گئے۔ انکے پاس خشک دو روٹیاں
تھیں۔ مجبوراً مہمانوں کے سامنے وہی رکھدیں۔ اتنے میں دروازہ پر ایک فقیر نے
صدا دی۔ سنتے ہی مہمانوں کے آگے سے وہ دونوں روٹیاں اُٹھا کر اس فقیر کو دے
ڈالیں۔ مہمان حیران بیٹھے رہے۔ اور کچھ نہ سمجھے کہ کیا معاملہ ہی۔ تھوڑی دیر میں کیا

دیکھتے ہیں کہ ایک کنیز خوان میں کھانا لیے ہوئے آرہی ہے۔ گرما گرم کھانا مہمانوں کے آگے رکھا اور دیکھا تو پوری بیس روٹیاں تھیں۔ مہمانوں نے تعجب سے پوچھا کہ آخر معاملہ کیا ہے انھوں نے کہا کہ اُن دو خشک روٹیوں سے تمہارا پیٹ تو بھرتا نہیں اسلیے میں نے فقیر کی صدا سنتے ہی اسکو دیدیا۔ تاکہ اس کے عوض میں اللہ تعالیٰ میرے مہمانوں کیلیے سامان کردے۔ سو اُس نے کھانا بھیجدیا۔ اور ہر ایک روٹی کے بدلے میں دس روٹیاں اس نے بھیجیں جیسا کہ دس گنا ثواب دینے کا اُس نے وعدہ کیا ہے۔ وہ درویش اُنکے کمال ایمان اور مقبولیت کے قائل ہوگئے۔

ان کی وصیت ہے کہ اپنی نیکیوں کو اس طرح چھپاؤ جس طرح تم اپنے عیوب کو چھپاتے ہو۔ کہا کرتی تھیں میری جو نیکی ظاہر ہوگئی میں اسکو اپنی نیکیوں میں نہیں شمار کرتی۔

جب انکے انتقال کا وقت آیا تو اپنی خادمہ عبدہ سے کہا کہ تم مجکو غسل دیکر میرے اس جبہ (ایک گلیمی جبہ جسکو پہنکر وہ رات کو عبادت کیا کرتی تھیں) میں کفنا دینا انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر لوگوں نے اُن کو لیجا کر دفن کیا۔

ان کی وفات ۱۳۵ھ میں ہوئی اور ان کا مزار کوہ طور کی ایک چوٹی پر ہے۔ جو زیارت گاہ ہے۔

سیدہ نفیسہ رح

ایک حدیث ہے کہ "انسان پہلے آسمان پر مقبول ہو لیتا ہے تب زمین پر مقبول ہوتا ہے" یعنی جو شخص اپنی نیکیوں اور اعلیٰ انسانی صفات کی بدولت اپنے آپ کو خدا کا مقبول بندہ ثابت کرتا ہے۔ اس کی تمام لوگ عزت کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ دنیا میں ہر دل عزیز ہو جاتا ہے۔

خدا کی مقبولیت اور دنیا میں ہردلعزیزی نہ علم و عقل سے حاصل ہوتی ہے۔ نہ حسن و جمال سے ملتی ہے نہ مال و دولت سے خریدی جاتی ہے نہ طاقت اور قوت کے زور سے کمائی جاتی ہے اسکے حصول کا ذریعہ صرف ایک چیز ہے **نیکی**

مصر ہی میں دیکھو فرعون کیسا طاقتور تھا، ہامان اسکا وزیر کتنا بڑا عقلمند تھا قارون کسقدر دولتمند تھا مگر سب کے سب اللہ کی بارگاہ سے مردود ہوئے اور تمام مخلوق کے نزدیک ملعون ٹھہرے۔

اسی مصر میں ایک غریب اور کمزور عورت جسکا نام عنوان پر درج ہے گذری ہے جس کے پاس نہ سلطنت تھی نہ جاہ و جلال تھا مگر دل میں نیکی اور پرہیزگاری تھی۔ اسی کی بدولت وہ آج گیارہ سو سال گذرنے کے بعد بھی اسقدر مقبول ہے کہ لوگ ایک پرستش نہیں کرتے اور باقی سب کچھ کرتے ہیں۔

مصر میں بڑے بڑے اولیاء اللہ گذرے ہیں مثلاً حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت سید احمد بدوی وغیرہ لیکن جو شرف قبول سیدہ نفیسہ کو اللہ تعالے نے عطا فرمایا وہ کسی کو نہیں دیا۔ یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اولیاء اللہ کے مزاروں میں سے مردوں میں خواجہ معین الدین چشتی کا مزار ہند میں اور عورتوں میں حضرت سیدہ نفیسہ کا مزار مصر میں تمام دنیائے اسلام میں سب سے بڑی زیارت گاہیں ہیں۔

سیدہ نفیسہ حضرت امام حسنؓ کے بیٹے زید کی پوتی ہیں۔ انکے باپ کا نام بھی حسن ہے۔ ان کا سلسلہ نسب اس طرح پر ہے۔ نفیسہ بنت حسن۔ بن زید۔ بن حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم۔

ان کی پیدائش ۱۴۵ھ میں مدینہ شریف میں ہوئی۔ پہلے قرآن شریف حفظ کیا پھر علم تفسیر۔ حدیث اور فقہ حاصل کیا۔ انکے والد حسن خلیفہ بغداد ابوجعفر منصور کی طرف سے ۱۵۰ھ میں مدینہ کے حاکم مقرر ہوئے۔ اسی سال امام جعفر صادق کے

بیٹے اسحاق المؤتمن کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ وہ ان کو مکے میں لیگئے اور وہیں رہنا شروع کیا۔

۱۵۶ھ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ خلفاء عباسی حضرت علیؑ کی اولاد کے دشمن ہوگئے۔ چنانچہ سیدہ نفیسہؒ کے والد کو بھی خلیفہ منصور نے قید کر دیا۔ اور ان کا مال و متاع ضبط کر لیا۔

ان مخالفتوں کی وجہ سے سیدہ نفیسہ مع اپنے شوہر اسحاق المؤتمن کے مکے سے مصر چلی گئیں اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

سیدہ کے علم و فضل اور خاصکر خاندان نبوت سے ہونے کی وجہ سے مصر والوں نے بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا مقام عریش تک ہزارہا عورتیں ہودجوں میں سوار۔ اور حکام۔ تجار اور علماؤ فضلاً ان کی پیشوائی کے لیے آئے۔ وہ مصر کے ملک التجار جمال الدین عبداللہ کے یہاں فروکش ہوئیں۔

مصر اور اسکے اطراف کے تمام لوگ برکت حاصل کرنے کی غرض سے ان کے پاس آتے تھے۔ اور ہر وقت ان کا مکان علماء فضلاء اور نیز مختلف طبقہ کے لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ امام شافعی بھی انکی خدمت میں آکر حدیث سنتے۔ اور ان کا بہت احترام کرتے تھے،

اسی درمیان میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک یہودن بڑھیا اپنی اپاہج بیٹی کو لیکر ان کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ان کی برکت سے وہ لڑکی بالکل اچھی ہوگئی۔ جس کی وجہ سے اس لڑکی کا تمام محلہ مع اس کی والدین کے مسلمان ہوگیا۔ یہ کرامت دیکھ کر اسقدر خلقت ٹوٹی کہ سیدہ گھبرا گئیں۔ اور ارادہ کیا کہ ہم مکے چلے جائیں۔

مصر والوں پر یہ امر بہت شاق گزرا۔ انھوں نے مصر کے حاکم سری بن الحکم کو آمادہ کیا کہ جس طرح ہو سکے سیدہ کو مصر ہی میں روکے۔ سری انکے پاس آیا اور پوچھا کہ آپ یہاں سے کیوں تشریف لیجانا چاہتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کثرت ہجوم سے

میں عبادت نہیں کرسکتی۔ اور نیز یہ کہ میرا یہ مکان بھی تنگ ہے اس میں اسقدر ازدحام کی گنجایش نہیں۔ سری نے کہا کہ مکان کا تو یہ علاج ہے کہ میرا ایک مکان محلہ درب السباع میں نہایت وسیع ہے میں اللہ کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ میں نے اسکو آپ کے لیے ہبہ کردیا اور اس ازدحام کا بندوبست یہ ہے کہ ہفتہ میں دو روز مقرر کردیجیے کہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اور باقی دنوں میں کوئی نہ آنے پائے تاکہ آپ اطمینان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرسکیں۔

سیدہ نفیسہؒ نے شنبہ اور چہارشنبہ دو دن لوگوں کیواسطے مقرر کردیا۔ اور وہ سری کے محل میں جاکر رہنے لگیں۔ حکام مصر نے بڑی رقم انکے گزارہ کے لیے مقرر کردی جس سے وہ اپاہجوں، بیواؤں اور مسکینوں کی مدد کرتی تھیں۔

سیدہ بڑی عبادت گزار تھیں۔ انھوں نے تین حج کیے۔ اکثر روزے رکھا کرتی تھیں۔ تفسیر اور حدیث سناتیں۔ قرآن شریف کی تلاوت ان کا شغل تھا۔ بے انتہا رقیق القلب تھیں۔ رات رات بھر عبادت میں کھڑی اللہ کی درگاہ میں رویا کرتی تھیں

ان کی وفات بھی ناگہانی طور پر وقوع میں آئی۔ ۲۰۸ھ میں رمضان کے مہینے میں جبکہ ان کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ روزہ رکھے ہوئے قرآن شریف کی تلاوت کررہی تھیں۔ یکایک ضعف غالب ہوا۔ اور دفعتاً حالت خراب ہوگئی۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ روزہ توڑ دیجیے۔ اُنھوں نے کہا کہ تیس سال سے میری آرزو یہی تھی کہ میں روزہ رکھے ہوئے اللہ کے حضور میں جاؤں۔ اب جبکہ یہ امید پوری ہورہی ہے کیوں روزہ توڑ دوں۔ آخر اسی دن انتقال کرگئیں۔

ان کے شوہر اسحاق نے یہ خواہش کی کہ میں ان کو مدینہ میں لیجاکر دفن کروں۔ لیکن مصر کے لوگوں نے کہا کہ آپ اس برکت کو ہم سے نہ چھینیے اور ان کو یہیں دفن کردیجیے۔ چنانچہ ان لوگوں کے اصرار سے اسی مکان میں جس میں وہ رہتی تھیں او

جو مقام درب السباع میں مصر قدیم اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے ان کو دفن کیا۔

ملک عادل ایوبی کی والدہ نے ان کی قبر پر ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی اور اسکے متعلق ایک لنگر خانہ بھی بنوا دیا۔

ان کی مقبولیت کی اس سے بڑھکر کیا دلیل ہوگی کہ جسقدر حکمران خاندان مصر میں ہوئے مثلاً فاطمی عباسی، چرکسی ایوبی ترکی، وغیرہ ان میں سے ہر ایک شخص ان کے مزار کے احاطہ میں مدفون ہونا موجب برکت اور باعث نجات سمجھتا تھا۔ چنانچہ آج تمام گزشتہ حکمران خاندانوں کے بادشاہوں امراء اور ارکان سلطنت کی بیشتر قبریں حضرت سیدہ نفیسہ ہی کے مزار کے احاطہ میں ملینگی۔ زائرین اور عقیدتمندوں کی اس مقام پر بھیڑ لگی رہتی ہے۔

سنہ ۶۲۵ھ میں ملک اشرف خلیل نے اس مزار پر ایک بڑا بھاری مدرسہ بنوا دیا تھا۔ اور اسپر بہت بڑی جائداد وقف کر دی تھی۔

یہ عقیدت اسقدر بڑھتی چلی گئی کہ سیف الدین قائتبائے جو سنہ ۸۷۲ھ میں مصر کے تخت سلطنت پر بیٹھا۔ حضرت سیدہ نفیسہؓ کے مولود کی رسم جاری کی۔ اس مولود کی مجلس میں خلیفہ وقت چاروں مذہب کے قاضی اور تمام امراء اور اعیان سلطنت شریک ہوتے تھے اور نہ صرف قاہرہ بلکہ دُور دُور سے لوگ اسمیں شریک ہونے کے لیے آتے تھے۔ سلطنت کی طرف سے عمدہ عمدہ کھانے تیار کیے جاتے تھے اور ہر شخص کو کھلائے جاتے تھے۔

اس قسم کے متبرک مزاروں پر ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں جو عوام الناس کی عقیدت مندی کو بڑھاتے ہیں۔ حضرت سیدہ نفیسہ کے مزار کی بھی بہت سی کرامتیں مختلف کتابوں میں ہم نے دیکھیں۔ ہم ان میں سے ایک دو واقعہ لکھتے ہیں جس سے عوام کی عقیدتمندی کا اندازہ ہو سکے گا۔

سنہ ۹۲۶ھ میں مصر میں مراغہ کا ایک تاجر رہتا تھا جسکا نام محی الدین تھا۔ اسکی ایک لڑکی سات سال کی عمر کی بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اسکے سر پر ایک عراقی زرین قیمتی

ٹوپی تھی۔ سامنے ہی ایک لڑکے کی دکان تھی جو بچوں کے لیے کھلونے اور قمریاں بنایا کرتا تھا۔ اس حریص دوکاندار لڑکے نے جب اس بھولی بھالی کمسن لڑکی کے سر پر زریں ٹوپی دیکھی تو اسکے دل میں لالچ پیدا ہوا۔ وہ اُٹھا اور اپنے حبشی غلام کو بھی ساتھ لیا۔ دونوں ملکر لڑکی کو بہکا پھسلا کر حضرت سیدہ نفیسہ کے مزار کے ایک اندھیرے تہ خانے میں لے گئے۔ وہاں لیجا کر چھری سے اُسکا گلا کاٹا اور ٹوپی لیکر بھاگے۔ وہ بچی خاک و خون میں تڑپتی رہی۔

اُدہر لڑکی کی تلاش ہوئی۔ ماں باپ پریشان تھے کہ کیا ہوئی کہاں گئی۔ آخر اُسکے باپ کو شبہ ہوا کہ معلوم ہوتا ہی کسی بدمعاش نے ٹوپی کی خاطر اُسکو مار ڈالا۔ یہ خیال کرکے کہ جسنے مارا ہوگا وہ ٹوپی بیچنے کے لیے بازار ہی میں آئیگا۔ وہ دوڑا ہوا بازار میں گیا تمام سوداگروں کو جن سے رات دن اُسکا لین دین تھا جمع کیا اور واقعہ سُنایا اور کہا کہ جب اس قسم کی ٹوپی کوئی شخص بازار میں بیچنے کے لیے آئے تو خیال رکھو۔ وہی میری لڑکی کا قاتل ہوگا۔

شام کو قمری ساز ٹوپی لیکر بازار میں بیچنے کو پہونچا۔ ایک دوکاندار کو دکھلائی اُسنے اس کی قیمت چالیس دینار (سو روپیہ) لگائی۔ لیکن اسکے ساتھ ہی کہا کہ جبتک اس بات کی ضمانت نہ دوگے کہ یہ چوری کا مال نہیں ہی اُسوقت تک میں اسکو نہیں خریدونگا۔ اُسنے ضمانت دینے میں حیلہ حوالہ کیا۔ اور چند سوداگروں نے دیکھا تو انھیں شبہ ہوا جھٹ محی الدین کو خبر کی وہ دوڑا ہوا آیا۔ دیکھا تو اسی کی لڑکی کی ٹوپی ہے۔

وہ لڑکے کو پکڑ کے مصر کے کوتوال میر کشبغا کے پاس لے گیا اُس نے اس لڑکے کو خوب پیٹا۔ آخر اس نے اقبال کیا کہ میں اور میرے حبشی غلام دونوں نے ملکر اس لڑکی کو قتل کیا ہی۔ کوتوال ان کو ساتھ لیکر موقع واردات پر تحقیقات کو چلا۔ وہ دونوں اسی تاریک تہ خانے میں لے گئے۔ دیکھا تو وہاں لڑکی پڑی ہوئی ہی۔ لیکن زندہ ہی اور ہوش و

حواس میں ہے۔ اسکا باپ اُسکو اُٹھالایا۔ علاج کیا۔ چند روز کے بعد وہ بالکل اچھی ہوگئی۔

ہاں۔ تو اب مشہور یہ ہے کہ اُس لڑکی نے کہا کہ وہاں پڑے پڑے میں نے دیکھا کہ ایک نورانی شکل کی بیوی سفید لباس پہنے ہوئے میرے پاس آئیں۔ اُنھوں نے میرے چہرے کے خون پونچھا۔ بہت دلاسا اور تسلی دلائی۔ اور کہا کہ تو رو نہیں۔ ہم آج ہی شام کو تجھے تیری ماں کے پاس بھجوا دینگے۔ اس سے مجھے تسلی ہوگئی۔ اور میں آرام سے لیٹی رہی۔

۱۱۷۳ھ میں ایک اور عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

مصر کے چند مسلمان عیسائیوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوگئے تھے۔ اُنھوں نے اُس شب کو جس میں سیدہ نفیسہؓ کا مولود کیا جاتا ہے۔ کہیں سے کسی طرح پر ایک بکری حاصل کی تاکہ اُسکو نذر چڑھائیں اور سیدہ کی برکت سے اس قید سے اُن کو خلاصی حاصل ہو۔

وہ بکری ذبح کرنے کی تیاری میں تھے کہ عیسائی افسر نے دیکھ لیا۔ اُس نے منع کیا۔ اور بکری ذبح کرنے سے روک دیا۔ اسی شب کو اُس نے ایسا خوفناک خواب دیکھا کہ صبح اُٹھتے ہی مسلمان قیدیوں کو آزاد کیا۔ اور اُن کو زاد راہ وغیرہ دیدیا کہ وہ اپنے گھر واپس چلے جائیں۔

وہ قیدی خوشی خوشی مصر میں واپس آئے اور اُس مبارک بکری کو بھی اپنے ساتھ لائے اور سیدہ کے مزار پر اسکو پہنچا دیا۔

وہاں کے مجاور شیخ عبد اللطیف نے اس سونے کی چڑیا کو ریشم کا لباس اور سونے چاندی کے زیورات پہنائے۔ اور مشہور کیا کہ یہ بکری خاص سیدہ نفیسہ کی ہے۔ اُنھوں نے اپنی قبر سے بلند آواز سے مجکو اس کے پرورش کی وصیت کی ہے۔ جس شخص کے نذرانہ میں سے یہ کچھ کھالے گی اُس کی مراد پوری ہو جائیگی۔ اور یہ سوائے کیلے اور انجیر کے اور کچھ نہیں کھاتی۔

خلقت خدا ٹوٹ پڑی۔ بڑے بڑے امرا کے گھروں سے اسکے لیے زیورات

گئے اور کیلے اور انجیر کی ڈالیاں چڑھنے لگیں۔ اور جوق در جوق مرد و عورت اُس کی زیارت کے لیے آنے لگے۔

امیر عبدالرحمن کتخدا والی مصر نے اس فتنہ کو رفع کرنے کی یہ تدبیر سوچی کہ شیخ عبداللطیف کے پاس کہلا بھیجا کہ میرے حرم کے لوگ اس بکری کی زیارت کا شوق رکھتے ہیں اگر تھوڑی دیر کے لیے بھجوا دیجیے تو بہت بہتر ہو۔ شیخ موصوف بکری کو اپنی گود میں لیکر اپنے خچر پر سوار ہوئے۔ طبلے بجتے ہوئے جھنڈیاں ہلتی ہوئیں اور مع ساز و یراق کے روانہ ہوئے۔ خلقت کا ایک جم غفیر ساتھ ساتھ تھا۔

پہونچنے کے ساتھ ہی امیر موصوف نے اس بکری کو محل میں بھجوا دیا۔ جہاں وہ فوراً ذبح کر کے پکائی گئی اور دسترخوان پر لائی گئی۔ شیخ نے بھی بے خبری میں خوب مزے لیکر اسکا گوشت کھایا اور تعریف فرمائی۔ امرا ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے۔ اور آنکھوں آنکھوں میں اشارے کر کر کے ہنستے تھے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد امیر نے شیخ کو بتلایا کہ یہ اُسی بکری کا گوشت تھا۔ اور پھر اُن کو اُن کی ابلہ فریبی اور خلقت خدا کو گمراہ کرنے پر بہت ڈانٹا۔ اور اُسی بکری کی کھال انکے سر پر رکھ کے اسی ساز و سامان کے ساتھ واپس کیا۔ اور ساتھ میں سپاہی مقرر کر دیئے کہ اسی طرح مزار تک پہونچاؤ۔

زبیدہ خاتون

یہ معزز خاتون جو اپنے جاہ و جلال اور حسن و جمال کے لحاظ سے دنیا میں بے مثل ہو گزری ہے۔ خلیفہ جعفر کی بیٹی اور خلیفہ منصور عباسی کی پوتی تھی۔ اسکا باپ جعفر نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ اور عباسی خاندان میں جبکے

ہاتھوں میں خلافت کی باگ تھی خوبصورتی اور دانائی میں ہر ایک سے ممتاز تھا۔ اسکی پہلی اولاد یہی زبیدہ خاتون ہے جو ۱۴۹ھ میں اپنے پُرشان دادا کے حین حیات پیدا ہوئی۔

منصور اپنی اس خوبصورت اور ہونہار پوتی کو ہر وقت اپنی آغوش میں رکھتا تھا۔ اس کی شگفتہ طبیعت اور پیاری صورت سے اسکو کچھ ایسی محبت ہو گئی تھی کہ اپنے پاس سے اسکا الگ ہونا گوارا نہیں کرتا تھا۔

اسکا نام امۃ العزیز کنیت ام جعفر اور لقب طاہرہ ہے۔ لیکن منصور پیار سے اسکو زبیدہ زبیدہ کہا کرتا تھا۔ آخر یہی اسکا نام ہو گیا۔

اس زمانہ میں مسلمان عام طور پر عورتوں کو تعلیم دیتے تھے۔ چنانچہ زبیدہ کو بھی تعلیم اچھی دلائی گئی شاعری۔ علم ادب۔ عربی و فارسی۔ تفسیر۔ فقہ اور نحو میں اسکو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اور چونکہ طبیعت میں اعلیٰ درجہ کی شاہانہ نفاست تھی اسوجہ سے فنون لطیفہ سے بھی اسکو بہت ذوق تھا۔

سب سے پہلے سونے اور چاندی کے قمقمے اسی نے ایجاد کیے جو آبنوسی مرصع کڑوں میں اسکے قصر میں لٹکائے گئے۔ چھت گیری بھی اسی کی ایجاد ہے۔ اپنے لیے مختلف رنگ کے موزے بُنواتی تھی جن پر جواہرات ٹکتے تھے۔ اور سنہری اور روپہلی کام ہوتے تھے انھیں موزوں سے بعد میں کفش زردوز نکالا گیا۔

ریشمی کپڑوں پر طرح طرح کے گل بوٹے بناتی تھی۔ عنبر کی شمع بھی اسی کی ایجاد ہے الغرض فنون لطیفہ میں اسی نے جان ڈالی۔

اس خوبصورت اور ہر دلعزیز شاہزادی کا نکاح ۱۶۴ھ میں شاہزادہ ہارون الرشید کے ساتھ کیا گیا جو اسکی طرح نیک۔ خوبصورت۔ ہر دلعزیز اور علم کا شائق تھا۔ اور جسکے نام سے آج دنیا کے تمام لوگ عام طور پر واقف ہیں۔

۱۶۵ھ میں مہدی کی خلافت کے زمانہ میں محمد ابن سلیمان کے عالیشان محل میں اس کی وداع ہوئی۔ جو زبیدہ کو دیدیا گیا تھا۔ لیکن اسکو پسند نہ آیا۔ اسلیے عباسہ کو ملا جو ہارون کی بہن تھی۔

یہ شاہزادی نہایت لائق اور عقلمند تھی۔ متانت اور وقار اسکی آبائی وراثت تھی۔ بلا استثنا رعباسی خاندان میں اس سے زیادہ معزز کوئی عورت نہیں گزری۔ اسکا شوہر ہارون الرشید جو ایک نہایت عالی دماغ۔ بلند حوصلہ اور وجیہ بادشاہ تھا اسپر بھی اس نے ہمیشہ اپنا اثر قائم رکھا۔ شاہی محل میں ہر طرح کی خواتین تھیں لیکن کسی کا اثر اور اقتدار اس کے مقابل میں کچھ نہیں تھا۔ یہی محل کی افسر اور ملکہ تھی۔

اس کی خوش خلقی اور رحمدلی مشہور تھی۔ درباریوں میں سے جب کسی پر خلیفہ کی خفگی ہوتی اور وہ معزول یا قید کیا جاتا تو اسی کی سفارش سے اُسکو نجات ملتی تھی۔ ایک مرتبہ قاسم کی سواری نکلی جو ہارون کا بیٹا تھا۔ کچھ سوار آگے تھے کچھ پیچھے۔ اور نہایت کروفر سے چلا جاتا تھا۔ رستہ میں ابوالعتاہیہ نے جو ہارون کا درباری شاعر تھا سلام کیا۔ لیکن اُس نے خیال نہیں کیا اور چلا گیا۔ ابوالعتاہیہ نے ایک شعر پڑھا جسکے معنی یہ ہیں۔

"کہ انسان جہالت کی وجہ سے گھمنڈ کرتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ گویا موت کی چکی اسکو نہ پیسے گی"

یہ خبر قاسم تک پہونچی۔ اُس نے اس بڈھے شاعر کو پٹوایا اور قید خانہ میں بھیجدیا اس غریب نے وہاں سے زبیدہ کے پاس چند اشعار لکھ کر بھیجے۔ جنکو دیکھ کر اسے رقت آئی۔ اس نے بادشاہ سے سفارش کی اور آخر وہ رہا ہو گیا۔

ہارون اگرچہ خود بڑا فیاض تھا۔ لیکن زبیدہ نے اس کی فیاضی کو بھی مات

کر رکھا تھا۔ تمام بغداد کے گھرانے اسکے ممنون اور مرہون احسان تھے۔

اس خاتون کا دین و مذہب یہ تھا کہ بنی آدم کے ساتھ جسقدر ہو سکے سلوک کرو چنانچہ اس کے پاس بیحد دولت تھی۔ علاوہ بریں پچاس لاکھ درہم سالانہ اس کی جاگیر کی آمدنی تھی۔ سب اس نے رفاہ عام کے کاموں پر صرف کر دی۔

بغداد سے دمشق تک جا بجا پل۔ کنوئیں اور سرائیں بنوادیں جن کی وجہ سے آنے جانے والے قافلوں کو بہت آرام ملنے لگا۔ ابتک وہ تمام زبیدہ ہی کے نام سے مشہور ہیں۔

مکے اور مدینے کے درمیان میں بھی اسی طرح جہاں جہاں حاجیوں کا قافلہ اُترتا ہے اُنکے آرام کے لیے کنوئیں اور منازل بنوادیئے۔

سب سے بڑا کام جو اس نے کیا ہی اور جو تاریخ میں عورتوں کے کارناموں میں سُنہری حرفوں سے ہمیشہ لکھا جائیگا وہ یہ ہی کہ اس نے حجاز میں نہر زبیدہ نکلوائی۔

اسکا واقعہ یہ ہی کہ ۱۹۰ھ میں جب وہ حج کے لیے گئی تو حجاز میں سخت قحط تھا چاہ زمزم بھی خشک تھا۔ پانی اسقدر گراں تھا کہ ایک مشک ایک اشرفی کو آتا تھا زبیدہ نے چاہ زمزم کو کُھدوایا۔ اُس میں پانی نکلا۔ پھر اُس نے سوچا کہ ایسی کوئی صورت ہونی چاہیے جس کی وجہ سے ان مقامات میں آسانی کے ساتھ پانی میسر آسکے۔

اس نے کارپردازوں اور واقف کاروں کو بلاکر اس معاملہ میں مشورہ کیا کہ کس صورت سے مکّے تک پانی پہونچایا جا سکتا ہی۔ ان لوگوں نے کہا کہ طائف کی طرف کوہ طاد ہی جہاں سے ایک چشمہ نکلکر وادی سے حنین کی طرف آتا ہی اور وہاں کی کھیتیاں اور باغات اُس سے سیراب ہوتی ہیں۔ وہی چشمہ مکے تک پہونچایا جا سکتا ہی۔ لیکن رستہ میں اسقدر پہاڑ واقع ہیں کہ اس کام میں بے انتہا دولت صرف کرنی پڑیگی۔ زبیدہ نے

کہا کہ اگر ایک کدال مارنے کی قیمت ایک اشرفی ہو گی تب بھی میں ادا کرونگی لیکن یہ کام ضرور ہونا چاہیے۔

الغرض اسکے حکم کے مطابق کام شروع کیا گیا۔ پہلے وادی کے کھیت اور باغات وغیرہ خریدے گئے ا نہر حنین کے ساتھ دوسرے پہاڑی جھرنے اور سوتے لاکر ملا دیئے گئے۔ جن سے وہ اچھا خاصا ایک چشمہ ہو گیا۔ اور متواتر تین سال کی محنت میں یہ نہر مکے تک پہونچائی گئی۔

۱۹۳ھ میں جب یہ نہر پوری ہو گئی تو وہ اُسکو دیکھنے کے لیے پھر مکہ مکرمہ گئی۔ اس نے نہر میں سے پانی نکالنے اور نہانے کے لیے جابجا سقاوے اور حوض بنوا دیئے اور نیز چونکہ میدان عرفات میں جہاں کہ تمام مسلمان حج کے لیے جمع ہوتے ہیں وہاں بھی پانی کی سخت قلت تھی اسلیے اسکے حکم کے مطابق کوہ کرا سے جو چشمہ نکلکر وادی نعمان میں گرتا ہی اس سے نہر نکالکر عرفات تک پہونچائی گئی۔ اور خاص موقف شریف حج میں بہت سے حوض بنا دیئے گئے کہ وہ بھرے رہیں تاکہ جب حاجیوں کا مجمع ہو تو ان کو پانی کی تکلیف نہ ہو۔

عرفات سے اس نہر کو آگے لیجا کر مزدلفہ تک پہونچایا۔ اور پھر وہاں سے مقام منا کے قریب پہونچا کر ایک بہت بڑا کنواں جو جنوں کی بنائی ہوئی ایک خوفناک عمارت معلوم ہوتی ہی کھدوا کر اُس میں اس نہر کو گرا دیا۔

یہ نہر زبیدہ میں دو زہی ۱۷ لاکھ اشرفیاں صرف ہوئیں۔ کارپرداز جب اسکا حساب بنا کر زبیدہ کے پاس لے گئے تو اُس نے اُسکو دجلہ میں پھنکوا دیا اور کہا کہ ہمارے یہاں حساب کا کیا کام ہم نے تو یہ کام حسبۃً للہ کیا ہی۔ جسقدر ہمارے ذمہ باقی ہو لیلو۔ اور جو ہمارا باقی ہو ہم نے معاف کیا۔

امتداد زمانہ سے اکثر یہ نہر خراب ہوتی رہی۔ اور خلفاء اور شاہان اسلام برابر

اس کی مرمت کرتے چلے آئے۔ سلطان سلیمان اعظم کے زمانہ میں چشمہ عرفات بالکل خشک ہوگیا۔ سلطان نے اس کی مرمت کا ارادہ کیا لیکن اس کی بیوی ملکہ حضرت خانم سلطانہ نے کہا کہ جس طرح ہارون الرشید نے اپنی بیوی کو اس نہر کے بنانے کا موقع دیا آپ بھی مجکو اس کی مرمت کا موقع دیں۔ سلطان نے منظور فرمایا۔ ملکہ موصوفہ نے دس لاکھ اشرفیوں کے خرچ سے تمام نہر کو ازسرنو درست کرا دیا۔ کئی جگہ سے پہاڑ کاٹ کر چشمے ملائے گئے۔ اُسوقت سے سلطنت عثمانیہ کی طرف سے ایک باقاعدہ محکمہ اس نہر کی حفاظت اور نگرانی کے لیے قائم کر دیا گیا۔ جو آجتک برابر اس کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہی اور یہ نہر بدستور جاری ہی۔ اور حجاز کی شہ رگ خیال کی جاتی ہی۔ ابتک اسکا نام نہر زبیدہ ہی ہے۔

دوسری بار جب زبیدہ مکہ میں گئی تھی تو اسنے بیس ہزار مثقال سونے کے پتر خانہ کعبہ کے دروازے اور چوکھٹ پر جڑوائے تھے۔

اس عالی حوصلہ عورت نے کئی باغ اور محل بھی تیار کرائے لیکن انکا مفصل حال نہیں مل سکا۔ فارس کا شہر تبریز اسی نے آباد کیا جو اس کی جاگیر کا مرکز تھا۔

علم دوستی کی یہ کیفیت تھی کہ اپنے محل میں ایسی لونڈی نہیں رکھتی تھی جو پڑھی لکھی نہ ہو۔ قرآن شریف سے بہت شغف رکھتی تھی۔ ہر وقت سو لونڈیاں اسکے قصر میں قرآن خوانی کرتی رہتی تھیں۔ دور سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز آ رہی ہے۔

اس کے بطن سے صرف ایک بیٹا امین پیدا ہوا۔ ہارون الرشید کی دوسری عورتوں سے اور کئی بیٹے مامون۔ قاسم اور صالح وغیرہ تھے مگر زبیدہ سب کو ایکساں سمجھتی تھی۔ اور ہر ایک کی تعلیم سے دلچسپی رکھتی تھی۔

ہارون کے مرنے کے بعد امین تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس موقع پر انبارہ کے مقام

میں زبیدہ جاکر اپنے بیٹے سے ملی۔ اسوقت اسکا ایسا شاندار استقبال ہوا کہ اس سے پیشتر دنیا میں شاید ہی کسی عورت کا ہوا ہو۔

لیکن امین دور اندیش اور مدبر نہ تھا۔ یہ دیکھ کر اسکا بھائی مامون جو خراسان کا حاکم تھا۔ خلافت حاصل کرنے کی کوشش میں لگا۔ آخر دونوں میں لڑائی ہوئی۔ ساڑھے چار برس خلافت کرنے کے بعد امین مقتول ہوا۔ اور مامون تخت پر بیٹھا۔

اس موقع پر بعض امرا نے زبیدہ کو بہت اُبھارا کہ جس طرح حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے کی غرض سے حضرت علیؓ سے لڑی تھیں اسی طرح تم بھی اپنے بیٹے کا بدلہ لینے کے لیے مامون سے لڑو۔ اُسنے کہا کہ معاذ اللہ کجا عورتیں اور کجا خونریزی۔

اس کے بعد زبیدہ نے مامون کو ایک خط نہایت پُر درد اشعار میں لکھا جسکو پڑھ کر مامون بہت رویا۔ اور کہا کہ میں نے وہ تو نہیں کہا تھا جو حضرت علیؓ نے کہا تھا جب اُن کو حضرت عثمانؓ کے قتل کی خبر ملی تھی کہ "میں نہ راضی ہوں نہ میں نے حکم دیا" لیکن یہ دل سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ تو میری معزز طاہرہ کا دل رنج و غم سے پاک کردے

ایک تذکرہ میں نظر پڑا کہ زبیدہ نے امین کے مرثیہ میں فارسی زبان میں یہ رباعی لکھی تھی۔

اے جان جہان جہان ناخوش بے تو	بغداد پریشان و مشوش بے تو
رفتی تو و من بے تو بماندم فریاد!	تو در خاکی و من در آتش بے تو

اگر یہ بیان صحیح ہو تو فارسی شاعری میں سب سے پہلا یہ کلام ہوگا۔ اور ہم زبیدہ کو اس کا موجد کہہ سکیں گے۔ کیونکہ مامون کے زمانہ سے پہلے فارسی شاعری کا قطعاً وجود ہی ثابت نہیں ہے۔

خلیفہ مامون نے اس محترم خاتون کے ساتھ وہی برتاؤ رکھا جو کوئی لائق شاہزادہ اپنی ماں کے ساتھ رکھ سکتا ہے۔

دو لاکھ دینار سالانہ اس کی جاگیر مقرر کی تھی۔ تعجب ہے کہ ابن خلدون لکھتا ہے کہ مامون نے امین کے دونوں بیٹوں موسیٰ اور عبداللہ اور زبیدہ کو افریقہ کی طرف بھیجدیا تھا۔ لیکن اور تواریخ سے قطعاً اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

یہ ممکن ہے کہ رنج وغم مٹانے کے لیے یا انتقام کے خوف سے کچھ دن کیواسطے بھیجدیا ہو لیکن زبیدہ نے اپنی آخری زندگی کے دن بغداد ہی میں بسر کیے۔ اور وہیں ۲۱۶ھ میں اسکا انتقال ہوا۔ اور وہیں مدفون ہوئی۔

ترکان خاتون

سلجوقی خاندان کی حکومت تقریباً ڈیڑھ سو سال تک دنیاے اسلام کی سب سے بڑی طاقت تھی۔ اس میں طغرل اور سنجر وغیرہ بڑے بڑے نامی سلاطین ہوئے۔ لیکن اس خاندان کا گل سرسبد سلطان جلال الدین ملک شاہ ہے۔ اس کی حکومت کا رقبہ دیوار چین سے قسطنطنیہ کی فصیل تک اور انتہاے شمال سے آخر یمن تک پھیلا ہوا تھا۔ شاہانِ روم اسکے باجگزار تھے۔

مغلیہ سلطنت میں عہدِ شاہجہاں کی طرح ملک شاہ کا زمانہ بھی عدل و داد علم و شریعت اور امن و عافیت کا زمانہ تھا۔ اسی کا وزیر نظام الملک تھا جسنے بغداد کی مشہور اسلامی درسگاہ نظامیہ قائم کی۔

ترکان خاتون ملک شاہ کی بیوی تھی۔ اور وہ ترکوں کے قدیم بادشاہ افراسیاب کے خاندان سے تھی جو کیکاؤس اور رستم کا مدمقابل اور حریف تھا۔

ترکان خاتون بوجہ اپنی لیاقت اور بیدار مغزی کے ملک شاہ کی مشیر خاص بلکہ امور سلطنت میں شریک غالب تھی۔ سلطان بلا اس کی رائے اور مشورہ کے کوئی

کام انجام نہیں دیتا تھا۔ اور سلطنت کے تمام کاموں میں اس کی رضامندی کو مقدم رکھتا اور اس کی کسی بات کو رد نہ کرتا۔ کیونکہ اُس کو اُس کی دانشمندی اور عقل پر پورا بھروسہ تھا۔

ترکان خاتون خود سلطنت میں دورے کرتی تھی۔ کئی بار دربار خلافت یعنی بغداد میں بھی گئی۔ امرار کو اُس نے بڑے بڑے عطیے اور جاگیریں دیں۔ لوگ اُسکے انعام و اکرام سے مالا مال ہوگئے۔ اور تمام ملک میں وہ حد درجہ ہردلعزیز ہوگئی۔

اس زمانہ میں خلفار بغداد کی سلطنت اگرچہ بالکل محدود ہوگئی تھی۔ لیکن انکا مذہبی اور خاندانی اثر اسقدر تھا کہ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ اور سلاطین ان کے آستانہ کی خاک پر اپنی پیشانی رگڑنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ اس لیے سلجوقی سلاطین کی یہ دلی خواہش تھی کہ عباسی خاندان سے کسی طرح پر ہمارا پیوند ہو جائے۔

خلفار عباسی نے بھی سلجوقیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر ملکی مصلحت کے لحاظ سے انکے ساتھ رشتہ کرنا منظور کرلیا۔ چنانچہ طغرل کی بھتیجی ارسلاں خاتون خلیفہ قائم بامراللہ کے ساتھ بیاہی گئی۔

جب مقتدی بامراللہ جو ارسلاں خاتون کا بیٹا تھا خلیفہ ہوا تو اُس نے ترکان خاتون کی بیٹی ؟ کے ساتھ اپنے نکاح کے پیغام کے لیے وزیر فخرالدولہ کو بطور سفارت کے سلطان ملک شاہ کے دربار میں بھیجا۔

فخرالدولہ نے اصفہان میں پہونچکر سلطان کی باریابی حاصل کی۔ اور مقصد بیان کیا۔ سلطان نے کہا کہ اس معاملہ کا دار و مدار ترکان خاتون پر ہے آپ کو اسکے یہاں جانا چاہیے۔ چنانچہ فخرالدولہ کے ساتھ اُسنے اپنے وزیر نظام الملک کو بھی کردیا۔ اور یہ دونوں مع حشم و خدم کے ترکان خاتون کی ڈیوڑھی پر پہونچے اور پیغام گذارا۔

ترکان خاتون نے چند شرائط پیش کیے۔ منجملہ ان کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ خاتون کی موجودگی میں خلیفہ کسی دوسری عورت سے شادی نہ کرے۔ جب دربار خلافت سے تمام شرائط منظور ہو گئے۔ تو نکاح ہوا۔

نکاح کے بعد ترکان خاتون خود اپنی بیٹی کو لیکر بغداد کو روانہ ہوئی۔ جہیز کا سامان ۱۳۳ اونٹوں اور ۷۴ خچروں پر لادا گیا۔ ہر ایک پر زرّین جھول پڑی ہوئی تھی اور انکے طوق اور زیورات بالکل سونے اور چاندی کے تھے۔ ۶ خچروں پر بارہ صندوق خالص چاندی کے تھے جن میں زیورات اور جواہرات بھرے ہوئے تھے جن کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

جہیز کے آگے آگے سعد الدولہ گوہرآئین سلطانی سفیر اور امیر برسق اور پیچھے پیچھے فوج اور دوسرے امرا تھے رستہ میں جو شہر آتا تھا وہاں کے لوگ استقبال کرکے دلہن پر اشرفیاں نچھاور کرتے تھے۔

جس رات کو یہ قافلہ بغداد میں داخل ہونے والا تھا اُس رات کو خلیفہ کے حکم سے تمام شہر کی آئین بندی کی گئی۔ شاہی محل اور رستہ میں چراغاں ہوا۔ خلیفہ نے پیشوائی کے لیے وزیر ابوشجاع کو بڑے کروفر کے ساتھ روانہ کیا۔ ہزارہا سوار مشعلیں لیے ہوئے آگے آگے تھے۔ انکے پیچھے وزیر کی سواری اور حشم و خدم تھے۔

خلیفہ کا خاص خادم ظفر شاہی محافہ لیکر آیا جو بالکل سُنہری اور مرصع تھا۔ خاتون اپنے میکے کی سواری سے اُتار کر سسرالی محافہ میں سوار کرائی گئی۔ اب باترتیب یہ جلوس بغداد میں داخل ہوا۔

سب سے پہلے وزیر نظام الملک کی سواری تھی جسکے آگے سوار ہاتھوں میں مشعلیں لیے ہوئے تھے۔ اسکے بعد امراء خلافت کی سواریاں تھیں۔ پھر اُن کی بیبیوں کی۔ ہر ایک سواری الگ الگ پورے تزکِ احتشام کے ساتھ تھی۔ ممالیک، حشم و خدم اور

شمعیں اور مشعلیں سب کے ساتھ تھیں۔

اس کے بعد خاتون کا محافہ تھا جس کے جلو میں سو مسلح ترکی کنیزیں نہایت زرق برق لباس میں گھوڑوں پر سوار تھیں۔ محافہ کا قبہ جواہرات کی چمک سے روشنی میں جگمگ کرتا تھا۔ اور تماشائیوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔

وہ رات بغداد کی یادگار راتوں میں سے شمار کی جاتی ہے۔ اور شاید ہی ایسی دھوم دھام کسی شب کو وہاں ہوئی ہو گی۔

صبح کو خلیفہ نے ایک شاندار دربار کیا۔ سلجوقی امرا کو خلعت فاخرہ اور انعام عطا فرمایا۔ اور ترکان خاتون اور دوسری سلجوقی خواتین کو گرانبہا جوڑے دیئے۔

خاتون ایک سال تک وہاں رہی۔ اُس کے بطن سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا جسکا نام جعفر بن مقتدی بامراللہ رکھا گیا لیکن آخر میں خلیفہ نے بعض شرطیں پوری نہیں کیں جسکی وجہ سے ناچاقی ہو گئی۔ اور ترکان خاتون نے اپنی بیٹی کو مع نواسے کے اپنے پاس بلالیا۔ لیکن صفہان پہونچتے ہی وہ انتقال کر گئی۔ بغداد میں اُسکی موت کا بڑا ماتم کیا گیا۔ شعرا نے دردآمیز مرثیے لکھے۔

اسلامی سلطنتوں میں ولی عہدی کے معاملہ میں اکثر پیچیدگیاں پڑتی رہی ہیں ملک شاہ کی سلطنت میں بھی اس معاملہ نے شطرنج کی بساط کی صورت اختیار کر لی۔ واقعہ یہ تھا کہ ترکان خاتون چاہتی تھی کہ سلطان کا سب سے چھوٹا بیٹا محمود جو اُسکے بطن سے تھا ولی عہد ہو۔ نظام الملک اسکا حامی نہیں تھا۔ وہ بادشاہ کے بڑے بیٹے برکیارق کا طرفدار تھا جو ملک شاہ کی بڑی بیوی زبیدہ خاتون سے تھا۔ زبیدہ خاتون اپنے بیٹے برکیارق کی جان کو خطرہ میں دیکھ کر خوف زدہ تھی اس لیے اُس نے نظام الملک اور ممالک نظامیہ (جو نظام الملک کے زرخرید غلام تھے اور سلطنت میں بہت قوی اثر رکھتے تھے) کے دامن میں پناہ لی۔

ملک شاہ کا دوسرا وزیر تاج الملک جو لیاقت اور قابلیت میں نظام الملک ثانی تھا ترکان خاتون کا ہمخیال تھا۔ آخر اس کشاکش نے یہانتک طول کھینچا کہ اسکا نتیجہ نظام الملک کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوا

ترکان خاتون کے لیے اب مطلع صاف تھا۔ لیکن قضاء الٰہی سے اسی اثنا میں ۴۸۵ھ میں ۳۸ سال کی عمر میں ملک شاہ بھی انتقال کر گیا۔ ترکان خاتون نے اسکی موت کو بالکل مخفی رکھا۔ امرار کو بڑے بڑے عطیے دیئے اور اُن سے اپنے بیٹے محمود کی اطاعت کا حلف لیا۔ امیر کربوقا کو سلطان کی مُہر دیکر دار السلطنت اصفہان میں بھیجا۔ وہاں اس نے قلعہ کی کنجیاں حاصل کر کے اسپر قبضہ کر لیا۔ اور یہ سب کام تاج الملک کے ذریعہ سے ہوا۔

بعد ازاں ترکان خاتون ملک شاہ کی لاش کو لیکر مع اپنے نواسے کے بغداد کو روانہ ہوئی۔ تمام سلطنت میں یہ شہرہ تھا کہ سلطان بغداد کو جا رہا ہے۔ کسی کو بھی یہ خبر نہ تھی کہ وہ مر گیا ہے۔

بغداد میں خلیفہ سے اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میرا بیٹا تخت نشین کیا جائے۔ خلیفہ نے منظور کیا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ سلطنت محمود کی ہو۔ خطبہ میرے نام کا پڑھا جائے۔ ملکی اختیارات ترکان خاتون کے ہاتھ میں رہیں۔ تاج الملک وزیر اعظم ہو۔ اور امیر انز سپہ سالار بنایا جائے۔

ترکان خاتون نے اسکو منظور نہیں کیا۔ لیکن جب اس سے کہا گیا کہ تمہارا بیٹا نابالغ ہے شرعاً اس کی ولایت جائز نہیں ہے اسلیے یہ سب شرطیں لگائی گئی ہیں تو مجبوراً اسے ماننا پڑا۔

یہ سب امور طے کر کے اس نے اصفہان میں برکیارق کو گرفتار کرنے کے لیے فوج بھیجی۔ وہ گرفتار کر کے قید کر لیا گیا۔ لیکن جب ممالک نظامیہ کو سلطان کی وفات کی

خبر معلوم ہوئی تو اُنھوں نے فوراً مسلح ہوکر قید خانہ کو توڑ ڈالا۔ اور برکیارق کو قید سے آزاد کرکے تخت پر بٹھالدیا۔

ترکان خاتون ایک عظیم الشان فوج لیکر برکیارق کے مقابلے کے لیے چلی۔

برکیارق نے جب ترکان خاتون کی آمد کی خبر سنی تو مما لیک نظامیہ کو لیکر اصفہان سے نکلکر رے کی طرف روانہ ہوا۔ خوش قسمتی سے راستہ میں امیر ارغش نظامی مع اپنی فوج کے اسکا شریک حال ہوگیا۔ اب یہ دونوں فوجیں ملکر ترکان خاتون کے مقابلہ کے لیے تیار ہوئیں۔ ترکان خاتون نے بھی اصفہان سے برکیارق کا تعاقب کیا۔ اور مقام بردجرد میں دونوں فوجوں کا سخت مقابلہ ہوا۔ ہفتوں لڑائی ہوتی رہی۔ لیکن ترکان خاتون کی فوج سے کئی امیر مثلاً امیر یلبرد امیر کمشتکین جاندار وغیرہ مع اپنے فوج کے دستہ کے برکیارق کی فوج سے جاکر مل گئے جس کی وجہ سے خاتون کو شکست ہوئی۔ اور آخر کار وہ مع اپنی فوج کے واپس آکر اصفہان میں قلعہ بند ہوگئی۔

برکیارق نے کئی مہینے تک اصفہان کا محاصرہ رکھا۔ لیکن وہ فتح نہو سکا اس لیے محاصرہ اُٹھا کر انتظام سلطنت کی طرف توجہ کی۔ اور اُس میں مصروف ہوا۔

ترکان خاتون نے موقع پاکر امیر اسمٰعیل کے ساتھ جو برکیارق کا حقیقی ماموں تھا نکاح کرلیا۔ اب ترکان امراء سر ہنگ سا وتگیں وغیرہ مع اپنی فوجوں کے ترکان خاتو کے طرفدار ہوگئے۔ اور اُس نے اپنی مستقل سلطنت اصفہان کے صوبے میں قائم کرکے اسمٰعیل کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کردیا۔ لیکن امیر انز سپہ سالار فوج نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اُس نے کہا کہ دربار خلافت سے اس کی اجازت نہیں ملی ہے۔ سکہ محمود کے نام کا اور خطبہ خلیفہ کے نام کا ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ

سے امیر انز اور سمعیل میں سخت عداوت پیدا ہوئی ۔ آخر سمعیل اسکے خوف سے بھاگ کر اپنی بہن زبیدہ کے پاس جو برکیارق کی ماں تھی اجازت لیکر چلا آیا ۔

یہاں امرا اس کی طرف سے مطمئن نہ تھے ۔ یہانتک کہ ایک روز امیر کمشتکیں جاندار وغیرہ نے تنہائی میں اس سے دریافت کیا کہ تم کس ارادے سے آئے ہو ۔ اسمعیل نے کہدیا کہ میں اس ارادے سے آیا ہوں کہ موقع پاؤں تو برکیارق کو قتل کر کے سلطنت پر قبضہ کر لوں ۔ یہ سُنکر امرا نے اُسکو قتل کر ڈالا ۔ جب اُسکی بہن زبیدہ خاتون نے یہ کیفیت سُنی تو وہ بھی چُپ ہو رہی ۔

۴۸۶ھ میں ترکان خاتون نے امیر انز کو فارس پر فوج کشی کے لیے بھیجا امیر موصوف نے حاکم فارس توران شاہ کو شکست دیکر وہ صوبہ بھی ترکان خاتون کے قلمرو میں شامل کیا ۔

ترکان خاتون نے نہایت عزت کے ساتھ زندگی بسر کی ۔ برکیارق نے کئی بار اسکو نیچا دکھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی قابلیت اور بیدار مغزی سے برابر اُسکا مقابلہ کرتی رہی ۔ اسکے امرا جان و دل سے اسکے مددگار ۔ مطیع و فرمانبردار تھے اور وہ نہایت ہر دلعزیز تھی ۔

۴۸۷ھ میں اسنے اصفہان میں وفات پائی اور وہیں دفن کی گئی ۔ جنازہ کیساتھ دس ہزار ترکمانوں کی فوج تھی ۔

تمام اطراف ملک میں اسنے مسجدیں ۔ مدرسے اور شفاخانے بنوائے تھے ۔ اس کی سخاوت اور فیاضی کو یاد کر کے لوگ اسکا ماتم کرتے تھے ۔

شجرۃ الدر

شجرۃ الدر ترکی قوم کے ایک غریب غلام کی لڑکی تھی اور ملک شام کے شہر دمشق میں ۱۳۶ھ میں پیدا ہوئی تھی۔ اسکے باپ کا آقا ایک نیک نہاد شامی مسلمان تھا جو بڑا عبادت گزار خدا پرست اور علم دوست تھا۔ اسی کے گھر میں شجرۃ الدر کے والدین اور خود اس کی تربیت ہوئی۔

شام کا ملک حسن کے لحاظ سے دنیا میں ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام وہیں پیدا ہوئے تھے۔ اور اب بھی وہاں کا حسن تمام دنیا میں بے نظیر تسلیم کیا جاتا ہے۔ شجرۃ الدر جو ایک ترک غلام کی لڑکی تھی خدا نے اسکو بے مثل حسن صورت عطا کیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اسکا نام شجرۃ الدر (شاخ مرجاں) رکھا گیا۔

اس کا آقا جو لاولد تھا اسکو بمنزلہ اپنی لڑکی کے سمجھتا تھا۔ اور بڑی محبت کے ساتھ پالتا تھا۔ جب وہ سن شعور کو پہونچی تو اُسکو عربی زبان کی صرف نحو اور قرآن و تفسیر اور حدیث و فقہ کی تعلیم دی۔ قرأت بھی سکھائی۔ اب اس کی لیاقت علمی اور حسن ظاہری کا بڑا شہرہ ہوا۔

ایوبی خاندان کے ملک کامل محمد کا زمانہ تھا وہ بھی اس زمانہ میں دمشق میں موجود تھے ان کے بیٹے شاہزادہ نجم الدین ایوبی نے جب شجرۃ الدر کا ذکر سُنا تو اُسکے آقا کے پاس کہلا بھیجا کہ آپ شجرۃ الدر ہم کو دیدیں۔ نیکدل آقا جو اُس کی ہر وقت بھلائی چاہتا تھا بہت خوش ہوا۔ اور اسکو منظور کرلیا۔ شاہزادہ نجم الدین نے اسکی قیمت میں کئی تھیلیاں اشرفیوں کی بھجوائیں۔ بڈھا ان کو منظور نہیں کرتا تھا۔ مگر جب شاہزادہ نے مفت لینے سے انکار کیا تو مجبوراً اُسکو قیمت لینی پڑی۔

اب شجرۃ الدر جسنے ایک غریب گرنیک اور بہت شریف مسلمان کے جھونپڑے میں پرورش پائی تھی قسمت کی یاوری سے بادشاہ وقت کے محلسرا میں آئی جہاں نعمت و دولت کی انتہا نہ تھی اور ہر قوم کی بیگمات ایک دوسرے سے بڑھکر موجود تھیں۔ مگر شجرۃ الدر جس کی عمر اسوقت اٹھارہ سال کی تھی۔ تمام بیگمات میں ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے تاروں میں چاند۔

ملک کامل محمد نے جب اسکو دیکھا اور حسن ظاہری علمی لیاقت اور عقل وشعور میں کامل پایا تو اپنے بیٹے سے کہاکہ اسکو آزاد کردو اور پھر اسی کے ساتھ بڑے دھوم دھام سے شاہزادہ کی شادی کردی۔

شجرۃ الدر کو اللہ تعالی نے بہت سے مردوں سے زیادہ عقل دی تھی بہت ہی تھوڑے عرصہ میں وہ اپنی عقلمندی کے سبب سے محل میں سب سے ممتاز اور معزز ہوگئی اور ملک صالح نجم الدین کو اسپر بہت اعتماد ہوگیا۔ اس سے ایک بیٹا بھی پیدا ہوا جسکا نام ملک خلیل رکھا گیا۔

ملک کامل محمد کی وفات کے بعد جب ملک صالح نجم الدین بادشاہ ہوا تو شجرۃ الدر بوجہ اپنی عقلمندی کے اسکا دست و بازو بن گئی اور تمام ملکی معاملات میں حصہ لینے لگی۔ یہانتک کہ مدت کے فتنہ وفساد کی وجہ سے ملک شام میں جو خرابیاں پڑگئی تھیں اسکے صلاح ومشورہ سے وہ سب دفع ہوگئیں ملک میں امن اور رفاہیت ہوئی اور ساری رعایا خوشحال ہوگئی۔

جب ملک شام کا انتظام حسب دلخواہ ہوگیا تو ملک نجم الدین اپنے دار الخلافہ قاہرہ (مصر) میں آیا اور وہاں کا انتظام شروع کیا۔ اس زمانہ میں فرانسیسیوں کے حملے برابر مصر پر رہتے تھے ملک صالح نے ایک جرار لشکر ترتیب دیا اور اسکو لیکر فرانسیسوں کے مقابلہ کے لیے نکلا۔ اس کی عدم موجودگی کے زمانہ میں شجرۃ الدر سلطنت کے تمام کاروبار

کی خود مختار حاکم تھی وہ نہایت دور اندیش اور عقلمند عورت تھی اس نے ایسا امن و امان قائم رکھا کہ تمام ملک میں کہیں کوئی فتنہ فساد نہیں کھڑا ہوا ساری رعایا اور امراء و وزرا اس سے خوش تھے۔

ملک صالح نے بہت سے غلام خریدے تھے ان کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی تھی شہر میں کبھی کبھی یہ غلام دنگا فساد بھی کیا کرتے تھے۔ شجرۃ الدر نے جب اس کی شکایت سُنی تو اُس نے مقیاس کے قریب ایک قلعہ بنوایا اُس میں ان سب غلاموں کو رکھا اور شہر میں پھرنے کی ممانعت کر دی۔ اور کئی سو کشتیاں تیار کرائیں اور ہر قسم کے بحری جنگ کے ہتیار مہیا کیے اور ان غلاموں کو بحری لڑائی سکھلائی تاکہ جب فرانسیسی حملہ کریں تو یہ انکا مقابلہ کر سکیں۔

سنہ ۶۴۶ھ میں ملک صالح نجم الدین کے چہرہ پر ایک پھوڑا نکلا۔ ہر چند اسکا علاج کیا گیا لیکن وہ اچھا نہ ہوا بلکہ برابر بڑھتا گیا اسی زمانہ میں ایک فرنچ جنرل جسکا نام ریدا تھا دو سو جنگی کشتیاں لیکر دمیاط کی سرحد پر آپہونچا۔

یہ فرانسیسی سپہ سالار مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ اس نے اندلس کے مسلمانوں پر بڑے بڑے ظلم کیے تھے اور ان کا سارا مال لوٹ لیا تھا۔ اب ایک بھاری فوج لیکر مصر کو لوٹنے کے لیے آیا دمیاط میں پہنچکر اسپر حملہ کیا۔ وہاں کے غریب مسلمان اپنے بال بچوں کو لیکر بھاگے اور سارا شہر اسکے لیے خالی چھوڑ دیا۔ کیونکہ ان میں اسکے مقابلہ کی بالکل طاقت نہ تھی۔

شجرۃ الدر نے جب سُنا تو اسکو بہت تردد ہوا کیونکہ ملک صالح سخت بیمار تھا۔ لیکن عالی حوصلہ بادشاہ نے باوجود اس تکلیف دہ مرض کے اس سے لڑنے کی تیاری کی اور بیشمار فوج لیکر دمیاط کی طرف روانہ ہوا۔ خود ایک محافہ میں سوار تھا کیونکہ اسمیں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ وہ بیٹھ سکتا۔

دمیاط کی سرحد میں پہنچکر فرانسیسوں سے سخت مقابلہ ہوا اور بیشمار فرانسیسی مارے گئے۔ آخر ریدا مجبور ہو کر بھاگ گیا۔

ملک صالح کامیاب واپس آیا۔ لیکن اس کی بیماری بڑھتی جاتی تھی اور آخر ۱۴- شعبان المعظم ۶۴۷ھ کو اسکا انتقال ہو گیا۔

اس سے ایک سال پہلے ملک صالح کا بیٹا ملک خلیل جو شجرۃ الدر سے پیدا ہوا تھا مر گیا تھا۔ ایک دوسرا بیٹا تورانشاہ دوسری بیوی سے تھا وہ اسوقت کیفا کے قلعہ میں تھا جو مصر سے بہت فاصلہ پر ہے اور ملک شام میں واقع ہے۔

ملک صالح کی وفات کے بعد شجرۃ الدر نے یہ عقلمندی کی کہ اسکی موت کی خبر کو شائع نہ کیا۔ کیونکہ اسکو خیال تھا کہ اس کی وفات کی خبر سنکر فرانسیسی پھر حملہ کرینگے چنانچہ روزانہ اطبا محل میں آتے تھے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ملک صالح ابھی زیر علاج ہے اور تمام کاروبار اسی طرح شجرۃ الدر انجام دیتی تھی جس طرح اسکی بیماری کے زمانہ میں کسی کو کانوں کان خبر نہونے پائی کہ بادشاہ مر گیا ہے۔

امیر حسام الدین لاچین اور امیر فارس الدین اقطائی دونوں وزیر اس معاملہ میں شجرۃ الدر کے ہمراز تھے اور کوشش کرتے تھے کہ یہ راز کسی طرح افشا نہو۔

شجرۃ الدر نے ایک آدمی تورانشاہ کے پاس بھیجکر تمام حالات سے اطلاع دی۔ چار مہینہ کے بعد تورانشاہ ایک جرار لشکر کردوں کا لیکر قاہرہ میں آیا اور یکم محرم ۶۴۸ھ کو تخت سلطنت پر بیٹھا۔

تورانشاہ ایک سخت مزاج شاہزادہ تھا۔ اس نے اپنے باپ کے تمام ملازموں کو برطرف کیا اور اپنے غلاموں کو انکے بجائے مقرر کیا تمام رعایا و اعیان ملک اس سے ناراض ہو گئے۔ جب یہ خبریں فرانس میں پہونچیں تو ریدا پھر ایک عظیم الشان جنگی بیڑہ لیکر پہونچا اور فارسکو پر حملہ کیا۔

شجرۃ الدر کو یہ خبر سُنکر بہت فکر ہوئی کیونکہ توران شاہ کسی کام کا آدمی نہ تھا اسنے امیر حسام الدین لاچین اور امیر بیبرس بندقداری کو بُلاکر کہا کہ جسقدر تم سے فوج جمع ہو سکے جمع کر کے لیجاؤ اور دشمن کو ملک سے نکالدو۔

اس کے فرمان کے مطابق ان دونوں امیروں نے لشکر جمع کیا۔ توران شاہ نے جب دیکھا کہ لشکر جمع ہوگیا تو وہ خود بھی چلنے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ اور بڑے کرّوفر سے یہ اسلامی لشکر چلا۔ بہادر لاچین نے پہونچنے کے ساتھ ہی فرانسیسوں پر ایک بیدریغ حملہ کیا جو قیامت کا نمونہ تھا۔ ٦٧ مسلمان امراء اس معرکہ میں شہید ہوئے۔ سپاہیوں کی کچھ گنتی نہیں۔ تقریباً تیس ہزار فرانسیسی مارے گئے اور آخر کار زیدا گرفتار کر لیا گیا۔

توران شاہ کی سلطنت ایک سال رہی اور اسکے بعد جب اس نے زیادہ مظالم کرنے شروع کیے تو ملک صالح کے چند غلاموں نے اسکو مار ڈالا۔ اسکے مرنے پر ایوبی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

اس کے قتل کے بعد تمام امراء اور اعیان سلطنت نے مشورہ کر کے شجرۃ الدر کو ۲۔ صفر ٦٤٩ھ میں تخت پر بٹھایا۔ تمام قاہرہ کی آئین بندی کی گئی اور بڑی خوشیاں منائی گئیں کیونکہ اس کے عدل و انصاف سے تمام ملک مصر خوش تھا اور اس کی عقل اور دوراندیشی پر سب کو اعتماد تھا۔

شجرۃ الدر ترکی عورت تھی اسکے مزاج میں حلم و متانت۔ خودداری اور وقار بدرجۂ کمال تھا یہی وجہ تھی کہ اسکا رعب بہت تھا وہ ہمیشہ پردہ کی آڑ میں بیٹھکر دربار کرتی تھی اور بڑے بڑے امراء اور وزراء اسکے سامنے جاتے تھے تو دُور ہی سے زمین بوسی کرتے تھے۔ اسکا وزیر عزالدین ایبک ایک نہایت لائق ترک تھا۔

شجرۃ الدر نے سب سے پہلے یہ کام شروع کیا کہ بحری فوج باقاعدہ مرتب کی تاکہ ملک بیرونی حملوں سے محفوظ رہے۔ امراء اور اعیان سلطنت کو اُس نے اپنی

فیاضی سے بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں - اور تمام ملک میں وہ ہر دلعزیز ہوگئی - یہانتک کہ مسجد کے ممبروں پر اس کے نام کے خطبے پڑھے جانے لگے اور اس کے لیے دعائیں ہونے لگیں - وہ ہر ایک کام سلطنت کا اپنے پیش نظر رکھتی تھی - ممکن نہ تھا کہ عزالدین ایبک بلا اس کے مشورہ کے کوئی کام کرے - فرمانوں پر اس کا دستخط یہ ہوتا تھا

"والدہ خلیل"

ابھی اس کی سلطنت کو صرف تین ہی مہینے ہوئے تھے کہ خلیفہ بغداد ابوجعفر مستنصر باللہ کے پاس خبر پہونچی کہ مصر والوں نے ایک عورت کو اپنے اوپر حاکم بنا لیا ہے - اُنھوں نے امرا مصر کے نام ایک خط بھیجا اور اُس میں لکھا کہ میں نے سُنا ہے کہ تم لوگوں نے ایک عورت کو اپنے اوپر حاکم بنا لیا ہے - کیا ملک مصر میں کوئی مرد نہیں جو حکومت کر سکے -

یہ خط جسوقت مصر میں پہونچا تو شجرۃ الدر نے اُسی وقت نہایت خوشی کے ساتھ سلطنت چھوڑ دی - مصر کے لوگوں کو اسکا سلطنت چھوڑنا نہایت شاق گزرا - آخر اُنھوں نے یہ صورت نکالی کہ شجرۃ الدر کی شادی عزالدین ایبک کے ساتھ کر دی اور عزالدین ایبک کو تخت پر بٹھایا - اسی وقت سے مصر میں ترکی خاندان کی حکومت شروع ہوگئی -

افسوس کہ شجرۃ الدر کا خاتمہ نہایت دردناک ہوا - واقعہ یہ ہوا کہ اس کی لونڈیوں نے کسی خاص وجہ سے اسکے شوہر عزالدین ایبک کو حمام میں قتل کر دیا - اسی عداوت سے ۱۶ - ربیع الاول ۶۵۶ھ کو اس معزز ملکہ کو عزالدین ایبک کی دوسری بیوی نے مروا ڈالا اور قلعہ کے اوپر سے خندق میں پھنکوا دیا -

تین دن کے بعد اس کے غلاموں نے اس کی نعش کو تلاش کر کے حضرت سیدہ نفیسہ رحمۃ اللہ علیہا کے مزار مقدس کے پاس دفن کر دیا گیا -

کجا ایک غلام کی لڑکی اور کجا تخت شاہی اور پھر یہ انجام !!
ہی عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے   دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے

رضیہ سلطانہ

ایشیائی تاریخ کے مرقع میں رضیہ سلطانہ وہ دلچسپ اور خوشنما تصویر ہی۔ جسکو ملکۂ ہند کی اولیت کا تمغۂ مل چکا ہی۔ یہ نوجوان حسین ملکہ بلا شرکت غیرے محض اپنی خداداد قابلیت حسن تدبیر اور زور بازو سے تخت ہند پر نہایت جاہ و جلال سے جلوہ گر ہوئی۔ اس سلطانہ کے سوانح دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ طبقۂ اناث میں بھی بعض بعض بیگمات دلیری، عزم ثبات، جہانبانی، رائے، تدبیر میں مردوں سے کسی طرح کم نہیں ہوئیں، رضیہ سلطانہ ۶۳۴ھ میں تخت ہند پر بمقام دہلی اپنے بھائی کی جگہ متمکن ہوئی باپ کا نام سلطان شمس الدین التمش تھا۔ یہ علاوہ حسن و جمال ظاہری کے اکثر علوم میں دستگاہ رکھتی تھی، اپنے مذہب کی بیحد پابند تھی۔ قرآن شریف روزانہ نہایت ادب سے تلاوت کرتی۔ شاعری سے بھی ذوق تھا۔ شعر بھی کہتی۔ تخت سلطنت پر مردانہ لباس میں بے نقاب بیٹھتی۔ خود مقدمات فیصل کرتی۔ تمام فرامین اسکے قلم سے جاری ہوتے۔ سلطنت کی جزو کل کی خود نگرانی کرتی۔ میدان جنگ میں اپنی فوج کی سپہ سالار بنتی۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے قسمت کی اچھی نہ تھی۔ اس سے ایک غلطی ہوگئی جس کے طفیل میں اسکو سلطنت کے ساتھ اپنی جان عزیز سے بھی ہات دھونا پڑا۔

جب یہ تخت سلطنت پر بیٹھی ہے۔ تو نظام سلطنت میں سخت ابتری تھی۔ ارکان سلطنت خودسر تھے، قواعد و ضوابط شمسی کا دیباچہ الٹ چکا تھا۔ مگر اس نے اپنی خداداد

قابلیت اور حسن تدبیر سے تمام خرابیوں کی بیخ کنی کر کے فتنہ و فساد کی آگ کو فرو کر دیا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش نے جب گوالیار کو فتح کر کے دہلی کی طرف مراجعت فرمائی تھی، تو رضیہ کو اپنا ولی عہد کیا تھا۔ امرار دربار نے عرض کیا کہ شاہزادوں کے ہوتے لڑکی کے ولی عہد کرنے میں کیا حکمت ہے۔ تو سلطان نے جواب دیا کہ میرے فرزند لہو و لعب اور لغویات میں مبتلا ہیں وہ سلطنت کی قابلیت نہیں رکھتے۔ رضیہ اگرچہ عورت ہے لیکن حقیقت میں مرد ہے۔

یہ اپنے باپ کے وقت میں مہمات ملکی کو انجام دیتی تھی۔ بادشاہ اس کی صلاح و مشورہ بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ جب سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ہو گیا تو ۶۳۴ھ میں بعض اراکین سلطنت کے اغوا سے فیروز شاہ تخت شاہی پر بیٹھ گیا۔ اور تخت پر بیٹھتے ہی عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اس کو بھانڈوں اور مسخروں سے فرصت نہیں تھی سلطنت کے کام کو کون سنبھالتا، تمام خزانہ بیہودہ لوگوں میں صرف کر دیا۔ اور سلطنت کے کاروبار کو اپنی ماں کے بھروسہ پر چھوڑ دیا۔ وہ بیحد سنگدل اور ظالم تھی۔ اُسنے قابو پاتے ہی سلطان شمس الدین کی تمام بیواؤں کو نہایت عذاب سے قتل کیا۔ حتی کہ سلطان کے چھوٹے لڑکے قطب الدین کو بھی مار ڈالا۔

آخر کار ان بیگناہوں کا خون رنگ لایا اور چھوٹے بڑے سب فیروز شاہ سے ناراض ہو گئے۔ شاہزادہ غیاث الدین نے بغاوت کر کے خزانہ شاہی کو لوٹ لیا۔ اور نامی نامی سرداروں سے سازش کر کے دہلی کا قصد کیا۔ فیروز شاہ نے بھی فوج لیکر چڑھائی کی۔ سردار چونکہ فیروز شاہ سے بددل تھے سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ملکہ رضیہ کب چوکنے والی تھی۔ امرا کو متفق کر کے تاج شاہی اپنے سر پر رکھا۔ ۱۸ ربیع الاول ۶۳۴ھ کو فریقین میں ایک سخت معرکہ ہوا۔ فیروز شاہ گرفتار ہو کر جیلخانہ میں گیا اور چند

دن کے بعد فوت ہوگیا۔

جن سرداروں نے اسکو تخت سلطنت پر بٹھایا تھا اب وہ دوسرے شاہزادہ کی تخت نشینی کے درپے ہوئے۔ ایسی حالت میں ایک کمسن عورت کا تخت ہند پر بیٹھکر سلطنت کو سنبھال لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس بہادر ملکہ نے اپنی حکمت عملیوں سے سب کو زیر کرکے رعب و داب کا سکہ سب کے دلوں پر جما دیا۔

۶۳۷ھ میں ملک اعزالدین حاکم لاہور نے بغاوت کی، جس کی سرکوبی کے لیے خود ملکہ نے فوج کشی کی اور اس فوج کی خود سپہ سالار بنی۔ اسکا ارادہ تھا کہ باغی کو مقہور کرکے سلطنت کا دورہ بھی کرلونگی اور جو خرابیاں کہ سلطنت میں باقی رہ گئی ہیں اُن کا تدارک بھی قرار واقعی ہو جائیگا۔ جب ملکہ حدود لاہور میں پہونچی۔ حاکم لاہور بجز اطاعت کے چارہ کار نہ دیکھ کر حاضر ہوگیا۔ اُس کی خطابخشی کی۔ اور ملتان کا صوبہ بھی اُس کی گورنری میں شامل کردیا۔ ہنوز کامل طور سے ملکہ کو اس خرخشہ سے نجات نہیں ملی تھی کہ ملک التونیہ حاکم بھٹنڈہ نے یاقوت حبشی (جسکو اُس کی حسن خدمات کے صلے میں امیرالامراء کا خطاب ملا تھا) کی زیادتیوں سے تنگ آکر بغاوت کردی۔ ملکہ نے اس کی سرکوبی کے واسطے بھی خود سپہ سالار ہوکر بیشمار فوج کے ساتھ چڑھائی کی، سرداران فوج نے جو کہ یاقوت حبشی کے امیرالامراء کے عہدہ سے ناراض تھے موقع پاکر یاقوت حبشی کو قتل کرکے ملکہ کو قلعہ بھٹنڈہ میں نظربند کردیا۔ اور دہلی جاکر معزالدین بہرام شاہ کو تخت نشین کیا۔

رضیہ سلطانہ قید کی حالت میں بھی نچلی نہ بیٹھی۔ ملک التونیہ حاکم بھٹنڈہ سے عقد کرکے دہلی کے تخت کیواسطے پھر قسمت آزمائی کی۔ مگر تقدیر پلٹ چکی تھی کچھ پیش نہ گئی۔ دوبارہ پھر مقابلہ کو نہایت زور شور سے اُٹھی، چند امراے دربار کو گانٹھ لیا اور جاٹوں کا لشکر لیکر مقابلہ کیا۔ بہرام شاہ کی طرف سے اعزالدین بلبنی جو سلطان

شمس الدین التمش کا داماد اور جسکا خطاب الف خاں تھا۔ مقابل ہوا۔ نواح کستیل میں ایک سخت خونریز لڑائی کے بعد ملکہ کو شکست ہوئی۔ اگرچہ ملکہ مع اپنے شوہر کے فوج کے ہمراہ تھی، اور جان توڑ کر مقابلہ بھی کیا۔ مگر قسمت کے آگے کچھ بس نہ چلا۔ شکست فاش کھائی اور بھاگتے وقت گرفتار ہو کر ۲۵ ربیع الاول کو مع اپنے شوہر کے قتل کر دیگئی۔

مدت سلطنت ۳ سال ۶ ماہ اور ۶ روز ہے۔ نئی دہلی کے محلہ بلبلی خانے میں منشی شیر علیخاں اور جناب مولوی رشید الدین خانصاحب کے مکانات کے ایک سنگین احاطہ میں دفن ہے۔ اس احاطہ میں دو قبریں ہیں ایک رضیہ سلطانہ کی اور دوسری سجیعہ بیگم کی۔ عوام الناس اسکو رجیّ جھجی کی درگاہ بھی کہتے ہیں۔ مکان بالکل ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ اور قبروں کے تعویذ بھی دستبرد زمانہ سے ثابت نہیں۔ فاعتبروا یا اولوالابصار۔

چاند بی بی

چاند بی بی جس کی سیاسی کاردانی اور جرأت وہمت کے افسانے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے لیے مایہ فخر ہیں حسین نظام شاہ والی احمد نگر کی بیٹی اور علی عادل شاہِ اول بیجاپور کی ملکہ تھی۔ اسکا سن ولادت ۱۵۴۷ء ہے۔ بچپن کا زمانہ احمد نگر میں گزرا۔ اس کی والدہ خدیجہ سلطانہ نے اس کی نہایت اعلیٰ درجہ کی تربیت کی اور اسی تربیت کا فیض تھا کہ چاند بی بی نے ان تمام کمالات میں دستگاہ کافی بہم پہونچائی جو شاہی خواتین کے لیے باعث زینت ہو سکتے ہیں۔

علی عادل شاہِ اول بیجاپور کا عہد حکومت ۱۵۵۷ء سے ۱۵۸۰ء تک ہا۔ ۱۵۶۴ء میں عادل شاہی اور نظام شاہی فرمانرواؤں کی باہمی ناچاقیوں کا انسداد ہوگیا

اور اس رشتۂ اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے والی احمد نگر نے چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے کر دی۔ شولار کا قلعہ چاند بی بی کے جہیز میں دیا گیا۔ چاند بی بی اپنے شوہر کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ وہ امور سلطنت میں علی عادل شاہ کی مشیر خاص تھی۔ اسکے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو کر فوجی قواعد کا معائنہ کرتی تھی۔ اور بعض اوقات میدان جنگ میں بھی اس کی شریک کار رہتی تھی۔

۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ نے وفات پائی اور اُس کی وصیت کے مطابق اس کی لاولد بیگم چاند بی بی امور مملکت کی منتظم ٹھہری۔ علی عادل کا نابالغ بھتیجا ابراہیم عادل جو تاج و تخت کا وارث تھا۔ چاند بی بی کے زیر سایہ پرورش پانے لگا چاند بی بی نے اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کیا۔ اور قلمدان وزارت کامل خاں کے سپرد کیا۔ یہ شخص بیجاپور کا ایک لائق اور بارسوخ امیر تھا۔ علی عادل شاہ نے بیجاپور کو دکن کی اسلامی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور بنا دیا تھا اور اس کے عہد حکومت میں رعایا نہایت آسودہ و مرفہ الحال رہتی تھی۔

چاند بی بی کا مقصد یہی تھا کہ اپنے نامور شوہر کے عہد حکومت کی روایات کو برقرار رکھے۔ چہارشنبہ اور جمعہ کے علاوہ وہ ہر روز قلعہ میں دربار کرتی تھی۔ صغیر سن بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا اور وہ پس پردہ موجود رہتی تھی۔ وہ رعایا کی دادرسی کی پوری کوشش کرتی تھی۔ امراے حکومت کو اس نے یہ حکم دیا تھا کہ خوشامد سے باز رہیں اور ہر موقع پر اپنی سچی رائے ظاہر کر دیں۔ مہمات امور کا فیصلہ امرار کی کثرت رائے سے ہوتا تھا۔

کامل خاں جسکو اپنی قابلیت پر ناز تھا چاند بی بی کی خود مختاری کا سدباب کرنا چاہتا تھا۔ اس کی سازش کا راز جلد منکشف ہو گیا اور چاند بی بی نے اسکو وزارت سے علیحدہ کر دیا۔

کشور خاں جو ایک نہایت جری اور تجربہ کار امیر تھا۔ کامل خاں کا جانشین مقرر کیا گیا۔ لیکن اس نے بھی چاندبی بی سے مخالفت شروع کردی۔ جب چاندبی بی نے اس کو برطرف کرنے کا ارادہ کیا تو کشور خاں نے کھلّم کھلا علم بغاوت بلند کر دیا اور پردہ نشین چاندبی بی اس الزام کے ساتھ ستارہ کے قلعہ میں قید کر دی گئی کہ وہ اپنے بھائی کو بیجاپور پر حملہ آور ہونے کی دعوت دے رہی تھی۔ لیکن امراء حکومت چاندبی بی کے طرفدار تھے۔ اُنھوں نے اپنی متفقہ قوت سے کشور خاں کو خارج البلد کر دیا۔ اور چاندبی بی کو ستارہ کے قلعہ سے چھڑا کر دوبارہ عنان حکومت اُسکے سپرد کی۔ یہ واقعہ ۱۵۸۰ء کا ہے۔

کشور خاں کے قتل کے بعد وزارت کا منصب اخلاص خاں نامی ایک نہایت قابل حبشی نژاد امیر کو دیا گیا۔ لیکن بیجاپوری امراء کے دو فریق ہو گئے تھے۔ ایک دکھنی اور دوسرا حبشی اور اب انکے روزافزوں باہمی تنازعات سلطنت کے حق میں نہایت مضر ثابت ہونے لگے۔

بیجاپور کی ابتر حالت دیکھ کر ہر چہار طرف سے مخالف حکومتوں نے سر اُٹھانا شروع کیا۔ اور برار، بیدر، اور گولکنڈہ والوں نے سلطنت کی حدود میں اپنے قدم بھی بڑھانے شروع کر دیئے۔ مگر چاندبی بی نے وہ داد شجاعت دی کہ تمام مخالفانہ کوششیں ناکام رہیں۔ اور سلطنت بیجاپور کا شیرازہ منتشر نہ ہو سکا۔

۱۵۸۵ء میں چاندبی بی کے بھائی مرتضیٰ نظام شاہ نے ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ بیگم سے شادی کی۔ اور اس طرح نظام شاہیوں اور عادل شاہیوں میں جدید رشتہ قائم ہو گیا۔ چاندبی بی نے اب امور سلطنت سے دست بردار ہو کر بقیہ عمر یاد الٰہی میں صرف کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی بھاوج کے ساتھ اپنے میکے چلی آئی۔

احمد نگر میں چاند بی بی کو نہایت دلخراش واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ مرتضیٰ نظام شاہ اور اسکا بیٹا میران آپس میں برسرپیکار تھے۔ آخر مرتضیٰ نظام شاہ مقتول ہوا۔ میران کو تخت نشین ہوئے تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ امرا نے اُسکو قتل کر کے مرتضیٰ نظام کے بھتیجے کو تخت پر بٹھایا۔ مگر بیجاپور اور برار سے اس تقرر کی مخالفت ہوئی اور اگر چاند بی بی کے اثر سے صلح نہ ہو جاتی تو شاید احمد نگر تباہ ہو جاتا۔

اس تمام خانگی فساد میں چاند بی بی کی متواتر یہی کوشش رہی کہ مصالحت ہوجائے لیکن اس کی کوشش بے سود رہی اور اُسکو پے در پے صدمے اُٹھانے پڑے۔ آخر کار وہ بیزار ہو کر بیجاپور چلی آئی۔ ابراہیم عادل شاہ نے اپنی چچی کا نہایت تپاک سے استقبال کیا۔ چاند بی بی کے چلے آنے کے بعد احمد نگر کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور آپس کی ناچاقیوں کی وجہ سے اکبر کو مداخلت کا موقع مل گیا۔

صورت حال یہ تھی کہ امرا دو جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک جماعت جس کے سرگروہ میاں منجو تھے احمد شاہ کی طرفدار تھی۔ دوسری جماعت بہادر شاہ کو تخت نشین کرنے کے درپے تھی۔ یہ دونوں شہزادے صغیر سن بچے تھے۔ میاں منجو نے اپنی مدد کے لیے شہزادہ مراد کو جو گجرات میں تیس ہزار فوج کے ساتھ مقیم تھا بُلایا۔ جب شہزادہ مراد احمد نگر کے بالمقابل آکھڑا ہوا تو میاں منجو کی آنکھیں کھُلیں۔ امرا نے مشورہ کر کے طے کیا کہ سلطنت کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو چاند بی بی کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا۔

ایک بارسوخ جماعت بیجاپور گئی اور عرض معروض کی۔ چاند بی بی اپنے خاندان کی لاج رکھنے کے لیے سینہ سپر ہو گئی۔ اُسوقت اسکا سن پچاس سال کا تھا۔ لیکن اسکا جوہر شجاعت زندہ تھا۔ اُس نے دونوں شہزادوں کو اپنی نگرانی میں لیکر میاں منجو کو گولکنڈہ اور بیجاپور روانہ کیا کہ وہاں سے امداد حاصل کرے۔ اور خود احمد نگر

کے استحکام اور مورچہ بندی میں مصروف ہوگئی۔

ان کارروائیوں سے فارغ نہ ہوئی تھی کہ ۱۵۹۵ء میں شہزادہ مراد نے احمد نگر کو محصور کر لیا۔ اور کمال سرگرمی کے ساتھ احمد نگر کو تسخیر کرنے کی تدابیر اختیار کرنے لگا باہمت چاند بی بی نے مراد کی تدبیروں اور کوششوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور جب یہ خیال کیا جائے کہ اُسوقت احمد نگر کی حالت کسقدر خستہ و خراب تھی تو چاند بی بی کے عزم و تدبیر کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

ایک دن جبکہ شہنشاہی فوج نے سرنگ کے ذریعہ سے قلعہ کی دیوار میں رخنہ ڈالدیا تھا۔ چاند بی بی سبز برقع اوڑھکر شمشیر بکف اُس جگہ آن کھڑی ہوئی اور مغرب تک نہایت بیباکی کے ساتھ شہنشاہی فوج کے حملوں کو دفع کرتی رہی۔ آخر کار شہزادہ مراد نے تسخیر سے مایوس ہوکر محاصرہ اُٹھا لیا اور اپنے بعض معزز سرداروں کو چاند بی بی کے پاس اس غرض سے روانہ کیا کہ اس کی بہادری کی ثنا کریں اور اس کی جنگی کامیابی پر اسکو مبارکباد دیں۔ اور اکبر کی طرف سے چاند بی بی کو چاند سلطانہ کا خطاب عطا کیا گیا۔ لیکن امرار کے مشورہ سے چاند بی بی کو برار کا علاقہ اکبر کی نذر کرنا پڑا اور اس طرح اس باحوصلہ اور کارداں خاتون نے اپنے آبا و اجداد کے ملک کو اکبری کشورستانی کے سیلاب سے بچا لیا۔ صلح کے بعد چاند سلطانہ نے ابراہیم عادل شاہ کی مدد سے بہادر شاہ کو وارث تاج و تخت قرار دیا۔ انتظام مملکت میں مصروف ہوگئی۔

۱۵۹۷ء میں شہزادہ مراد کا انتقال ہو گیا اور اکبر نے تسخیر دکن کے لیے شہزادہ دانیال کے زیر حکم ایک زبردست لشکر روانہ کیا۔ شہزادہ کے ہمراہ خان خاناں راجہ علی خاں، راجہ جگناتھ وغیرہم تجربہ کار اور جنگ آزمودہ افسر تھے۔ چاند بی بی نے اکبری فوج کا رخ دیکھ کر سہیل خاں نامی ایک مشہور سپہ سالار کو بیجاپور سے بلایا۔ ابوالفضل نے احمد نگر کے دوسرے محاصرہ کی مفصل کیفیت لکھی ہے جسکے پڑھنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ دکنیوں نے اپنا خون پانی ایک کر دیا تھا۔ اور چاند بی بی نے بھی حسب معمول داد جوانمردی دی تھی۔ لیکن تعداد اور ساز و سامان میں فائق ہونے کے باعث انجام کار مغلوں کو فتح ہوئی۔

۱۵۹۹ء میں نہنگ خاں نے بے سبب بیڑ کی مغلیہ فوج پر حملہ کر دیا۔ اکبر کو خبر ہوئی تو نہایت برافروختہ ہوا۔ اور شہزادہ دانیال اور خانخاناں احمد نگر کو بالکل مٹا دینے کے کام پر مامور کیے گئے۔ چاند بی بی کو نہنگ خاں کی غلطی کا افسوس ہوا اور احمد نگر پر جو جرار لشکر ٹوٹ رہا تھا۔ اسکا مقابلہ بالکل غیر ممکن تھا۔ چاند بی بی بھی ذرا جھجکی اور گو وہ اپنے آبائی ملک کو بلا لڑے ہوئے اغیار کے حوالے کر دینے پر کسی طرح آمادہ نہ تھی۔ لیکن اسکے متامل رہنے سے اندرونی دشمنوں کی بن آئی۔ حمید خاں نامی ایک سردار جو چاند بی بی کا معتمد علیہ اور احمد نگر کا سپہ سالار تھا۔ چاند بی بی کے متبنی عباس خاں سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ اس عداوت کی وجہ ظاہرا اسکے سوا کچھ نہ تھی کہ عباس خاں کو چاند بی بی اپنا حقیقی بیٹا سمجھتی تھی۔

الغرض حمید خاں کو بلا کر چاند بی بی نے وہ خط دکھلایا جو اُس نے مغلیہ سپہ سالار کو لکھا تھا اور اُس کی رائے دریافت کی۔ حمید خاں نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ چاند بی بی کے ہاتھ سے خط لیکر باہر آیا اور امراء سلطنت کے سامنے باواز بلند کہا کہ "دغا! دغا!" اور وہ خط بھی پڑھکر سُنایا۔ حمید خاں کا افسوں کارگر ہو گیا۔ ہر شخص یہ سمجھ گیا کہ چاند سلطانہ مغلوں سے مل گئی ہے اور ہم سے دغابازی کر رہی ہے۔ حمید خاں ایک زبردست جماعت کو ساتھ لیکر محل میں گھس پڑا۔ چاند بی بی نے اپنا اچھا بچاؤ کیا مگر حمید خاں نے اُسکا سر اتار ہی لیا۔

عباس خاں اسوقت حاضر نہ تھا۔ جب اُسکو خبر پہونچی تو دیوانہ وار دوڑتا ہوا آیا اور قاتل کا نام پوچھ کر حمید خاں کی جستجو میں نکل کھڑا ہوا۔ عباس کی تلوار نے

چاندبی بی کے بیرحم قاتل کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پسرانہ محبت کی بھڑاس نکالی۔

چاند سلطانہ ایک زبردست شہسوار اور ایک جری و دوراندیش سپہ سالار تھی۔ بارہا اپنے شوہر کی زندگی میں اور اس کی وفات کے بعد میدان جنگ میں گئی۔ فوجوں کا انتظام کرتی تھی رموز جنگ بتلاتی تھی۔ سپاہی افسردہ دل ہو جاتے تو ہمت دلا دلا کر لڑاتی تھی۔ فن حرب کے علاوہ متعدد زبانوں کی ماہرہ تھی۔ فارسی و عربی وغیرہ میں دستگاہ وافی رکھتی تھی۔ اور تلنگی، تامل، مرہٹی وغیرہ دکن کی مروجہ زبانوں میں بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ وہ علم و فن کی بڑی قدردان تھی۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ اُس نے اپنی خواصوں میں ہر فن اور ہر علم کی جاننے والی عورتیں رکھی تھیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ لوگ علی عادل شاہ کے عموماً دشمن ہو گئے تھے۔ اور اس فکر میں تھے کہ کسی نہ کسی طرح اسکو قتل کر ڈالیں۔ علی عادل شاہ باوجود اپنی دلیری کے متوحش تھا۔ اور تین روز سے برابر جاگ رہا تھا۔ چاندبی بی نے اپنے شوہر کو دلاسا دیا اور اسکو باصرار سلا کر خود ہوشیار رہی۔ اتنے میں بالاخانے پر کسی کے آواز آئی۔ یہ بہادر خاتون فوراً اپنے شوہر کی تلوار لیکر باہر نکل آئی اور دیکھا کہ دو شخص کھڑے ہیں۔ فوراً ان پر جھپٹ پڑی اور پہلے ہی حملہ میں ایک کا سر اُڑا دیا اور دوسرے حملہ میں ایک کو سخت زخمی کر ڈالا۔ اس شور سے علی عادل شاہ جاگ پڑا۔ باہر آ کے دیکھا تو چاند تلوار لیے کھڑی تھی۔ شوہر کو دیکھ کر چاندبی بی نے کہا کہ لیجیے یہ آپ کے دونوں مہمان ہمیشہ کے لیے آپ سے جدا ہو گئے۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ چاندبی بی محافہ میں احمد نگر سے بیجاپور آ رہی تھی۔ ساتھ صرف ایک مختصر سا باڈی گارڈ تھا۔ چاندبی بی کے ہمراہی سپاہیوں اور حکومت گولکنڈہ کی سپاہ میں کہیں راہ میں تنازعہ ہو گیا اور جدال و قتال تک نوبت

پہونچی۔ چاند بی بی نے دیکھا کہ میرے ہمراہی تعداد میں بہت کم ہیں۔ فوراً محافہ سے نکل پڑی اور اپنے چیتل گھوڑے پر سوار ہو کر مصروف پیکار ہوگئی۔ اور مخالفین کو پسپا کر دیا۔

گلبدن بیگم

گلبدن بیگم سلطان ظہیر الدین محمد بابر سلاطین مغلیہ کے پہلے بادشاہ ہند کی جس کی رگوں میں وسط ایشیا کے دو بڑے جنگجو اور مشہور خاندانوں یعنی ترکوں اور مغلوں کا خون دوڑ رہا تھا، بیٹی تھی۔

اسکا باپ ۱۴۹۴ء میں بعمر ۱۲ سال مملکت فرغانہ کا وارث بنا۔ لیکن خاندانی عداوت عزیزوں اور رشتہ داروں کی دست اندازی اور دوسرے وجوہات کے باعث دس برس تک اسکو کہیں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ بالآخر ۱۵۰۴ء میں وہ کابل کا بادشاہ ہوگیا۔ اس واقعہ کے ٹھیک ۱۹ برس بعد ۱۵۲۳ء میں دلدار بیگم کے بطن سے گلبدن بیگم متولد ہوئی۔ دلدار بیگم کے حسب نسب کا کتب تواریخ میں کہیں ذکر نہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ اگرچہ وہ شاہی خاندان سے نہ تھی تاہم شریف اور اعلیٰ خاندان سے ضرور تھی۔

دلدار بیگم کے بطن سے ۵ بچے پیدا ہوئے تھے ۳ لڑکیاں گل رنگ۔ گلچہرہ اور گلبدن اور ۲ لڑکے ہندال اور الور۔ بابر کا ایک مدت سے ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ تھا اور جسوقت گلبدن بیگم پیدا ہوئی وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں مشغول تھا۔ چنانچہ سرحد کے اکثر مقامات فتح کر لیے تھے۔ جسوقت گلبدن بیگم کی عمر ۲½ سال کی تھی اُس نے ابراہیم لودی کو شکست دیکر شمالی ہندوستان کو اپنے زیر حکومت کر لیا تھا۔

بابر کے ہندوستان چلے آنے کے بعد اُس کی چہیتی بیوی ماہم بیگم نے جو ولی عہد کی ماں ہونے کے باعث سب بیویوں میں زیادہ ممتاز اور با اثر تھی۔ گلبدن بیگم اور اُس کے بھائی ہندال کو متبنّیٰ کر لیا اور اپنی زیر نگرانی اُن دونوں کی تعلیم و تربیت کرنے لگی۔ ماہم بیگم کے ان دونوں کو متبنّیٰ کرنے کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اسکے چار چھوٹے بچوں کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا تھا۔ اسلیے بابر کو بھی اس کی دلجوئی منظور تھی۔ چنانچہ اُس نے بخوشی تمام اس امر کی اجازت دیدی۔

دلدار بیگم نے بجبر و اکراہ اپنے بچوں کی جدائی منظور کی ۱۵۲۷ء میں بابر نے تمام خاندان شاہی کو کابل سے ہندوستان آنے کا حکم دیا۔ چنانچہ گلبدن بیگم بھی ماہم بیگم کے ساتھ سب قافلہ سے آگے روانہ ہو گئی۔ گلبدن بیگم کے ہمسفر ہونے سے ماہم بیگم کا وہ رنج والم جو اسکو اپنے چھوٹے بچے فاروق کی وفات سے پہونچا تھا بہت کچھ دُور ہو گیا۔ اور اس شش سالہ بچی کی پیاری اور دل لبھانے والی باتوں کی وجہ سے سفر کی تکالیف اور مصائب کچھ معلوم نہ ہوئے۔ جب یہ دونوں کول (علی گڈھ) پہونچے تو بابر نے آگرہ سے کئی پالکیاں اور بہت سے سوار استقبال کے لیے روانہ کیے اور بعد ازاں فرط محبت سے بیخود ہو کر سواری کا انتظار کیے بغیر خود بھی پیدل روانہ ہو گیا۔

آگرہ سے بہل کے فاصلہ پر نوگرام میں ملاقات ہوئی۔ دوسرے روز ۲۷ فروری ۱۵۲۸ء کو آگرہ میں یہ سب لوگ وارد ہوئے۔ بابر کے کابل سے روانہ ہونیکے وقت گلبدن کی عمر ۱½ سال کی تھی۔ اب جبکہ اسکی عمر ۶ سال کی تھی وہ اپنے باپ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ باپ نے بھی اُسے پیار کیا۔ گلے لگایا اور باتیں کیں۔ اس ملاقات کا ذکر گلبدن نے اپنی کتاب ہمایوں نامہ میں کیا ہی اور لکھا ہی کہ جو خوشی و مسرت اسکو اُسوقت ہوئی تھی وہ احاطہ بیان سے باہر ہی۔

آگرہ آنے کے چند دنوں بعد بابر ماہم بیگم اور گلبدن بیگم کو اپنے ہمراہ دھول پور لے گیا۔ جہاں اس چھوٹی بچی نے ہندوستان کے دلفریب مناظر کی سیر کی۔ زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ اس کے نازک دل پر صدمات کی پے در پے چوٹیں لگیں۔ اس کے بھائی الور کا انتقال ہوا۔ اس کے پیارے باپ بابر نے اس جہان سے کوچ کیا۔

بابر کے انتقال کے بعد گلبدن بیگم کا بھائی ہمایوں تخت نشین ہوا۔ گلبدن کے ساتھ اس کو حد درجہ محبت تھی۔ وہ تقریباً ہر روز اس سے ملنے کے لیے اس کے محل میں آیا کرتا تھا۔

۲۶۔ اپریل ۱۵۳۴ء کو ماہم بیگم بھی داغ مفارقت دے گئی۔ گلبدن کے دل پر اس واقعہ کا بڑا صدمہ ہوا کیونکہ وہ اس کے ساتھ حقیقی ماں سے کچھ کم محبت نہ کرتی تھی اور نہایت مہربانی سے پیش آتی تھی۔

اب وہ زمانہ آیا کہ ہمایوں کا ستارۂ اقبال گردش میں آگیا۔ چوسہ پر اُس نے شیر شاہ کے مقابلہ میں شکست فاش کھائی۔ وہ وہاں سے آگرہ واپس آیا اور گلبدن بیگم سے امور سلطنت کے بارے میں مشورہ کیا۔ گلبدن کی عمر اسوقت ۱۷ سال کی تھی اور اس کی شادی خضر خواجہ خان جغتائی مغل کے ساتھ ہو چکی تھی۔ ہمایوں کے گلبدن سے مشورہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوعمری کے زمانہ میں بھی وہ امور مملکت سے کامل طور پر واقف اور نہایت صائب رائے رکھتی تھی۔

جب ہمایوں کو شکست پر شکست نصیب ہوئی تو کامران خاندان شاہی کی تمام بیگمات کو ایک بڑی فوج کے زیر حفاظت اپنے ہمراہ لاہور لے گیا۔ گلبدن بیگم جس کو آگرہ سے ایک قسم کا اُنس ہو گیا تھا یہ نہ چاہتی تھی کہ وہ اس مقام کو جہاں اُس نے اپنے بچپن کے خوشگوار ایام گزارے تھے۔ چھوڑے۔ لیکن بالآخر ہمایوں کے کہنے سے

راضی ہوگئی۔ حقیقت یہ ہی کہ وہ ایک نہایت باسلیقہ۔ باتمیز اور خوش مزاج بیگم تھی اور انھیں اوصاف حمیدہ کے باعث اس کے سب بھائی اس سے کمال درجہ اُنس اور محبت کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ کامران اُس کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ یہ بھی قرین قیاس ہی کہ کامران کا مقصد اسکو اپنے ہمراہ لیجانے سے یہ ہو کہ اُسکا شوہر خضر خواجہ بھی اس کا شریک ہوجائے لاہور سے وہ اپنی ماں دلدار بیگم کے پاس چلی گئی جو اپنے لڑکے ہندال کے پاس ملتان میں تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ کابل کامراں کے پاس گئی۔ کامراں نے اُسکے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کیا اور وہ دوسری بیگمات کی طرح اُس کے ظالم ہاتھوں ذلیل و خوار نہیں کی گئی۔ کامران نے یہانتک چاہا کہ اس کی عزت اُس کی ماں سے زیادہ کرے لیکن اُس نے اس بات کو کبھی پسند نہیں کیا۔

۱۵۴۵ء میں جبکہ ہمایوں نے دوبارہ کابل فتح کیا تو گلبدن بیگم وہیں تھی۔

۲۰۔ نومبر ۱۵۵۱ء کی تاریخ بھی کیسی منحوس تھی۔ اُس دن اسکا سب سے پیارا بھائی ہندال جس سے اُس کو حد درجہ محبّت تھی کامران کے ایما سے لڑائی میں مارا گیا۔ اسکا جنازہ بجے شاہی جو گلبدن کے شوہر خضر خواجہ کی جاگیر میں تھا پہونچایا گیا اور پھر وہاں سے کابل لاکر بابر کے پائنتی دفن کیا گیا۔ گلبدن کو اس واقعہ جانکاہ کا بہت زیادہ صدمہ ہوا وہ زار و قطار روتی اور کہتی تھی کہ اگر میرا لڑکا یا شوہر اس کی بجاے مرجاتا تو مجھکو کچھ افسوس نہ ہوتا۔ حیف صد حیف! اور یہ شعر بار بار پڑھتی تھی۔

اے دریغا۔ اے دریغا۔ اے دریغ   آفتابم شد نہاں در زیر میغ

اس کے بعد اُس نے اپنی بیٹی رقیہ کی شادی ہمایوں کے لڑکے جلال الدین محمد اکبر سے کردی۔ اکبر اعظم کی یہ پہلی بیوی تھی۔ اسکے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ۸۰ سال کی عمر پائی اور اکبر کی وفات کے بعد تک زندہ رہی

کابل میں امن و امان قائم کرنے کے بعد ۱۵۵۵ء میں ہمایوں نے شمالی ہندوستان دوبارہ مسخر کیا۔ لیکن بہت جلد یہ خوشی غم سے مبدل ہوگئی۔ ۲۷۔ جنوری ۱۵۵۶ء کو زینے سے گر کے اُس کا انتقال دہلی میں ہوگیا۔

ہمایوں کے بعد اس کا نامور بیٹا اکبر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اور جب ملک میں پورے طور پر امن و سکون قائم ہوگیا تو اُس نے خاندان شاہی کو کابل سے بلا لیا۔ چنانچہ سب کے ساتھ گلبدن بھی ہندوستان آئی۔ اکبر نے اسکے شوہر خضر خواجہ کو لاہور کا گورنر مقرر کر دیا اور سکندر شاہ سوری کے قلع قمع کرنے کا کام اس کے سپرد ہوا۔ گو وہ کوئی عمدہ سپاہی نہ تھا لیکن چونکہ وہ اکبر کا پھوپھا تھا اور اس سے پہلے اعلیٰ خدمات انجام دے چکا تھا اس لیے یہ عہدہ اسکے تفویض کیا گیا۔

اس کے بعد گلبدن کی تمام زندگی نہایت عیش و آرام اور بے فکری کے ساتھ بسر ہونے لگی اور بجز ان فرائض کے جو بحیثیت ایک بیوی اور ماں کے اُس پر عائد تھے اس کی توجہ اور کسی کام کی طرف نہ رہی۔ خانہ داری کے کاموں سے اسکا جو وقت بچتا تھا اُس کو وہ شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف میں صرف کرتی تھی۔ ان مشاغل کیلیے اس کے پاس کافی سامان تھا۔ کیونکہ دورہ میں شاہی خیمہ کے برابر اُس کا خیمہ نصب کیا جاتا تھا اور تمام امورات شاہی سے وہ پورے طور پر باخبر رہتی تھی۔

اکبر گلبدن کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اور امور سلطنت میں ہمیشہ اُس سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ ۱۵۷۵ء میں جب اُس نے حج کے سفر کا ارادہ ظاہر کیا تو اکبر کو اس کی جدائی کا خیال بہت شاق گزرا اور اُس نے اُسے جانے سے باز رکھنے کے لیے بہت سی تدابیر کیں لیکن وہ راضی نہوئی۔

۱۵۔ اکتوبر ۱۵۷۵ء کو وہ مع ایک جم غفیر کے جس میں مرد اور عورتیں شامل تھیں فتحپور سیکری سے روانہ ہوئی۔ شہزادہ مراد شاہی حکم سے ان سب کو سورت تک

پہونچانے کے لیے تعینات کیا گیا۔

سورت تک یہ تمام قافلہ بخیر وخوبی پہونچکر جہاز پر سوار ہوا۔ لیکن پرتگالیوں نے جہاز کو گرفتار کر لیا۔ اور بہزار دقت یہ قافلہ زیر نگرانی باقی خاں اور رومی خاں جو بابر کے توپچی تھے روانہ ہوا اور پورے ایک سال کے بعد خلیج فارس میں پہونچا۔ وہاں سے ان لوگوں نے مکہ معظمہ کی راہ لی۔ ساڑھے تین سال تک یہ لوگ مکہ معظمہ میں رہے اور سہ مرتبہ حج کیا۔ چوتھے سال یہ سب لوگ واپس ہوئے اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے عدن پہونچے۔ عدن سے جہاز پر سوار ہوئے۔ جہاز ایک چٹان سے جا لگا۔ لیکن خدا کے فضل سے ایک اور جہاز آنکلا جسپر بایزید بیات کے بال بچے ہندوستان آرہے تھے۔ یہ بھی سب اُسپر سوار ہوئے اور ہندوستان پہونچ گئے۔

افسوس ہی کہ اُس نے اپنے سفر کے حالات قلمبند نہیں کیے ورنہ وہ اِس زمانہ کے حالات کا بہترین مرقع ہوتے۔ اور سفر میں جو مصائب و مشکلات واقع ہوتی تھیں ان کا اُس سے پتہ چلتا۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد شہنشاہ اکبر کے حکم سے اُسنے ہمایوں نامہ لکھا جو اصلی باعث اس کی شہرت کا ہوا ہی۔ افسوس ہی کہ بڑے بڑے مصنفین اور مورخین اس امر کو نہیں جانتے کہ گلبدن بیگم نے کوئی ہمایوں نامہ بھی لکھا تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اسکا ذکر تک نہیں کیا۔ لیکن اکبر نامہ میں جس میں اُس سے بہت مدد لی گئی ہی اُسکا ذکر ہی۔ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب دربار اکبری میں گلبدن بیگم کا حال لکھا ہی۔ بعد کوشش بسیار ہمایوں نامہ کا صرف ایک نسخہ برٹش میوزیم کو دستیاب ہو سکا ہی جسکو ہملٹن نے دہلی سے حاصل کیا تھا۔ اسکے آخر کے کئی ورق غائب ہیں اور شروع اور آخر میں چند سادے ورق لگے ہوئے ہیں۔ باوجود بڑے بڑے انعامات کے اعلان کے کوئی دوسرا نسخہ اسوقت تک دستیاب نہیں ہو سکا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ اس کتاب کے صرف چند نسخے ہی لکھے گئے تھے جو حوادث زمانہ

ہاتوں مٹ چکے۔

ہمایوں نامہ زباندانی کے لحاظ سے کوئی بڑے پایہ کی کتاب نہیں ہو گو وہ فارسی میں لکھی گئی ہو۔ لیکن جگہ بہ جگہ ترکی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جس کی وجہ یہ ہو کہ گلبدن بیگم کی مادری زبان ترکی تھی اور اُس زمانہ کی فارسی میں اس زبان کے الفاظ مستعمل تھے۔

تاریخی لحاظ سے البتہ وہ بہت بیش قیمت ہو۔ علاوہ قدیم اور خاص اُس زمانہ کے ہونے کے جس کا کہ اس میں ذکر کیا گیا ہو وہ گلبدن بیگم کے ہات کی لکھی ہوئی تھی جس سے زیادہ سلطنت کے اندرونی حالات سے کوئی اور دوسرا شخص واقف نہیں ہو سکتا۔

گلبدن بیگم شاعری میں بھی کمال کو پہونچی ہوئی تھی۔ اور گو بچپن ہی سے اسکی طبیعت میں ذہانت، جدت اور شوخی تھی لیکن زیادہ قابل لحاظ امر یہ ہو کہ بڑھاپے کی حالت میں جبکہ رنج والم نے اسکا بالکل کام ہی تمام کر دیا تھا اس کی قوتِ متخیلہ اتنی ہی بلند پرواز تھی اور شعر و شاعری کا مذاق بدستور اس کی طبیعت پر حاوی تھا افسوس ہو کہ اُس کا دیوان اور اُس کے اشعار دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ پس اُنکے متعلق کوئی رائے نہیں دیجا سکتی کہ اُس کے اشعار کس پایہ کے تھے۔

اپنی زندگی کے آخری ایام اُس نے زہد و تقوے میں گذارے۔ اپنی جیب خاص سے لوگوں کو روپیہ دیکر حج کرنے کو بھیجتی تھی۔

۷۔ فروری ۱۶۰۳ء میں بخار میں مبتلا ہوئی۔ حالت دن بدن خراب ہوتی گئی اسی مہینہ کی ۲۷ تاریخ کو بعد توبہ و استغفار ۸۰ برس کی عمر میں اس دارفانی سے عالم جاودانی کی راہ لی۔

تمام خاندان شاہی میں اس غمناک واقعہ نے ماتم بپا کر دیا۔ حمیدہ بانو والدہ اکبر

کو بالخصوص نہایت رنج ہوا۔ اکبر خود اس کے جنازہ کے ساتھ گیا اور اس کو کاندھا دیا۔

نور جہاں بیگم

اس بیگم کا اصلی نام مہرالنسار خانم تھا۔ جب شہنشاہ جہانگیر کے عقد میں آئی تو نور محل اسکا لقب ہوا پھر نور جہاں خطاب ہوا اور تواریخ میں اسی نام سے مشہور و معروف ہے۔

یہ بیگم طہران کے ایک اعلیٰ اور معزز خاندان کی بیٹی تھی۔ اسکا دادا خواجہ محمد شاہ ایران کا وزیر اعظم تھا اور دوسرے رشتہ دار بھی اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ خواجہ محمد شاہ کے بعد اس کے بیٹے مرزا غیاث کا ستارہ کچھ ایسا گردش میں آیا کہ نان شبینہ تک کو محتاج ہو گیا بالآخر تنگ آکر اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہنے اور تلاش معاش کے لیے ہندوستان روانہ ہونے پر مجبور ہوا۔ چنانچہ مع اپنی زوجہ دو لڑکوں اور ایک لڑکی کے ہندوستان کی جانب روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں جبکہ یہ قافلہ قندھار پہنچا نور جہاں پیدا ہوئی۔ مصائب درجہ انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ ان سب پر دو تین دن کا فاقہ تھا۔ ایسی مصیبت اور بے سروسامانی کی حالت میں لڑکی کی پرورش اور بھی دوبھر معلوم ہوئی۔ چارناچار بہ جبر و اکراہ کلیجہ پر پتھر رکھ اس رستہ پر جس سے دوسرے دن صبح کو قافلہ گذرنے والا تھا ڈال آئے اسوقت تو اس بچی کی پیدایش انکو اسقدر منحوس معلوم ہوتی تھی آہ ان کیا خبر تھی کہ یہی معصوم اور بیکس بچی ایک دن ہندوستان جنت نشان کی بلند اقبال ملکہ بننے والی ہے۔ اسقدر باکمال ہوگی کہ اپنی فراست اور دانائی کا نقشہ ہمیشہ کے لیے تاریخ کے صفحات پر چھوڑ جائیگی اور اسکا نام ہمیشہ عزت اور فخر کے ساتھ لیا جایا کریگا۔

دوسرے دن جبکہ قافلہ اس راہ سے گذرا تو ایک سوداگر کی نظر اس بچی پر پڑی اسکو رحم آیا اور وہ اس کی تربیت کا کفیل بنا۔ بعد تلاش کے نورجہاں کی ماں کو دودھ پلانے پر ملازم رکھ لیا۔

جب سوداگر کو یہ سب حالات معلوم ہوئے تو وہ ان سب کے ساتھ کمال مہربانی و لطف و عنایت سے پیش آیا اور نورجہاں کے باپ اور لڑکوں کو اپنے تجارتی کاروبار میں لگایا۔ جس سے ان کا افلاس دور ہوگیا۔

بعد ازاں اس سوداگر کے ذریعہ سے ان کی رسائی اکبر کے دربار تک ہوئی اکبر نے اسکے باپ اور بھائی کو معمولی عہدوں پر مقرر کردیا۔ جہاں اُنھوں نے اپنی اعلیٰ قابلیت کے جوہر دکھائے چنانچہ بہت جلد دربار شاہی میں اپنا رسوخ بڑھالیا اور مناصب جلیلہ پر مامور کردیے گئے۔ نورجہاں کی ماں بلا روک ٹوک محل شاہی میں آنے جانے لگی۔ نورجہاں بھی اکثر اپنی ماں کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ جب یہ لڑکی جوان ہوئی تو اسکی خوبصورتی۔ دانائی حاضر جوابی اور اعلیٰ قابلیت کا چرچا ہونے لگا۔

اکبر نے اس کا عقد ایک فارسی نوجوان شیر افگن کے ساتھ کردیا۔ شیر افگن کا اصلی نام علی قلی تھا۔ اور اسکا باپ ایران میں شاہ اسمٰعیل کے یہاں ایک اعلیٰ عہدہ پر ملازم رہ چکا تھا۔

اکبر نے بردوان کے علاقہ کا انتظام اس کے سپرد کردیا۔ جب جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا تو اسکو یہ اطلاع پہونچی کہ شیر افگن خودمختار ہونا چاہتا ہے۔

جہانگیر نے قطب الدین کو جو خواجہ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا داماد اور خود اسکا رضاعی بھائی تھا بنگالہ کا گورنر بناکر بھیجا اور شیر افگن کے ارادوں کی تفتیش کا کام اسکے سپرد کیا قطب الدین نے وہاں پہونچکر ان سب باتوں کی تصدیق کی اور شیر افگن کو اپنے روبرو طلب کیا لیکن شیر افگن نے حاضر ہونے سے صاف انکار کردیا۔ قطب الدین بذات خود

بردواں روانہ ہوا اور سیدھا شیر افگن کے مکان پر جا دھمکا۔ طرفین میں باہم سخت کلامی ہوئی اور یہانتک نوبت پہونچی کہ شیر افگن نے غیظ آلود ہو کر خنجر ابدار سے قطب الدین کا کام تمام کیا۔ یہ دیکھتے ہی شاہی سپاہی جو قطب الدین کے ہمراہ تھے شیر افگن پر ٹوٹ پڑے اور ایسے کاری زخم لگائے کہ وہ بھی جانبر نہو سکا۔

گورنر کا قتل کوئی معمولی بات نہ تھی۔ علاوہ بریں وہ شہنشاہ جہانگیر کا رضاعی بھائی تھا۔ شاہی فوج نے نورجہاں کے محل کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ نورجہاں قید کر کے جہانگیر کے روبرو دربار شاہی میں حاضر کی گئی۔ جہانگیر نے اپنی سوتیلی ماں رقیہ بیگم کی خدمت اسکے سپرد کی۔ یہ رقیہ بیگم شہنشاہ بابر کی مشہور دختر گلبدن بیگم کی لڑکی تھی۔ پس نورجہاں شاہی محل میں رہنے لگی۔

جہانگیر کے دل میں نورجہاں کی محبت نے اُسی وقت سے گھر کر لیا تھا جبکہ شیر افگن کے ساتھ اُسکا عقد نہوا تھا۔ لیکن اب جبکہ مستقل طور سے وہ شاہی محل میں رہنے لگی۔ اسکے حسن و جمال۔ اس کی حاضر جوابی۔ سلیقہ مندی۔ اور دیگر خصائل حمیدہ کو دیکھ کر جہانگیر نے اس سے شادی کی درخواست کی۔ نورجہاں پہلے تو برابر ٹالتی رہی کیونکہ شیر افگن کی موت کا اُس کے دل پر نہایت سخت صدمہ تھا۔ لیکن بادشاہ کے زیادہ اصرار کرنے سے مجبور ہو کر اس نے شادی کی درخواست کو منظور کر لیا اور سنہ ۶ جلوس جہانگیری مطابق سنہ ۱۶۱۱ء میں نہایت دھوم دھام کے ساتھ یہ شادی سرانجام پائی۔

مورخین نے اس شادی پر طرح طرح کے حاشیے چڑھائے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر نے قصداً شیر افگن کو قتل کرایا تاکہ وہ نورجہاں پر قابض ہو جائے۔ گو اس واقعہ کے ٹھیک ہونے سے نورجہاں کے کریکٹر پر کسی قسم کا دھبہ نہیں آسکتا کیونکہ شادی کے لیے اس نے آخر وقت تک اپنی رضامندی ظاہر نہیں کی البتہ بادشاہ کی ضد سے آخر کو مجبور ہوئی۔

لیکن اگر ہم اس واقعہ کو گہری نظر سے دیکھیں تو اصلیت صاف عیاں ہو جاتی ہے اگر یہ درست ہی کہ جہانگیر نورجہاں سے پہلے ہی شادی کرنا چاہتا تھا تو ہماری سمجھ مین نہیں آتا کہ اسکو کونسی بات اپنے اس مقصد کو پورا کرنے سے روک سکتی تھی۔ رہی یہ توجیہ کہ اکبر مانع تھا تو یہ بات بھی ہماری سمجھ مین نہیں آتی کہ اکبر کیوں مانع تھا کیونکہ نورجہاں ایک نہایت اعلیٰ اور شریف خاندان کی لڑکی تھی۔

توجیہہ

نورجہاں کی والدہ کو بھی جہانگیر کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی انکار نہو سکتا تھا کیونکہ جہانگیر ولیعہد سلطنت تھا۔ علاوہ بریں جب شیر افگن قتل کیا گیا اسکے بعد فوراً ہی شادی نہیں ہوئی۔ اگر اس نے اس ارادہ سے اُسکو قتل کرایا تھا تو پانچ سال تک عقد نہونے کے کیا معنی۔ غیرتمند شیر افگن کو اگر بادشاہ کے اس ایما کی خبر تھی تو ننگ و ناموس کی حفاظت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ پہلے نورجہاں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتا اسکے بعد مردانہ وار لڑکر جان دیدیتا۔

نورجہاں کی شادی جسوقت جہانگیر سے ہوئی اس کی عمر ۳۴ سال کی تھی اور مشرق کی عورتیں اس عمر میں تقریباً بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ پس ان باتوں کے ہوتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جہانگیر کی نورجہاں سے محبت کی بڑی وجہ اسکا وہ ظاہری حُسن نہ تھا بلکہ وہ اعلیٰ خصائل۔ پسندیدہ عادات۔ سلیقہ مندی۔ شیریں کلامی۔ نکتہ سنجی۔ فراست و دانائی تھی اور انھیں سب باتوں نے ملکر جہانگیر کے دل پر پورا تسلط جما لیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر افگن کے قتل کے بعد اسکے ساتھیوں کو اس امر کا شبہ ہوا اور اُنھوں نے اس قصہ کو شہرت دی پھر جب بادشاہ نے نورجہاں سے شادی کر لی تو اُن کے خیالات کو اور تقویت ہوئی اور اُن کا شبہ یقین کے درجہ کو پہنچ گیا۔ اور اس واقعہ کو مورخین نے درج کر دیا۔

شادی کے بعد نورجہاں کو وہ درجہ نصیب ہوا کہ سلاطین مغلیہ کی کسی بیگم کو

نصیب نہیں ہوا۔ فرمان شاہی پر اسکے دستخط ہوتے تھے سونے اور چاندی کے سکہ پر بادشاہ کے نام کے ساتھ اسکا نام کندہ کیا جاتا تھا۔ ایک سکہ پر یہ شعر کندہ کیا گیا تھا ؎

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
زنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

اس کے باپ کو اعتماد الدولہ کا خطاب مرحمت فرمایا گیا اور وزارت عظمی کا جلیل القدر منصب اسکے سپرد کیا گیا۔ اس کے دونوں بھائی آصف خاں و اعتقاد خاں اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیے گئے۔ غرضکہ اس کے اقتدار کی کوئی حد نہ تھی۔ جو کچھ وہ چاہتی تھی کرتی تھی اسکی مرضی ہی قانون تھی۔ بادشاہ کی طبیعت پر اسے پورا قابو حاصل تھا بغیر اسکے مشورہ و صلاح کے وہ کچھ نہ کرتا تھا اور اکثر کہا کرتا تھا کہ امور سلطنت کے انجام دینے کے لیے نور جہاں کافی ہے۔ بجز ایک جام شراب کے مجکو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

اس نے بادشاہ کے مزاج میں عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا۔ اس کی سنگدلی اور بے رحمی میں بہت کمی ہوگئی۔ شراب خوری بھی کم کر دی۔

اس کی سخاوت مشہور تھی غریب اور لاوارث لڑکیوں کی شادی کے اخراجات خود اُٹھاتی تھی۔ خانگی امور میں وہ ایک نہایت باسلیقہ عورت تھی۔ اس کی طبیعت میں خاص جدت تھی زیور لباس اور کھانوں میں اس نے طرح طرح کی ایجادیں کیں۔ گلاب کا عطر اسی کی ایجاد ہے۔

اس کی طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اسکو شعر و سخن سے بھی مناسبت تھی فی البدیہہ اشعار کہتی گھوڑے کی سواری فنون سپہ گری میں بھی اسکو کافی مہارت تھی۔

ایک بار بادشاہ شکار کھیلنے کے لیے گیا۔ نور جہاں بھی اسکے ہمراہ تھی۔ قراولوں نے پہلے سے چار شیر گھیر رکھے تھے۔ نور جہاں نے شیروں پر گولی چلانے کی اجازت بادشاہ

سے طلب کی۔ بادشاہ نے بخوشی منظور کیا۔ حکم شاہی پاتے ہی دو شیروں کا دو گولیوں سے کام تمام کر دیا اور دو شیروں کو تیروں سے گرا دیا۔ یہ پھرتی۔ جواں مردی اور نشانہ بازی دیکھ کر بادشاہ اور اُس کے سب ہمراہی دنگ رہ گئے۔ بادشاہ نے فوراً ایک ہزار اشرفیاں نثار کیے جانے کا حکم دیا۔ اور ایک انگشتری سچے الماس کی جس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ تھی اس صلہ میں بیگم کو مرحمت فرمائی۔

اس نے اپنی چھوٹی لڑکی کا (جو شیر افگن سے تھی) عقد جہانگیر کے سب سے چھوٹے لڑکے شہریار سے کر دیا۔ اسوقت تک وہ شہزادہ خرم کے ساتھ نہایت محبت اور مہربانی سے پیش آتی رہی لیکن اس شادی کے بعد اس نے کوشش کی کہ شہزادہ خرم کو ولیعہدی سے معزول کر کے شہریار کو ولیعہد بنادے تاکہ جہانگیر کے بعد بھی اس کی قوت و اقتدار میں فرق نہ آوے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے خرم کو قندھار کی مہم پر روانہ کیا اس کی فوج میں تخفیف کیے جانے کا حکم بھیجا۔ اس کی جائداد ضبط کر کے شہریار کو عطا کر دی اور اُسے حکم بھیجا کہ اسی قیمت کی ایک دوسری جائداد اپنے لیے خرید لو۔ ان سب باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاہجہاں نے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

شہزادہ خرم کی قوت کو کمزور کرنے اور بغاوت فرو کرنے کا کام اس نے مہابت خاں کے سپرد کیا۔ یہ شخص کابل کا گورنر تھا اور اکبر کے زمانہ میں اعلیٰ عہدوں پر رہ چکا تھا۔

جب مہابت خاں بغاوت کو فرو کر چکا اور خرم نے بالآخر باپ کے آگے سر اطاعت خم کیا۔ اب نورجہاں کو مہابت خاں کی اس بڑھتی ہوئی قوت سے خوف پیدا ہوا۔ پس اُس نے اس کے اقتدار کو کم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ مہابت خاں پر چند الزامات لگا کر جواب دہی کے لیے دربار شاہی میں طلب کیا۔ مہابت خاں نے اول تو حیلہ کیا لیکن بالآخر مجبور ہو کر پانچہزار راجپوتوں کی جمعیت کے ساتھ حضور شاہی میں آیا۔ جہانگیر

اسوقت کابل کی جانب جا رہا تھا اور اُس کا خیمہ دریائے جہلم کے کنارہ نصب تھا۔ شاہی فوج دریا کو عبور کر چکی تھی۔ بادشاہ مع چند ساتھیوں کے باقی رہ گیا تھا۔

مہابت خاں کو پورا یقین تھا کہ میں ذلیل و خوار کیا جاؤنگا۔ پس اس نے موقع کو غنیمت جان کر راجپوتوں کی فوج سے بادشاہ پر حملہ کیا اور اس کو اپنی حراست میں لے لیا۔

نورجہاں کو اس واقعہ کا نہایت صدمہ ہوا لیکن ایسے آڑے وقت میں بھی اُس نے اپنی دوربینی اور دانائی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ مہابت خاں کے پنجے سے نکل کر ایک چھوٹی کشتی میں سوار ہو کر دریا کی دوسری جانب جا پہنچی۔ وہاں پہونچکر اس نے شاہی فوج کو بہت سخت و سُست کہا اور افسروں کو بلا کر لعنت و ملامت کی کہ تم نے جیتے جی بادشاہ کو دشمنوں کے حوالہ کر دیا۔

تمام فوج کو تیار کیا خود تیر و کمان لیکر ہودہ میں بیٹھی اور سب سے پہلے اپنا ہاتھی دریا میں ڈالا ایک طرف سے جہاں دریا پایاب تھا فوج نے دریا کو عبور کیا۔ پانی کی رَو تیز تھی۔ جا بجا گڈھے تھے۔ فوج کے بہت سے آدمی ڈوب کر مر گئے۔ بارود سب بھیگ گئی۔ باقی ماندہ فوج بہادر راجپوتوں سے مقابلہ کی تاب نہ لا کر فرار ہو گئی۔

خود نورجہاں کا ہاتھی زخمی ہوا۔ فیلبان قتل ہوا۔ شہریار کے بچے جو اسکے ساتھ ہودہ میں تھے زخمی ہوئے۔ مجبوراً نورجہاں نے بھی اپنے تئیں مہابت خاں کے حوالہ کیا اور جہانگیر کے ساتھ قید میں چلی گئی۔ وہاں پہونچکر پہلے اس نے اپنے برتاؤ سے مہابت خاں پر اس امر کے اظہار کی کوشش کی کہ وہ اور بادشاہ دونوں اس قید میں بہت خوش ہیں۔ اور وہ کسی قسم کی خفیہ سازش کا ارادہ نہیں رکھتے۔ اسکے طرز عمل نے مہابت خاں کی آنکھوں پر پردہ ڈالدیا اور وہ ان کی حفاظت سے غافل ہو گیا۔ بعد ازاں اُس نے خفیہ طور پر چند ملازم رکھے جو افغانیوں کو بادشاہ کی حمایت میں اُٹھنے کے لیے اُبھارتے تھے۔

مہابت خاں کا راجپوتوں کے ساتھ عمدہ سلوک افغانیوں کو بہت ناگوار تھا اسلیے وہ سب نورجہاں کے شریک ہو گئے اور موقع کے منتظر رہے۔ ایک دن اس نے اپنی ذاتی فوج کا معائنہ کیا قواعد کے اثنار میں شاہی فوج بادشاہ اور نورجہاں کے چار طرف آگئی پھر یہ سب فوج راجپوتوں پر ٹوٹ پڑی اور انھیں شکست دیدی۔

مہابت خاں نے بھاگ کر قریب کے کسی شہر میں پناہ لی اور اپنے قصوروں کی معافی چاہی۔ اس کی درخواست اس شرط پر منظور ہوئی کہ وہ شہزادہ خرم کا مقابلہ کرے اور اُسے شکست دے۔

جس طریقہ سے اس نے بادشاہ کو قید سے رہائی دلائی اس سے اسکی کمال عقلمندی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ عرصہ تک بادشاہ زندہ نہیں رہا۔ ۲۵۔ اکتوبر ۱۶۲۶ء کو بمقام لاہور بعارضہ ضیق النفس اس دار فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی اور نورجہاں کے باغ میں دفن کیا گیا اسکے انتقال کے ساتھ ہی نورجہاں کی قوت و اقتدار اور عیش و راحت کا خاتمہ ہو گیا۔

بادشاہ کے انتقال کے بعد شہریار کی جانشینی کا اعلان کیا گیا لیکن خرم کے آتے ہی سب نے اُس کو چھوڑ دیا۔ شہزادہ خرم شاہجہاں کے لقب سے سلطنت پر بیٹھا۔ اُس نے نورجہاں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا اسکا کمال ادب ملحوظ رکھتا تھا۔ ۲۵ ہزار پونڈ سالانہ اسکا وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن نورجہاں کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ اور دنیاوی عیش و عشرت سے اس کی طبیعت ہٹ گئی تھی۔ جہانگیر کے انتقال کے بعد گیارہ برس سفید کپڑے پہنکر سوگ میں گزارے۔ ۱۶۴۶ء میں بہتّر برس کی عمر میں سفر آخرت اختیار کیا اور اپنے شوہر کے قریب مدفون ہوئی۔

اس کے مقبرہ کی خراب و خستہ حالت یاس و حسرت و بیکسی کی ایک زندہ تصویر ہے اس پر نہایت دردناک اشعار تحریر ہیں منجملہ ان کے ایک شعر یہ ہے ؎

برمزارِ ما غریباں نے چراغ نہ گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

یہ سب اشعار دنیا کی بے ثباتی کو ظاہر کرتے اور اُن لوگوں کے لیے جو دنیاوی عیش و عشرت میں غرق ہیں نہایت سبق آموز ہیں۔

ملکہ جودہ بائی

ہماری اکثر ناظرین بہنیں۔ خصوصاً تاریخی مذاق رکھنے والی بیویاں مہارانی جودہ بائی کے نام نامی سے ضرور واقف ہونگی۔ تاہم عجب نہیں ہی کہ ان کی اخلاقی خوبیاں اور سوشیل قابلیتیں۔ جو زمانہ سوانح عمری کی گویا جان ہیں۔ بہت کم بیویوں کو معلوم ہوں۔ کیونکہ جس طرح اور صدہا قابل و ممتاز عورتوں کے لائق تذکرہ واقعاتِ حالات ہماری مورخ صاحبوں کی توجہ کے شرمندہ احسان نہیں ہیں۔ اسی طرح اس نامور ملکہ ہندوستان کے مفصل حالات زندگی بھی عام تاریخی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ لیکن باوجود تاریخ کی اس افسوسناک پہلوتہی کے، اور باوجود اسکے کہ رانی ممدوحہ کے زمانہ کو کئی صدیاں گزر گئیں کیا سبب ہے کہ رانی جودہ بائی کا نام آتے ہی یہ معلوم ہوتا ہی گویا کل کی بات ہی۔ بلاشبہ جودہ بائی ایسے گھر کی بیٹی اور ایسے ہی گھر کی بہو تھیں جو اپنے اپنے زمانے میں اس کے مصداق تھے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ان کی یادداشت کے لیے چند رنبسی خاندان کی راج کنواری اور خاندان تیموریہ کے ایک شاہنشاہ کی پاٹ رانی ہونا کافی ہی۔ مگر اسکا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہی کہ اُس باعصمت

شوہر پرست، خوش سیرت، دانشمند اور عظیم الشان رانی نے اپنی کریکٹر میں ہمارے لیے
ایسی سبق آموز اخلاقی اور تمدنی مثالیں قائم کی ہیں جو کسی طرح بھولنے کے قابل نہیں
ہیں۔ اور اگرچہ وہ امتداد زمانہ کے پردہ میں چھپی ہوئی ہیں مگر باریک بین نگاہیں انکے
نتیجہ خیز ہونے سے انکار نہیں کر سکتیں۔

رانی جودہ بائی اگرچہ ایک ہندو شاہی خاندان کی راج کنواری تھیں مگر جب ایک
مسلمان شاہنشاہی خاندان میں بہو بنکر آئیں تو انھوں نے اپنے اس اہم فرض منصبی کو اس
خوبی سے نبھایا جس طرح ایک فرزانہ و نیک باطن ملکہ نبھا سکتی ہے۔

رانی جودہ بائی کی سوگرانی صرف ان کی صفات حسنہ اور اخلاق حمیدہ ہی کی وجہ سے
قیمتی اور درخشاں نہیں ہے۔ بلکہ ہندو مسلمانوں کے باہمی پولیٹکل اور سوشیل تعلقات کے
لحاظ سے بھی بہت کچھ قابل یادگار ہے۔ اپنی ہم رتبہ رانیوں کی طرح اس دانشمند رانی کا وجود
مسعود بھی ان دو متضاد قوموں کے بیچ میں ایک ایسا حلقہ بن گیا تھا جو دو زنجیروں کو آپس میں
ملا کر اُن کی قوت کو دوگنا کر دیتا ہے۔ یا حرف مشدد تھا جس نے اپنے دونوں پہلوؤں کو
فیض پہنچا کر ملکی قوت کو مکمل کر دیا تھا۔ افسوس کہ جو مفید و خوشگوار ارتباط و اعتبار کئی سو
برس تک ہندو مسلمان دونوں قوموں کو بے انتہا فائدہ پہنچاتا رہا وہ اب ناسمجھی اور خود غرضی
کے ہاتھوں کیسا رائیگاں ہو رہا ہے۔

خاندان و پیدائش
تعلیم و تربیت

رانی جودہ بائی۔ راجہ مالدیو کی پوتی۔ والی جودھپور کی بیٹی۔ راٹھور
خاندان سے تھیں جو راجپوتوں کے اعلیٰ خاندانوں میں سے ایک خاندان
ہے۔ رانی صاحبہ کی تاریخ و سن ولادت بتلانے سے میں تو کیا جتنی تاریخیں میری نظر سے
گزری ہیں سب عاجز ہیں۔ اسی طرح تعلیم و تربیت کا بھی صحیح صحیح حال معلوم نہیں۔
ہاں محل کے بعض اندرونی واقعات جو بزرگوں کی زبانی سُننے میں آتے ہیں وہ
ایسے ہیں کہ جن سے یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ یہ رانی ہرگز کودن اور بے پڑھی لکھی نہ تھی بلکہ اعلیٰ درجہ

کی شائستہ متین - حاضر جواب اور تیز طبیعت تھی - تیزی کے ساتھ مزاج میں چونچلاپن اور شوخی بھی بیحد تھی - جو اپنی حریف غالب نورجہاں بیگم جیسی فرزانہ ومشہور روزگار سوکن کو بآئین شائستہ نیچا دکھانے کو ہر وقت تیار رہتی تھی -

معیار تعلیم کے بارے میں گو تردد ہو - مگر اس میں شبہ نہیں کہ تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پائی ہوگی - اس لیے کہ اُس زمانہ کی زندگی میں - جس میں قابلیت دکھانے کا زیادہ موقع ہوتا ہی بہت سے تمدنی معاملات و مراسم کی تراش خراش - اوقات کی پابندی اپنے درجہ عظمت وقار کا قائم رکھنا وغیرہ وغیرہ جسکا ذکر آیندہ برمحل آئیگا - بغیر اعلیٰ تعلیم وتربیت یافتگی کے ناممکن ہی - اسکے علاوہ اعلیٰ تربیت یافتگی یوں بھی قرین قیاس ہی کہ جب اُس زمانہ میں ادنی غریب لوگ جو محض جاہل ہوتے تھے علما و فضلا کی صحبت میں بیٹھ کر اس زمانہ کے معمولی پڑھے لکھوں سے بہتر ہو جاتے تھے - چار دیواری کی بیٹھنے والی معمولی بیویاں اپنی طبیعت داری سے اعلیٰ طبقہ کی بیگمات کی صحبت پاکر ہوشیار ہو جاتی تھیں تو ایک والی ملک مہاراجہ کی پیاری بیٹی کو اعلیٰ تربیت میسر آنی بالکل لگتی لگائی بات ہی -

شادی یہ رانی شاہنشاہ اکبر کی بہو - اور شہزادہ سلیم الملقب نورالدین جہانگیر کی بیاہتا بیوی ہیں - خاندان تیموریہ میں کئی رانیوں کو بہو بننے کا فخر حاصل ہوا - مگر جس مان مہت اور چاؤ چونچلوں سے یہ رانی آئیں وہ کسی کو بھی نصیب نہیں ہوا - رانی جودھ بائی سہرے جلوے کی دلہن اور پنچوں کی دی ہوئی ایسی ہی بہو تھیں جنکو گھر کی نیو کہتے ہیں -

ہندوستان کی رسم کے مطابق ان کی خواستگاری اُنکے باپ سے خود شاہنشاہ اکبر نے بڑی تمنا کے ساتھ اسوقت کی جبکہ نورالدین جہانگیر عالم شہزادگی میں تھے - اور راجہ سے وعدہ کیا کہ میں خود بیاہنے آونگا - اور جس طرح ساس سسرے اپنے برابر کی بیٹیوں کو بیاہ کر لیجاتے ہیں اسی طرح وداع کرکے اپنے گھر لاؤنگا - راجہ نے اپنے شہنشاہ وقت کی

اسقدر افزا و ہمسرانہ درخواست کو دل و جان سے منظور کر کے بڑی دھوم سے شادی کا سامان کیا۔ جہاں پناہ مع شہزادوں اور چیدہ سرداروں کے جودھپور تشریف لے گئے۔

اسوقت اکبری کیمپ کا جاہ و جلال جس میں شادی کی گھما گھمی اور چہل پہل سونے پر سہاگہ تھی۔ قابل دید ہوگا۔ مارواڑ کا ریگستان گلزار بنا ہوا ہوگا۔ راجہ کی طرف سے قرب و جوار کے رجواڑوں۔ بھائی بھتیجوں۔ اور تمام برادری والوں کو بلاوے بھیجے گئے۔ اور جیساکہ اہل ہنود کا دستور ہے کہ برات کو کئی کئی دن تک دعوت دیتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہ کی بھی خدم و حشم اور بھیر بھنگے سمیت کئی دن تک بڑے تکلف کے ساتھ ضیافت کی گئی۔

راجہ کے محل میں عظیم الشان منڈھا چھوایا گیا۔ جسکا سونے کا کلس دُور دُور سے نظر آتا تھا۔ منڈھے کے نیچے اُس شاہی جوڑے یعنی دولہا دلہن کے تمام مراسم شادی ادا کیے گئے۔ یہ وہی منڈھا تھا جسکا تعریفی گیت (جو منڈھے ہی کے نام سے مشہور ہے) آجتک دلّی کی ڈومنیاں اور ارباب نشاط دلہن کے گھر میں ہنگام وداع وقت کی راگنیوں میں بڑے درد سے گا گا کر جہانگیر و جودہ بائی کی شادی کا سماں باندھا کرتے ہیں خصوصاً خاندان تیموریہ کے بچے کھچے اُجڑے ہوئے گھروں میں اب بھی جسوقت دلہن داع ہونے لگتی ہے تو وہی منڈھا گایا جاتا ہے۔ خدا جانے کس بلا کی تاثیر اس منڈھے کے بولوں میں ہے کہ دلہن والے تو آٹھ آٹھ آنسو روتے ہی ہیں۔ دولہا والے بلکہ بعض رقیق القلب دولہا بھی اُسپر آبدیدہ ہوجاتے ہیں۔ چونکہ یہ منڈھا دراصل ایک بہت بڑی شادی کی یادگار ہے اسلیے اسکے کچھ بول یہاں لکھنے بموقع نہونگے۔

منڈھا

(۱) پربت بانس کٹا مورے بابل۔ نی کا منڈھا چھوا دُرے

(۲) منڈھے اوپر کلس براجے ۔ دیکھیں راجہ راؤ رے ۔ پربت الخ

(۳) مہاری رے بیٹی تہارے محلوں کی چیری ۔ ہم باندغلام رسے ۔ پربت الخ

(۴) تہاری رے بیٹی مہارے محلوں کی رانی ۔ تم صاحب سردار رے ۔ پربت الخ

اس میں کچھ انترے اور بھی ہیں جو زائد سمجھ کر چھوڑ دیئے گئے ۔

بزرگوں در بزرگوں کی زبانی روایت ہے کہ اس شادی میں ہندوی اور اسلامی دونوں قطع کے مراسم ادا کیے گئے تھے ۔ جب رخصت کا وقت ہوا ۔ اور دلہن کو نالکی میں سوار کرایا گیا تو دلہن کے باپ مہاراجہ جودھپور نے اپنی لڑکی کے خسر شاہنشاہ اکبر کے آگے ہاتھ باندھکر نہایت عجز و انکسار کے الفاظ عرض کیے ۔ اور بادشاہ کے بہ نفس نفیس تشریف لانے اور اعزاز کے ساتھ بیاہ لے جانے سے ہچشموں میں جو عزت افزائی ہوئی تھی اسکا شکریہ ادا کیا ۔ اکبر نے بھی اس عقیدت و وفاداری کا نہایت تلطف آمیز اور قدر افزا جواب دیا یہ دونوں سوال و جواب منڈھے کے انترے نمبر ۳ و ۴ میں بڑی خوبی سے بیان ہوئے ہیں جنسے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رانی جودہ بائی دلہن بنی ہوئی نالکی[ل] میں سوار ہیں ۔ شہزادہ سلیم دولھا بنا ہوا ہے ۔ اکبر بادشاہ اور مہاراجہ جودھپو دونوں نالکی کے پاس کھڑے ہیں ۔ ایک طرف اپنی پالیسی کی کامیابی کا سرور ۔ بہو بیاہ کر لیجانے کی خوشی اور شاہانہ الطاف و کرم کا جوش ہے ۔ دوسری طرف شاہنشاہی ہمرانہ سربلندی کے ساتھ بیٹی بیاہ دینے کا مسرت آمیز رنج اور ادب آمیز عقیدت کا اظہار ہے ۔ غرض طرفین کے شاہی جذبات شادمانی و یگانگت

ل نالکی تعزیہ کی قطع کی سواری ہے جو تزک شاہی میں داخل تھی ۔ اسکا کلس سونے کا اور رنگ سنہری زنگ رغن دار کا ہوتا تھا ۔ اسکے نیچے چار ڈنڈے ہوتے تھے ۔ ہر ڈنڈے میں چار کہار لگتے تھے ۔ آٹھ کہار آگے کی طرف ہوتے تھے آٹھ پیچھے کی جانب ۔ یہ سواری بادشاہ بیگم کے لیے مخصوص تھی ۔ یا بادشاہ جس بیوی کو یا جس دار کو عطا فرماتے تھے وہ بیٹھ سکتا تھا ۔ شاہی خاندان کی بیٹیاں دلہن بنکر برات اور چوتھی کے دن ہی میں بیٹھ کر جاتی تھیں ۔ بادشاہ کے ہاں سے انکے لیے نالکی آجاتی تھی ۔

کے ساتھ گلے مل رہے ہیں۔ شاہنشاہ اکبر نے راجہ کو صرف زبان ہی سے یہ جواب نہیں دیا بلکہ شہزادہ سلیم کو اشارہ کیا کہ نالکی کا ایک ڈنڈا اٹھائیے۔ اور دوسری طرف کا ڈنڈا خود کندھے پر رکھ کر نالکی کو اٹھا لیا۔

بادشاہ کی اس حرکت کے ساتھ ہی تمام امرا و اراکین سلطنت نالکی کی طرف جھک پڑے ہر سردار یہی چاہتا تھا کہ بادشاہ اور شہزادہ سے ڈنڈا بدلوانے میں سابقت میری طرف سے ہو بڑے بڑے راجہ و مہاراجہ اور سرداران گرامی قدر باری باری سے اپنی اس جاں نثارانہ ڈیوٹی کو کہ جس میں کمال درجہ کی شاہانہ عزت اور سچے آرزو ارمان کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں بجالائے۔ کہاروں کے اٹھانے کی تو نوبت بھی نہ آئی ہوگی۔ کیونکہ یہ معزز کہار ہی اتنے سارے تھے (جن میں غالباً خود دلہن کے والد صاحب بھی شریک تھے) کہ دو دو ہی قدم کے اٹھانے پر دلہن کی نالکی خیمہ شاہی تک پہنچ گئی ہوگی۔ درحقیقت یہ ایسی شاہانہ نوازش و خسروانہ قدر افزائی تھی جو سوائے راجہ جودھپور کے اور کسی کو نصیب نہوئی۔ اور اللہ رے رانی جودہ بائی کی قسمت کا زور! کہ جس جرار بادشاہ کی تلوار کے آگے چاند اور سورج تک سر جھکاتے تھے (چندر بنسی اور سورج بنسی خاندانوں سے مراد ہے) روز ازل میں گویا یہ حصہ ہو چکا تھا کہ یہ اقبالمند لڑکی اُس کے اور اُس کے جگر گوشہ کے کندھوں پر سوار ہوگی۔

راجہ نے اپنی رانی کے سسرال والوں دونوں کی شان کے موافق بیٹی کو خوب دل کھول کر جہیز دیا۔ نقد و جنس۔ ساز و سامان۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ دیہات و جاگیر کے علاوہ (جو قوی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ضروری ہوگی) تمام وہ کارخانہ امارت جو شاہی لوازمات میں داخل تھے اور جو راجہ کی سرکار میں رانی جودہ بائی کے لیے علیحدہ مقرر تھے۔ جہیز میں لڑکی کے ساتھ دیئے۔

ان لوازمات میں رانی کی چیریوں (جنکی تعداد سینکڑوں تھی) گائنوں اور نائنوں وغیرہ وغیرہ مختلف اہل خدمت کے علاوہ پرمہتنیاں اور دل بہلانے والی سہیلیاں

اور مصاحبین بھی تھیں - یہ سہیلیاں اور مصاحبین سردار زادیاں اور ٹھاکر زادیاں تھیں - ان سب کی بھیڑ بھاڑ بجائے خود ایک چھوٹا سا لشکر تھا - کیونکہ جو شریف لڑکیاں رانی کی رفاقت میں دارالخلافہ آئی تھیں - اُنکے کُنبے کے کُنبے ان کے ساتھ ترک وطن کر کے یہاں آ گئے تھے - جن کی نسل پشت در پشت پھیل گئی - گو بعد میں یہ تمام لوگ مسلمان ہو گئے - اور مسلمان ہونے کے بعد ان میں خلط مبحث واقع ہو گیا - مگر اب تک ان لوگوں کی اولاد جو رانی کے رفقا میں سے تھے اپنے تئیں دیگر اہل خدمات کی اولاد سے افضل و ممیز سمجھتے تھے اور اپنی قوم کو راجپوت کہتے تھے - خاندان تیموریہ کے بالکلیہ مٹنے کے زمانہ تک ان لوگوں کی تعداد دلّی میں صدہا کے شمار میں موجود تھی - اور ان کے تمام تعلقات قلعہ اور اہل قلعہ سے وابستہ تھے -

راجہ نے جو لوگ رانی جودہ بائی کے جہیز میں دیئے تھے اُن کو بادشاہ کی سرکار سے دیہات اور زمینیں عطا ہوئیں - چنانچہ اُن لوگوں کے جو رشتہ دار اُن دیہات میں ہیں وہ ابتک اُنسے متمتع ہیں - اور اس زمانہ میں جو لوگ ۵۷ء کے بعد مر کھپ کر باقی رہ گئے تھے ہمارے سامنے بھی اُن کی رشتہ داری کے تعلقات اُن دیہاتی لوگوں سے باقی تھے شاہنشاہ اکبر جیسے حوصلہ مند بادشاہ نے اپنی پیاری بہو کے تمام کارخانہ جات کو صرف بحالہ قائم نہیں رکھا - بلکہ اُن میں اور اضافہ کر دیا - چنانچہ روایۃً سُنا ہے کہ اگرچہ رانی جودہ بائی نے تبدیل مذہب کر کے اپنی خوشی سے اسلام قبول کر لیا تھا - مگر اکبر جیسے بے تعصب سُسرے نے اُنکے واسطے علیٰحدہ ایک عالیشان مکان بنوا دیا تھا جس کے جھروکوں میں سے رانی سورج کے درشن کر سکتی تھیں - اور یہ بھی سُنا ہے کہ سوا پہر دن چڑھے تک رانی اُس جھروکہ میں بیٹھ کر روزانہ بہت کچھ دان پن کیا کرتی تھیں - یہ تمام خرچ شاہی خزانہ سے اُنکے لیے مقرر تھے -

رانی جودہ بائی کی شادی کے واقعات اس شرح و بسط کے ساتھ کسی تاریخ میں آپ کی

نظر سے نہیں گزرینگے۔ لیکن یہاں میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ گھریلو اور خانگی واقعات و بیانات کی بنا پر لکھا ہے۔ کیونکہ اندرون محل کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جنکا کسی تاریخ میں تذکرہ نہیں ہے۔ اور ہمارے ہاں وہ روایتیں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی چلی آئی ہیں۔ اول تو اپنے گھر کی بات۔ دوسرے بہت سے قرائن ایسے ہیں جنسے ان واقعات کی تصدیق ہوتی ہے۔

مثلاً اسی کی شادی کی یادگار کے دو گیت ایسے ہیں جو میں نے خود خاص اُن لوگوں کی نسل کی عورتوں سے گاتے ہوئے سُنے ہیں جن کو میں اوپر بیان کر آئی ہوں کہ رانی صاحبہ کے ساتھ آئے تھے۔ ایک گیت تو یہ ہے ؎ سکھی ری مورا بنرا تو آیا سلطان الخ۔

اور دوسرا یہ ہے "میں تو تمہارے ڈیرے آئی رے جلاّ۔ الخ (جلاّ اکبر سے مراد ہے)

دوسرا گیت تمام راجپوتانہ میں آجتک گایا جاتا ہے۔ اور وہاں اتبک اکبر کو جلاّ جی کہتے ہیں۔ گیتوں کی دلیل مشکوک نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ ہند کا طریقہ ہے۔ چنانچہ جب تسخیر دکن کے ارادہ سے حضرت عالمگیر اپنی تمام چیدہ فوج کو دکن لے گئے۔ اور وہانکے قیام نے اسقدر طول کھینچا کہ بارہ برس گزر گئے۔ تو فوجی سرداروں اور سپاہیوں کے قبائل اور بیوی بچّے اپنے اپنے مردوں کے دیکھنے کو سخت بیچین ہوئے۔ اور اُنھوں نے اُنپر آنے کے تقاضے شروع کیے تو اُنھوں نے اپنی مجبوری کے خطوط لکھے۔ ان نامہ و پیام کے مضامین کو ذیل کے چند ہندی اشعار میں جس خوبی سے بیان کیا گیا ہے وہ اُس زمانہ کی تصویر کو آنکھونکے سامنے کر دیتی ہے ؎

دلی شہر سہاونا اور کنچن برسے نیر	سب کے کنتھ بٹور کر لے گئے عالمگیر
صاحب کی منتی کرو۔ اور من میں راکھو دہیر	اب کے بچھڑے جب ملیں جب پلٹیں عالمگیر

دلّی میں برسات کے موسم میں ایک ملار گایا جاتا ہے۔ اُس میں بھی دلّی والی بیویوں کے اسی زمانہ کے انتظار کو کیسی اچھی طرح بیان کیا ہے ؎

چھپر پرانے ہو گئے۔ کڑکن لاگے ہیں بانس۔ اے ہو جو پیا آؤں کہہ گئے۔ آؤں آؤں کہہ گئے۔ آئے نہ بارہ مانس۔ اے ہو جو الخ" غرض گیتوں سے کھوج کالنا غلط نہیں ہے۔

ہندو مسلمانوں پر اس شادی کا اثر

کیا زمانہ کا انقلاب ہی۔ کہتے ہیں کہ بعض راجپوت اب جودہ بائی کی شادی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ باعث ہتک خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ بیٹی نہیں بلکہ ہمارے ہاں کی لونڈی تھی۔ لاحول و لاقوۃ۔ بھلا اکبر ایسا مورکھ نادان تھا کہ جسکے ہاں بغیر خواہش بڑی بڑی رانیوں کے ڈولے آئے۔ وہ جل میں آکر ایک لونڈی کو کندھے پر بٹھا کر بیاہ لاتا! خیر کوئی کسی نظر سے دیکھے۔ ہمارے نزدیک تو یہ شادی قران السعدین سے کم نہیں تھی۔

بلاشبہ اس سے پہلے بھی ہندوؤں کے ہاں مسلمانوں کے اس قسم کے تمدنی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ شاہنشاہ اکبر نے خود راجہ بہارامل مہاراجہ جیپور کی بیٹی سے شادی کی۔ جودہ بائی کے علاوہ کچھواہہ خاندان کی ایک دوسری رانی خود جہانگیر کے حبالۂ نکاح میں آئی۔ مگر یہ رشتہ شادی کی دھوم دھام کے سبب سے کچھ اور حیثیت رکھتا تھا۔

ان تمام ازدواجوں نے ہندو مسلمانوں کے ملکی و تمدنی تعلقات پر جو گہرا اور دیرپا اثر ڈالا وہ دونوں کے حق میں نہایت مبارک تھا۔ مسلمانوں اور ہندوستان کے باشندوں خصوصاً راجپوتوں میں جو مغائرت و نفرت چلی آتی تھی۔ اور جو باوجود لگاتار کوشش کے بالکلیہ دور نہوتی تھی۔ اسکا مزے در مزے خاتمہ ہو گیا۔ ہندوؤں کے وجود۔ انکے خیالات کا اثر۔ اُنکے مراسم۔ ان کی محبت و رعایت مسلمانوں اور اُن کی سلطنت کے دل و جگر میں پیوست ہو گئی۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدے ہندوؤں نے حاصل کیے۔ مسلمانوں کو اپنی مد مقابل حریف قوم کے ہر وقت کے رشک و حسد سے ایک حد تک نجات مل گئی۔ بلکہ

اپنا خون ملجانے کے باعث شریک خود محافظ سلطنت ہوگیا - چنانچہ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ شاہجہاں کو وقت پر اپنے ماموں اور نانا سے بھی مدد ملی تھی - اس یگانگت و اتحاد نے یہانتک توغل کیا کہ مسلمانوں کے عقائد بھی ہندوؤں کی توہم پرستی کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے -

تمدن پر اثر

رانی جودہ بائی وغیرہ کے رشتہ نے ہندو مسلمانوں خصوصاً شاہی خاندان تیموریہ کو ایسا گھی کھچڑی کیا کہ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ مشہور ہوگیا - ان شادیوں سے مسلمانوں کے ترکی تمدن میں جس میں ایرانی و عربی تمدن کی آمیزش تھی ہندی تمدن کا جزو غالب شامل ہوگیا - اس میں کلام نہیں کہ تمدنی اتحاد دیگر ذرائع سے بھی ہوا - مگر جودہ بائی وغیرہ کے آنے سے گھر کے اندر ہندی تمدن نے جگہ پکڑ لی - شادی مہمانی کی بہت سی رسمیں، بلکہ حکومت کے متعلق بہت سی ایسی رسمیں تھیں جو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں رانیوں خاصکر جودہ بائی کے سبب سے خاندان تیموریہ میں رائج ہوئیں - مثلاً مایوں بٹھانا - دوسری خوشبودار چیزوں کے ساتھ ہلدی کی آمیزش کا اُبٹنا دولھا دُلہن کے ملنا (ہلدی کی آمیزش ہندویت کی نشانی ہے - کیونکہ اس ملک میں یہ چیز رنگ نکھارنے کے لیے مخصوص ہے) کنگنا باندھنا - منڈھا کھڑا کرنا - چوک پُرانا - سہرا باندھنا تیل چڑھانا دولھا کے سر پر راجہ شاہی پگڑی باندھنا - گلے میں جامہ پہنانا - شادی میں مہمانوں کا باہم اُبٹنا اور رنگ کھیلنا - سمدھنوں کو گالیاں دینی (ہندوؤں میں گالیاں دینے کی رسم عام ہے جسکو سیٹھنیاں کہتے ہیں) وغیرہ وغیرہ اور بہت سی جزوی رسمیں ہیں ان کے علاوہ ہولی اور دیوالی کی رسمیں ادا کرنی - بیٹیوں کو دیوالی دینی - کبھی کبھی ہولی کا جلسہ کرنا - اور سلطنت کے متعلق یہ رسمیں تھیں کہ بادشاہ راجہ شاہی پگڑی باندھتے تھے - جامہ پہنتے تھے - راکھی پونم کے دن ایک ایسے معزز ہندو خاندان (جسکو راجائی بلکہ میرزائی کا خطاب ہوتا تھا) کی خاتون بادشاہ کی کلائی میں راکھی باندھتی تھی (حضرت

بہادر شاہ مرحوم کے زمانہ تک یہ رسم جاری تھی - چنانچہ راجہ میرزا بھولاناتھ - اور راجہ میرزا کدار ناتھ کے خاندان کی ایک لیڈی یہ رسم ادا کیا کرتی تھی - اور حسب رواج بادشاہ کی بہن سمجھی جاتی تھی ، جشن کے دن بادشاہ بیگم ناک میں نتھ پہن کر آدھی رات کی نوبت کیوقت کڑھائی میں ڈال دیتی تھیں - وغیرہ اور بہت سی ہندوی رسمیں تھیں ، جو محل شاہی میں داخل ہوئیں - اُن میں سے بہت سی رسمیں تو اور مسلمان خاندانوں میں بھی رائج ہوگئیں - کیونکہ ایک زمانہ میں خاندان شاہی کے تمدن کی عام طور سے تقلید کیجاتی تھی - اور بہت سی رسمیں ایسی تھیں جو فقط خاندان تیموریہ ہی میں رہ گئیں - جن میں سے بعض اب تک بدلی جاتی ہیں - بعض لغو سمجھ کر یا افلاس کے سبب سے چھوڑ دیگئیں - اور بعض سلطنت کے ساتھ رخصت ہوگئیں -

ہمارے زمانہ لباس کے بھی بعض مخترعات رانی جودہ بائی کی طرف منسوب ہیں خصوصاً تہ پوشی - یعنی کلیوں دار پائجامہ - یہ قطع پیجامہ کی ظاہر ہے کہ نہ عرب سے آئی نہ ایران و توران نہ خراسان و افغانستان سے نہ ہندوستان میں قدیم سے کہیں یہ وضع رائج تھی - البتہ لہنگا ہند کا خاص لباس ہے - اسی سبب سے بعض قطعات ہند کے مسلمانوں میں بھی لہنگے کا رواج ہوگیا ہے - مگر ان کا لہنگا بھی بس اُسی حد و مقدار پر ہے جسپر کہ ہندی بہنوں کا لہنگا ہے - اس عام لہنگے کی قطع یہ ہے کہ صرف پاٹ جڑے ہوئے ہوتے ہیں - کلیاں نہیں ہوتیں - گھیر بھی اوسط درجہ کا ہوتا ہے - البتہ راجپوتانہ خصوصاً مارواڑ کا لہنگا کلیوں دار تیس تیس چالیس چالیس گز کے گھیر کا ہوتا ہے - مارواڑ رانی جودہ بائی کا دیس تھا ضرور ان کا لہنگا بھی اسی گھیر گھمار کا ہوگا - مگر ان کی اختراع پسند طبیعت نے میکے سسرال دونوں جگہ کی وضع میں سے ایک نئی وضع تہ پوشی کی پیدا کی - اپنے اختراع کے ابتدائی زمانہ کے بہت دن بعد تک ڈھیلا پائجامہ اُتنا ہی اونچا رہا جتنا کہ لہنگا ہوتا ہے بعد میں اس کی وضع میں کئی ترمیمیں ہوئیں - پھر کلیاں ڈھلک کر لگنے لگیں اور وہ وضع

قائم ہوئی جو آجتک رائج ہے۔ زیورات میں بھی رانی جودہ بائی کی شاہانہ طبیعت نے غالباً بہت کچھ تغیر و تبدل کیا ہوگا۔ کیونکہ ہمارے بہت سے زیور ایسے ہیں جن میں ہندویت و اسلامیت دونوں مذاق ہویدا ہیں۔ ہاں ایسے زیور جیسے نتھ وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ رانی موصوفہ یا زیادہ سے زیادہ اُن کی پیشرو رانیوں ہی کی تقلید سے مسلمانوں میں خصوصاً خاندان تیموریہ میں رائج ہے۔

بیاہی ہوئی زندگی

دنیا کا قاعدہ ہے کہ جہاں پھول ہے وہاں کانٹا بھی ہے۔ جہاں آسائش ہے وہاں کاہش بھی موجود ہے۔ رانی جودہ بائی بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں تھیں۔ جہاں اُن کو یہ قابل رشک مرتبہ حاصل تھا کہ وہ شاہی خاندان کی بیٹی۔ بہو اور بیوی تھیں۔ وہاں اُنکی زندگی کے اعلیٰ درجہ کے حظ کو منغص کرنے کے لیے نور جہاں جیسی رقیب کا کانٹا بھی موجود ہوگیا تھا۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی اس رقیبانہ منزل زندگی کو بڑے صبر و تحمل اور شاہانہ حوصلہ کے ساتھ طے کیا۔ اور سوکناپے کی جلن میں اپنی زندگی کو سوختہ کرنے کے بجائے اپنے خیالات کو ان باتوں کی طرف مبذول رکھا جو ہر متمدنہ عورت کے شایان شان ہیں۔ یعنی مذہبی اور تمدنی معاملات کی دلچسپی میں اُنھوں نے اپنا وقت گزارا۔ مذکورۂ بالا ایجادات و اختراعات وغیرہ کے انہماک سے اُنکی متمدنانہ لیاقت و دلبستگی کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی اسکے وہ اپنی شہرۂ آفاق سوکن کے مقابل میں خصوصاً مقابلہ کے وقت کینچائی اور گری بھی نہیں تھیں۔ اگرچہ نور جہاں بیگم کے اقبال نے بقول مولوی محمد حسین صاحب آزاد کے "رانیوں اور مہارانیوں کے چراغ گل کردیئے تھے (یہ اشارہ مولوی صاحب نے جودہ بائی ہی کی طرف کیا ہے) مگر حقیقتاً وہ چراغ الفت و محبت تھے جو ٹمٹما گئے تھے۔ نہ کہ چراغ وقعت و عظمت خود جہانگیر کے اقتدار میں نہ تھا کہ قدرت نے جو درجہ جودہ بائی کا اُنکے محل بلکہ اُنکے خانۂ دل میں قائم کردیا تھا وہ اُسکو زائل کرسکیں۔

حاضر جوابی ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جہاں پناہ رانی موصوفہ کے محل میں تشریف لائے اور رانی سے کہنے لگے۔ نورجہاں کہتی ہے کہ آپ کے دہن سے جو خوشبو آتی ہے وہ کسی کے منہ میں سے نہیں آتی کیا یہ سچ ہے؟ مہارانی نے جواب دیا کہ "میری شامہ نے کوئی دوسری بو نہیں سونگھی ہے جو حضور کے اور غیر کے بوئے دہن میں تمیز کر سکوں" فی الواقع یہ وہ جواب تھا جسکے دینے کی رانی جودھ بائی حقدار تھیں۔ بادشاہ نے بھی جیسا چلا یا تھا۔ ویسا وہ اپنا سا منہ لیکر رہ گئے ہونگے۔

نورجہاں بیگم کو زک دینی اللہ اکبر رے طبیعت کی شوخی! ایک دفعہ کچھ دل میں جو آئی تو بیٹھے بیٹھے ایک ترکیب سوچی۔ حضرت بیوی (حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام) کی نیاز کے بلاوے تمام امرا کی بیویوں کو بھیجے۔ اور نورجہاں بیگم کو بھی بُلایا۔ بیگم بڑے ٹھاٹھ سے سوکن کے ہاں آئیں۔ محفل اتحاد گرم ہوئی۔ محفل میں کسی مقام پر نیاز کا سامان تیار ہوا۔ جب نیاز ہو چکی اور معلوم ہوا کہ اب سب کو جا کر نیاز کا کھانا کھانا چاہیے۔ تو نورجہاں بیگم بھی جانے کے لیے آمادہ ہوئی ہونگی۔ مگر اتنے ہی میں مہتمہ نیاز نے تمام حاضرین بیگمات اور بیوی زنون کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کیا کہ یہ حضرت خاتون محشر کی نیاز ہے۔ لہٰذا ایسی پاک بیوی کی نیاز کا کھانا کھانے وہی بیبیاں تشریف لیچلیں جو یک شوہری ہوں۔ تمام بیبیاں جو ایسی ہی ہونگی۔ اور غالباً رانی کے طرفداروں میں اور اس چشمک آمیز سازش میں شریک ہونگی، کھڑی ہو گئیں اور جو اس صفت سے خارج تھیں وہ بیٹھی رہ گئیں۔ نورجہاں بیگم کو ناگوار تو بہت گزرا ہو گا۔ لیکن کیا کر سکتی تھیں۔ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔ رانی نے گو بہیم طور سے اصرار کیا مگر نورجہاں نے "اس نیاز کے قابل آپ ہی ہیں۔ تشریف لیجائیے" کہکر اپنی خفت مٹائی۔ اور بادشاہ سے جا کر بہت شکایت کی۔ بادشاہ نے رانی سے بازپرس کی۔ رانی نے نہایت اعتقاد سے کہا۔ کیا کروں یہ نیاز ہی ایسی مطہر و مقدس

بیوی کی ہے کہ ہما شما نہیں کھا سکتے"۔ نور جہاں کی یہ زک مشہور ہے۔ اور بیوی کی نیائی کی اصلیت یہی واقعہ ہے۔

اولاد | باوجود نور جہاں جیسے زبردست مدمقابل کے دور دورہ کے قدرت نے جو بیاہتا بیوی ہونے کی وجہ سے اُن کو اصل بادشاہ بیگم بنایا تھا وہ یوں بھی قائم رکھا کہ ولیعہد سلطنت شہزادہ خرم انہیں کے بطن سے پیدا ہوا۔ شہزادہ ممدوح الملقب بہ شہاب الدین شاہجہاں کی پیدایش کے بعض گیت ابتک یادگار ہیں جنسے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ملک ہند خصوصاً دارالخلافہ سے لگا کر ماڑواڑ تک خرمی وشادمانی کا غلغلہ بلند ہوگیا تھا۔ اور انبساط وطرب کا مینھ برس رہا تھا۔ متوسلین اور اہل استحقاق نے جھگڑ جھگڑ کر اپنے انعامات لیے اور بادشاہ وشہزادہ کی سرکار سے دل کھولکر اُنکے دامن مراد پر کیے گئے۔ یہ گیت زچہ گیریاں کہلاتی ہیں۔ دلی میں شاید اور خاندانوں میں بھی گائی جاتی ہیں۔ مگر تیموریہ خاندان کے کسی گھر میں جب زچہ خانہ ہوتا ہے تو ذیل کی دونوں زچہ گیریاں ضرور گائی جاتی ہیں۔ انکے مضامین سے اُسوقت کی دولتمندی۔ فارغ البالی۔ شہزادہ کے پیدا ہونے کی خوشی اور رانی جودہ بائی کے میکے کا حال اور وہاں کے تعلقات کی کیفیت ہوبہو آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

زچّہ گیری نمبر ا

مانگے ہے جودھاجی کا راج — للہ[1] جی کا نال نہ چھو وے

تھال بھر موتی جودہ رانی لائیں — وہ بھی نہ لیوے یہ دائی۔ للہ جی الخ

غرض ساری زچہ گیری اسی طرح ہے کہ تھال بھر موتیوں کے علاوہ "شال دوشالے جودہ رانی لائیں" اور "ہاتھی گھوڑے جودہ رانی لائیں"۔ مگر دائی کے خطرہ میں کوئی چیز نہ آئی۔ وہ جودھاجی یعنی جہانگیر کا آدھا راج پاٹ ہی انعام میں لینے پر اڑی رہی۔

[1] للہ لالہ جی۔

نمبر ۲

میرے بابل کو لکھیو سندیس :: جھنڈولا آج ہوا۔

بابل ہمارے نگری کے راجہ :: تو بیرن ہالے دیس "

رس بھری کھچڑی لاموے بابل :: تو نوبت باجے ہمیش "

مذہب — تحقیق طور سے ہمارے خاندان میں مشہور ہے کہ رانی ممدوحہ نہ کسی کے زور ظلم سے بلکہ اپنی رضا و رغبت سے مشرف باسلام ہوگئی تھیں۔ چنانچہ بیوی کی نیاز والا مذکورۂ بالا واقعہ بھی انکے اسلامی عقائد کا شاہد ہے۔

رانی جودہ بائی کے باب میں غلطیاں — ایک ہندی رانیوں کے تذکرہ میں مینے دیکھا کہ صاحب تذکرہ نے رانی موصوفہ کو خود اکبر کی بیوی بیان کیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ شاہنشاہ اکبر کی بیوی جو تھیں وہ راجہ بھارامل والی جیپور کی بیٹی تھیں۔

ممتاز محل

از ہمہ خوباں برعنائی یگانہ بودہ   وز جمال خویش در عالم فسانہ بودہ

ارجمند بانو بیگم ملقب بہ ممتاز محل مرزا غیاث بیگ طہرانی وزیر اعظم جہانگیر کے پوتے یمین الدولہ آصف خاں کی بیٹی۔ اور نور جہاں بیگم کی بھتیجی تھی ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء میں پیدا ہوئی نہایت حسین و صاحب جمال تھی۔ فہم و فراست میں بھی نور جہاں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ تعلیم بھی اعلیٰ درجہ کی پائی تھی اس لیے شاہنشاہ جہانگیر نے اپنے بیٹے شاہجہاں کے ساتھ شب جمعہ ۹ ربیع الاول ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء میں شادی کردی تھی۔

اسوقت شاہجہاں کی عمر بیس سال اور گیارہ مہینے کی تھی اور ارجمند بانو بیگم کی عمر ۱۹ برس سات مہینے تیرہ روز کی تھی بڑے شان اور جلوس سے بیاہ کر آئی اور ممتاز محل

خطاب پایا۔ بزم شادی مرزا غیاث کے گھر منعقد ہوئی۔ شاہ جہانگیر خود تشریف لے گئے اور اپنے ہاتھ سے نوشہ کے عمامہ پر موتیوں کا ہار باندھا۔ مہر پانچ لاکھ مقرر ہوا۔

اس سے ایک سال آٹھ مہینے پہلے شاہ اسمٰعیل صفوی فرماں روائے فارس کے پوتے مظفر حسین مرزا کی بیٹی سے شاہجہاں کا عقد ہو چکا تھا جو قندھاری بیگم کے لقب سے مشہور تھی۔ اس سے ایک لڑکی بھی پیدا ہو چکی تھی جس کا نام پرہیز بانو بیگم تھا۔ ممتاز محل کے حسن و جمال فہم و فراست کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ شاہِ جہاں کے دل کو (جس میں قندھاری بیگم نے اتنی مدت سے جگہ کر لی تھی) ایک دم میں اپنی طرف مائل کر کے اپنی الفت و محبت کا سکّہ جما دیا۔ اور محبت بھی ایسی کہ جس کا خمار جیتے جی نہ اُترا بلکہ مرنے کے بعد بھی جدا نہ ہوئی۔ سچی محبت اسے کہتے ہیں۔

ممتاز محل سے شاہ جہاں کو وہی نسبت تھی جو جہانگیر کو نور جہاں بیگم سے تھی جس طرح نور جہاں نے اپنی خداداد قابلیت سے جہاں گیر کے چشم و دل میں گھر کر لیا تھا اسی طرح ممتاز محل نے شاہجہاں کو مسخر کر لیا تھا۔

ممتاز محل اپنی ذاتی قابلیت اور حُسن و جمال میں نور جہاں بیگم کے ہم پلہ تھی بلکہ نور جہاں کو وہی لوگ جانتے ہیں جنھوں نے تاریخ کی ورق گردانی کی ہے۔ لیکن ممتاز محل سے دنیا بھر کا بچّہ بچّہ واقف ہے۔ کونسی بیگم ایسی خوش نصیب گذری ہے جس کے مدفن پر ہزاروں کوس سے مختلف ملک اور مختلف مذہب اور قوم کے لوگ صرف دیکھنے کو آیا کریں اور اپنے ملک میں واپس جا کر اسپر فخر و مباہات کریں۔

شاہجہاں کو ممتاز محل سے دلی محبت تھی یہی وجہ تھی کہ کبھی ایک لمحہ کو بھی اس کی مفارقت گوارا نہ کی۔ یہانتک کہ لڑائیوں میں بھی ہمیشہ ساتھ ہی رہی۔

دکن کی مہمات میں یہ دور اندیش صائب الرائے بیگم شاہجہاں کی مشیر رہی اور پولیٹکل معاملات میں بھی بہت کچھ مدد دی تھی۔ سنہ ۱۰۲۹ھ تک ممتاز محل اور شاہجہاں

دکن میں نہایت عیش و نشاط کے ساتھ انتظام ملکی میں مصروف رہے ابتک نور جہاں بھی آصف خاں کے مراتب کی وجہ سے شاہجہاں سے موافق اور اس کی معاون رہی۔ شاہجہاں کو سلطنت جہانگیری میں بڑا دخل تھا۔

اسی سال نور جہاں بیگم نے اپنی بیٹی کی شادی (جو شیر افگن خاں سے تھی) جہانگیر کے چھوٹے بیٹے شہریار سے کردی اسکا یہ نتیجہ ہوا کہ نور جہاں بیگم شاہجہاں سے خلاف اور شہریار سے موافق ہوگئی۔ اس کی دلی خواہش یہ ہوئی کہ شاہجہاں کی قوت کم ہو اور بعد جہانگیر کے سلطنت شہریار کے قبضہ اقتدار میں رہے۔ اسی بنا پر اس نے سازشیں شروع کیں اور اس فکر میں رہنے لگی کہ جہانگیر شاہجہاں سے متنفر ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہر چند شاہجہاں نے کوشش کی کہ باپ سے صفائی ہو جائے مگر نہ ہوئی۔ یہانتک کہ جہانگیر نے ایک بڑا لشکر شاہجہاں کی گرفتاری کو بھیجا۔

سلطان پرویز اور مہابت خاں اس کے سردار تھے۔ شاہجہاں یہ خبر پاکر برہان پور سے بھاگا۔ کبھی شاہانِ دکن کے یہاں اور کبھی بنگالہ میں پناہ لی۔ الغرض آٹھ برس تک معتوب رہا اس بدامنی اور اضطراب کی حالت میں بھی اپنی محبوبہ ممتاز محل کو اپنی جان کے ساتھ ہی رکھا۔ جب جہانگیر کا انتقال ہوگیا تو شاہجہاں نے دارالخلافہ کی طرف رخ کیا اور آصف خاں کی کوشش سے نہایت شان و شوکت سے تخت نشین ہوا۔ اس موقع پر شاہ جہاں اور ممتاز محل کو جو خوشی حاصل ہوئی اس کا اندازہ کیا ہو سکتا ہے۔

شاہ جہاں نے دو لاکھ اشرفی اور چھ لاکھ روپیہ ملکہ ممدوحہ کو بطور انعام عطا کیا اور دس لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر مقرر کی۔

ایام جشن نوروز میں پچاس لاکھ کے زیورات منظور کیے ۱۰۳۹ھ ۱۶۲۹ء میں سالانہ وظیفہ میں دو لاکھ اور اضافہ کیا۔

عہد شاہجہاں میں ممتاز محل کو سلطنت میں وہی دخل تھا جو جہانگیر کے زمانہ میں نورجہاں بیگم کو تھا۔ چنانچہ شاہجہاں نے تخت نشینی کے بعد شاہی مُہر اپنی معتمد و لائق بیگم کو دے دی تمام فرامین پہلے شاہی محل میں جاتے اگر مناسب ہوتے تو اُن پر مُہر ثبت کی جاتی ورنہ بغرض تحقیق مزید علٰحدہ رکھدیئے جاتے۔

کچھ عرصہ کے بعد ممتاز محل کی سفارش سے مُہر یمین الدولہ آصف خاں کو مرحمت ہوئی اور منصب نوہزاری بھی عطا ہوا۔ پچاس لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر منظور ہوئی سچ ہے لعل پارا تو اسکا خیال بھی پیارا۔ ممتاز محل کی بدولت آصف خاں کو ایسا عروج حاصل ہوا کہ کوئی آرزو باقی نہ رہی اکثر کہا کرتے تھے کہ میری صرف یہی حسرت باقی ہے کہ بادشاہ کے سامنے ہی دنیا سے رخصت ہوں۔

ممتاز محل نہایت درجہ رحم دل تھی (اور یہ صنف نسار کا وصف عام ہے) غریبوں کی فریاد رسی اور اُن سے ہمدردی۔ بیواؤں اور مساکین کی خبر گیری اور امداد کنواری لڑکیوں کی شادی کا انتظام و اہتمام یہ اس کی روزانہ ضروریات میں سے تھا ستی النسا خانم (اس کی مصاحبہ جسکا مقبرہ تاج گنج سے ملا ہوا ہے) ان امور کی منتظمہ تھی۔

سیکڑوں قاتل و مجرم اس کی سفارش سے رہا ہو گئے اور بہت سے معتوب سلطنت اپنے عہدوں پر بحال کرا دیئے۔

شاہجہاں برہان پور ملک دکن میں خان جہاں لودی کی سرکوبی کی غرض سے خیمہ زن تھا کہ ۱۷ ذیقعدہ کو دفعتاً ممتاز محل علیل ہو گئی۔ آدھی رات کے بعد لڑکی پیدا ہوئی لیکن اس کی تکلیفیں برابر بڑھتی گئیں۔ غش پہ غش آنے لگا آخر کار زندگی سے مایوس ہو گئی تب شہزادی جہاں آرا کو جو اُس کے پاس بیٹھی تھی اشارہ کیا کہ زنانہ کمرہ کی راہ سے بادشاہ کو بُلا لائے اُسوقت تین گھڑی رات باقی تھی۔ بادشاہ گھبرا کر فوراً آئے۔ اور

سرہانے بیٹھ گئے ممتاز محل نے اپنے آنسوؤں بھری آنکھیں کھول کر نظر یاس سے بادشاہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ میرے بعد میری اولاد سے غافل نہ ہونا اور میرے بیکس والدین کی بھی خبرگیری کرتے رہنا۔ پھر دوبارہ گہری نگاہ سے اپنے عمر بھر کے رفیق کو دیکھ کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

اس حادثہ جانکاہ سے قیامت صغریٰ برپا ہو گئی۔ بادشاہ کے غم والم کا کیا بیان ہو۔ ہفتوں تک کسی امیر کی صورت نہیں دیکھی نہ کبھی جھروکہ پر انتظام ملکی کی غرض سے نمودار ہوئے۔ دو برس تک برابر اس صدمہ میں تمام مسرت انگیز باتیں چھوڑ رکھی تھیں یہانتک کہ لذیذ کھانوں سے متنفر ہو گئے تھے۔ عید وغیرہ کی تقریبوں میں جب اور بیگمات خدمت میں حاضر ہوتیں تو اُن میں اپنی محبوبہ کو غائب پا کر زار زار روتے۔ جب کبھی اس کی خوابگاہ میں پہنچ جاتے تو آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا۔

ملا عبدالحمید لاہوری لکھتے ہیں کہ اس واقعہ سے پہلے بادشاہ کے دس بیس بال سفید تھے مگر ممتاز محل کی مفارقت سے چند ہی روز بعد فرط غم سے تمام بال سفید ہو گئے سچی محبت ہر رنگ میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ دونوں ایک جان دو قالب کے مصداق تھے۔ ایک کی زندگی گویا دوسرے کی حیات پر منحصر تھی۔ جب باہمی تعلق اس پر پہنچ گیا ہو تو ایک کے فراق جاودانی سے دوسرے کو جسقدر صدمہ ہو کم ہے۔

کیسی خوش قسمت بیگم تھی کہ اپنے قدردان کے سامنے دنیا سے کوچ کیا۔ اگر شاہ جہاں کے بعد مرتی تو آج اس شان و شوکت سے تاج محل میں سوتی ہوئی نظر آتی اور اسپر طرہ یہ کہ اپنا وارث، اپنا سرتاج، اپنا بادشاہ اپنے پاس۔ خدا ہر بیوی کو یہ مرتبہ عطا فرمائیے۔ روضۂ تاج گنج میں دونوں قبریں دیکھ کر دل پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ دونوں رفیق جانی پہلو بہ پہلو قیامت کی نیند سو رہے ہیں۔

ممتاز محل کی نعش کو مشرقی دستور کے مطابق باغ زین آباد واقع برہان پور

متصل دریائے تاپتی میں بطور امانت دفن کر دیا۔ جمعرات کے روز ۶ تاریخ سہ پہر کو بادشاہ باغ زین آباد میں گئے اور اپنی جواں مرگ حسرت نصیب بیوی کی عارضی قبر پر فاتحہ پڑھی اور جب تک برہان پور میں رہے یہی معمول رہا کہ ہر جمعہ کو فاتحہ خوانی کی غرض سے وہاں جاتے اور اپنا رنج و غم تازہ کرتے تھے۔ چھ مہینے بعد جمعہ کے روز ۱۷ جمادی الاول ۱۰۴۱ھ کو ملکہ کی نعش شہزادہ محمد شجاع اور ستی النسار خانم کی حفاظت میں برہان پور سے آگرہ روانہ ہوئی۔ جہان آرا بیگم اور وزیر خاں طبیب بھی ساتھ تھے۔ حکم شاہی کے موافق برہان پور سے آگرہ تک فقرا اور مساکین کو کھانا اور روپیہ بکثرت بطور خیرات تقسیم کرتے ہوئے آئے۔ چھ مہینے تک مرحومہ کی نعش کو روضۂ تاج گنج کے صحن باغ میں بطور امانتاً سپرد کیا بعدہٗ اصل مقبرہ میں دفن کیا۔

ملا محمد صالح لکھتے ہیں کہ اس حادثہ کے بعد ہر سال جب ذیقعدہ کا مہینہ آتا تو بارگاہ شاہجہاں میں تعزیت کا سامان ہوتا۔ بادشاہ سپید پوشاک پہنتے اور تمام امرا وغیرہ ماتمی لباس میں نظر آتے۔

ممتاز محل کے تمام سامان خانہ داری جہان آرا بیگم کے سپرد تھے اور سالانہ وظیفہ جو ممتاز محل کے لیے مقرر تھا اُس میں چار لاکھ کا اضافہ کر کے جہان آرا بیگم کو منتقل کر دیا تھا جو آدھا نقد اور آدھا جاگیر کی صورت میں تھا۔ مرزا اسحاق بیگ یزدی جو ممتاز محل کے میر ساماں تھے وہ جہان آرا بیگم کے دیوان کر دیئے گئے اور ستی النسار خانم بدستور امور خانگی میں منتظمہ رہیں اور مُہر بھی انھیں کی سپرد کی گئی۔

ممتاز محل کے آٹھ لڑکے چھ لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں مگر وفات کے وقت صرف سات زندہ تھے۔ جہان آرا بیگم۔ محمد دارا شکوہ۔ محمد شاہ شجاع۔ روشن آرا بیگم اورنگ زیب۔ مراد بخش۔ اور گوہر آرا بیگم جس کی پیدائش کے وقت ممتاز محل اس جہان سے گذر گئی۔

جہاں آرا بیگم

جہاں آرا بیگم صاحبقران ثانی محمد شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ دہلی کی لاڈلی بیٹی تھی۔ عمر میں اپنے بھائی عالمگیر سے بڑی تھی۔ ۱۰۲۲ھ میں وہ پیدا ہوئی۔ اس کی ماں ارجمند بانو بیگم عرف ممتاز محل تھی جسکا مقبرہ آگرہ میں ہے اور جو دنیا میں بہ لحاظ خوبصورتی کے بے نظیر و بے مثل ہے۔

جہاں آرا جب سن شعور کو پہونچی تو اس کی تعلیم صدر النساء خانم عرف ستی النساء خانم کے سپرد ہوئی۔

ستی النساء خانم مشہور شاعر طالب آملی کی ہمشیرہ تھی جو عہد جہانگیر کا ایک ممتاز سخنور تھا۔ اور وہ نصیرا شاعر کی بیوی تھی جو حکیم رکنا کاشی کا بھائی تھا۔

ستی النساء خانم نے جہاں آرا بیگم کو پہلے کلام مجید پڑھایا۔ اسکے بعد فارسی نثر و نظم اور علم قرأت کی تعلیم دی۔ اور تھوڑے ہی زمانے میں لکھنے پڑھنے میں اس کو ہوشیار کر دیا۔ علاوہ بریں اسکے دل میں کتب بینی کا شوق پیدا کر دیا جسکو اُس نے عمر بھر قائم رکھا۔

جہاں آرا نہایت درجہ حسین شاہزادی تھی۔ اور بہت شان اور شوکت کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی سالانہ جاگیر دس لاکھ رُپیے کی تھی۔ علاوہ بریں بوجہ اسکے کہ شاہجہاں اسکو اپنی تمام اولاد میں زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ادنیٰ ادنیٰ تقریبوں میں ہزاروں لاکھوں رُپیے بطور انعام و اکرام کے اسکو ملا کرتے تھے۔

جہاں آرا کا محل شاہجہاں کے عالیشان محلسرا کے متصل دریائے جمن پر واقع تھا اور نہایت دلفریب نقش و نگار سے قرین تھا۔ اس کے در و دیوار پر اعلیٰ درجہ کی

پچیکاری کی ہوئی تھی۔ اور جا بجا گراں بہا جواہرات نہایت خوبصورتی کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔

اس کی سواری بڑی شان و شوکت کے ساتھ نکلتی تھی۔ اکثر اوقات تو وہ چنڈول پر نکلتی تھی جو تخت رواں کے مشابہ ہوتا تھا۔ اور اُسکو کہار اُٹھاتے تھے۔ اس کے ہر طرف روغن کاری کا کام بنا ہوا ہوتا تھا۔ اور ریشمی دلکش گھٹا ٹوپ پڑے ہوتے تھے۔ ان میں زری کی جھالریں اور خوبصورت پھندنے لٹکے ہوتے تھے جن سے اسکی زینت دوبالا ہو جاتی تھی۔

اور کبھی کبھی وہ بلند اور خوبصورت ہاتھی پر سوار ہو کر نکلا کرتی تھی جسپر نہایت زرق و برق اور شاندار ہودج کسا ہوتا تھا۔ اسکے پیچھے پیچھے خواجہ سرا بیش قیمت گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے۔ ایک رسالہ تاتاری عورتوں کا بھی ہمرکاب ہوتا تھا۔ اسکے علاوہ پیدل ملازمین کی ایک جم غفیر بھی ساتھ ہوا کرتی تھی۔

جہان آرا بیگم کی شادی عمر بھر نہیں ہوئی۔ اور یہ صرف اسی بیگم پر موقوف نہیں ہے، بلکہ اس خاندان کی اکثر بیگمات کی شادی نہیں ہوئی۔

زیادہ تر اس کی وجہ یہ ہے کہ ملکی بنیاد پر شاہان مغلیہ اپنی بیٹیوں کی شادیاں نہیں کیا کرتے تھے۔ کیونکہ جن لوگوں سے اس قسم کے تعلقات پیدا ہوئے وہ بغاوت سے باز نہیں رہے۔ اسکے علاوہ ان بیگمات کے شادی نہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انکے لیے ایسے لوگ بھی مشکل سے مل سکتے تھے جو بہ لحاظ عزت و حرمت کے شاہان مغلیہ کے نزدیک اس قابل ہوں کہ انکے ساتھ شاہزادیوں کا نکاح کیا جائے۔

باوجود اس امر کے کہ جہان آرا کی شادی نہیں ہوئی۔ اس نے نہایت پاکبازی کے ساتھ اپنی عمر بسر کی۔ اور زندگی بھر زہد و صلاح اسکا شیوہ رہا۔ برنیر و ٹیونیر وغیرہ سیاحان یورپ نے جو بے سر و پا افسانے اس عصمت مآب بیگم کے متعلق لکھے ہیں وہ حد سے

زیادہ غلط ہیں۔ اوران کی کافی طور پر ہم نے اپنی کتاب "جہان آرا" میں تردید کردی ہے۔

جہان آرا کو اولاد کا بہت شوق تھا۔ اس نے دارا شکوہ کے قتل کے بعد اسکی بیٹی جہاں زیب بانو بیگم کو متبنے کرلیا تھا۔ اور عمر بھر اسکو بطور اولاد کے رکھا جب اس کی شادی عالمگیر کے بیٹے شاہزادہ محمد اعظم کے ساتھ ہوئی تو جہان آرا نے اس تقریب میں اپنی جیب خاص سے سولہ لاکھ رُپیے صرف کیے تھے۔

جہان آرا بیگم بڑی فاضلہ عورت تھی۔ اس کی کتاب "مونس الارواح" نہایت معروف و مشہور ہی۔ یہ کتاب اس نے ۱۰۴۹ھ میں تصنیف کی جبکہ اس کی عمر چھبیس ۲۶ سال کی تھی۔ اس کتاب میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور انکے خلفائ کے حالات اس نے نہایت بسط کے ساتھ لکھے ہیں۔ بیگم مذکور کو خواجہ صاحب کیساتھ دلی عقیدت تھی چنانچہ اس کتاب کو سب سے پہلے اسنے خواجہ صاحب کے مزار پر چڑھایا جو ابتک وہاں موجود ہے۔

اس نے خواجہ صاحب کے روضۂ مبارک میں ایک عالیشان دالان بھی تعمیر کرایا جسپر تمام زرین کام کیا ہواہی۔ اس کے دیواروں کے نقش و نگار نہایت دلفریب ہیں اور جا بجا جواہرات کی پچیکاری کی گئی ہی۔

یہ بیگم نہایت درجہ سخی و فیاض تھی۔ عام طور پر غربا و مساکین اس کی دریادلی سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ سینکڑوں بیواؤں کی تنخواہیں اسکے یہاں سے مقرر تھیں۔ اور ہزاروں غریبوں کی لڑکیوں کی اسنے اپنے صرف سے شادیاں کرادیں۔ شعرا اور ارباب کمال اسکے انعام واکرام سے اکثر متمتع ہوا کرتے تھے۔

حاجی محمد خاں قدوسی نے اسکے جلجانے کے موقع پر ایک پُرزور قصیدہ لکھا بیگم صاحبہ کو اسکا ایک شعر پسند آیا اور اسکے صلہ میں پانچہزار روپیہ عطا کیا۔ وہ شعر یہ ہی۔

تا سر زدہ از شمع چنیں بے ادبی　　　پروانہ ز عشق شمع را سوختہ ہست

مرزا محمد علی ماہر نے ایک مثنوی بیگم صاحبہ کی تعریف میں لکھی۔ اسکا بھی ایک شعر بہت پسند کیا اور پانچسو روپیہ انعام دیا۔

بذات اوصفات کردگار ہست　　　کہ خود پنہان و فیضش آشکار است

جہان آرا بیگم ایک مرتبہ جلتے جلتے جان سے بچ گئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ستائیس ۲۷ محرم ۱۰۵۳ھ کو اس کی سالگرہ کے جشن کا دن تھا۔ اتفاق سے اسکے کپڑوں میں جو عطر سے مدسم تھا شمع کے ذریعہ سے آگ لگ گئی۔ بیگم ایسی حیادار عورت تھی کہ شرم سے اس نے ذرا بھی شور و غل نہ کیا۔ کیونکہ اسکو خوف تھا کہ امرا جو اس جگہ سے قریب بیٹھے ہوئے تھے اس کی آواز سن لینگے۔ وہ دوڑکر زنانہ کمرے میں پہونچی۔ اور بیہوش ہوکر گر پڑی۔ دو تین لونڈیاں جو آگ بجھانے میں مشغول ہوئیں۔ وہ بھی جل گئیں شاہجہان بادشاہ کو اس حادثہ سے بہت رنج ہوا۔ چار ماہ تک اس نے سلطنت کا کوئی کام نہیں کیا۔ ہمیشہ بیگم صاحبہ کی تندرستی کے لیے نہایت خلوص کے ساتھ دعائیں مانگتا تھا۔ اس نے یہ منت مانی تھی کہ اگر جہان آرا اچھی ہوگئی تو پانچ لاکھ روپیے خیرات کرونگا۔ اور حضرت خواجہ صاحب کی زیارت کو بھی جاؤں گا۔

بیگم صاحبہ کے زمانۂ علالت میں اس نے سات لاکھ روپیے غربا میں تقسیم کیے۔ اور ہزاروں قیدیوں کو رہا کر دیا۔

بیگم صاحبہ کے علاج کے لیے حکیم محمد داؤد بادشاہ ایران کا طبیب خاص مقرر کیا گیا۔ اگرچہ اسکے علاج سے چنداں فائدہ نہیں ہوا مگر بادشاہ نے اسکو بیش قیمت خلعت اور بیس ہزار روپیہ عطا فرمایا۔ اور معزز منصب سے سرافراز کیا۔

بعض مورخین نے لکھا ہی کہ ڈاکٹر بوسٹن کے علاج سے اسکو فائدہ ہوا جسکے صلہ میں بادشاہ نے ہر جگہ انگریزوں کو تجارت کی کوٹھی بنانے کی اجازت دیدی۔

اکثر مورخین کا یہ خیال ہے کہ بیگم صاحبہ کو عارف جراح اور ہامون ایک بینوا فقیر کے مرہم سے فائدہ ہوا۔ بادشاہ ہامون سے اسقدر خوش ہوا کہ وہ رُپیے سے تولا گیا۔ اور اسکے وطن میں اُسکو ایک گاؤں بطور جاگیر کے ملا۔ اس کی بیوی نے بہت سے بیش قیمت زیورات پائے۔ اور شاہزادی نے تو اسکو اسقدر دیا کہ عمر بھر کے لیے مستغنی کر دیا۔

بیگم صاحبہ کے غسل صحت کے موقع پر بادشاہ نے بہت دھوم دھام سے جشن کیا۔ دیوان عام کے سامنے نہایت بیش قیمت خیمے نصب کیے گئے۔ شامیانوں کی رسیاں اور تمام ساز و سامان چاندی اور سونے کے تھے۔ زینت کی غرض سے اس میں گراں بہا جواہرات جڑے گئے تھے۔ مختلف ملکوں کے شامیانوں میں خوبصورت قالین بچھائے گئے تھے۔ اور بیچ میں ایک مرصع تخت تھا جس میں لعل اور موتی ٹکے ہوئے تھے۔ روم اور چین کے مصوروں کے ہاتھ کی تصویریں اور دلکش پردے بھی آویزاں تھے۔

شاہجہاں نے اس موقع پر نہایت شان و شوکت سے جلوس کیا۔ اِرد گِرد شاہزادے بیٹھے ہوئے تھے۔ زرین کرسیوں پر جابجا مشک اُذفر جلتا تھا۔ گانے والوں کی دلکش آوازوں سے آسمان گونج رہا تھا۔ سیکڑوں کوہ پیکر گھوڑے جنکے کل سامان سونے اور زربفت کے تھے۔ سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ اور ایک طرف بلند اور خوبصورت ہاتھیوں کا مجمع تھا جو بلحاظ اپنے ساز و سامان کے قابل دید تھے

اس موقع پر بادشاہ نے ہزار مُہر اور پانچہزار روپیہ غربا میں تقسیم کیا۔ عارف جراح سونے سے تولا گیا۔ اور اُسکو ساٹھ ہزار روپیہ کا خلعت اور گھوڑے اور ہاتھی بطور انعام کے ملے۔ کئی ہزار کے طلائی پھول نچھاور کیے گئے۔ اور بادشاہ نے بیگم صاحبہ پر لاکھوں رُپیے کے لعل و یاقوت نچھاور کیے۔ اور ایک دست بند جس کی

قیمت پانچ لاکھ روپیہ تھی - اور ایک موتیوں کی سربندی جس میں ایک ٹکڑا الماس کا جڑا ہوا تھا جس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ تھی بیگم صاحبہ کو عطا کیا - اور سورت جاگیر میں دیا - اور تقریباً بیس لاکھ روپیہ انعام کی مد میں صرف کر دیا ۔ شاہزادوں کو بھی کئی لاکھ روپیہ اور بیش قیمت جواہرات عطا کیے - اورنگ زیب عالمگیر پر اسوقت عتاب شاہی تھا - بیگم صاحبہ کی سفارش پر بادشاہ نے اسکا قصور معاف کر دیا - اور اُسکو انعام واکرام سے سرفراز کیا -

اس سے معلوم ہوتا ہی کہ بادشاہ کے دل میں جہان آرا کی کسقدر محبت تھی - اور وہ اسوجہ سے تھی کہ جہان آرا نہایت دور اندیش اور صائب الرائے تھی سلطنت کے اہم معاملات میں بادشاہ اس کی رائے پر عمل کرتا تھا - اور بغیر اسکے پوچھے ہوئے کوئی کام نہیں کرتا تھا -

دارا شکوہ اسوقت ولی عہد تھا - اور بہت کچھ کام بادشاہ نے اسکے سپرد کر رکھا تھا جہان آرا دارا شکوہ کی طرفدار تھی - اسلیے وہ اُسکو دل سے مانتا تھا - ان وجوہات سے بیگم صاحبہ کی ذات سلطنت شاہجہانی میں بہت اہم تھی -

شاہجہاں کے زوال کے موقع پر جب جہان آرا کے بھائیوں نے چاروں طرف سے فوج کشی کی اسوقت اس نے اس فتنہ کے فرو کرنے میں بہت کوشش کی - عالمگیر کو خود کئی خط لکھے - اسکے بعد وہ بلاخوف وخطر خود اسکے پاس گئی اور اُسکو بہت کچھ سمجھایا بجھایا - لیکن عالمگیر نے اس کی ایک بھی نہیں سُنی -

جب شاہجہاں قید ہو گیا تو جہان آرا نے اسکا پورا ساتھ دیا - وہ جبتک زندہ رہا اس کی خدمت میں برابر مصروف رہی - آگرہ کے قلعہ میں جہاں شاہجہاں قید تھا وہ مقام ابتک موجود ہی - وہاں پر وہ سقاوہ بھی ابتک موجود ہی جس میں جہان آرا اپنے بوڑھے باپ کے وضو کے لیے خود پانی گرم کرتی تھی -

آخر ۱۰۶۷ھ میں آٹھ سال قید کی مصیبت جھیل کر جبکہ اس کی خدمتگزار بیٹی اسکے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی نظر اس کی زندگی بھر کی آرام جان بیوی کے خوبصورت روضہ پہ جمی ہوئی تھی۔ اس کی روح نے پرواز کیا۔ اور تاج محل کے روضہ میں وہ دفن کیا گیا۔

عالمگیر اُسوقت دہلی میں تھا۔ یہ خبر سُنکر آگرہ میں آیا۔ بیگم صاحبہ کو ایک لاکھ اشرفی نذر کی اور بہت عزت و توقیر فرمائی۔ اور بادشاہ بیگم کا خطاب عطا کیا۔

بعد وفات شاہجہاں کے جہان آرا نے ایک درویشانہ زندگی بسر کی۔ سترہ لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر اس کی عالمگیر کے زمانہ میں تھی۔ اس عہد میں اسکو ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ خانگی امور میں کبھی بادشاہ اس کی رائے طلب کیا کرتا تھا۔

روشن آرا بیگم جو اُس کی چھوٹی بہن تھی اور جو شورش کے زمانہ میں عالمگیر کی طرف تھی۔ اب اسکا عروج ہوا۔ اسکو جہان آرا سے سخت عداوت تھی۔ اسی وجہ سے جہان آرا نے تمام تعلقات چھوڑ کر زہد و تقوے سے سروکار رکھا۔

اسکا مذہب مثل اپنے بزرگان قدیم کے حنفی تھا۔ مگر تصوف سے اسکو ایک خاص دلچسپی تھی۔ اور خواجہ صاحب سے دلی عقیدت رکھتی تھی۔

۱۰۹۲ھ میں جہان آرا نے بمقام دہلی انتقال کیا۔ وفات کے وقت اس کی عمر ستر سال کی تھی۔ عالمگیر اسوقت برہان پور میں تھا۔ اس سانحہ کو سُنکر بہت دیر تک رویا کیا۔

جہان آرا نے تین کرور روپیے اپنی وفات کے بعد چھوڑے تھے۔ اور یہ وصیت کی تھی کہ یہ سب رُپیے حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے خدام کو دیئے جائیں۔ کیونکہ انھیں کے ذریعہ سے بیگم صاحبہ کو اس مقدس روضہ میں مدفن کے لیے جگہ ملی تھی لیکن عالمگیر نے دو کرور روپیے اس میں سے لے لیے اور کہا کہ از روے شرع ایک ثلث سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں۔

جہان آرا کا مدفن شیخ نظام الدین اولیاء کے مزار کے بالکل قریب ہے۔ اسکو بیگم صاحبہ نے خود اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ بالکل سنگ مرمر کا ہے۔ اوپر چھت نہیں ہے تعویذ قبر خام ہے جسپر ہمیشہ سبزہ لہلہاتا ہے اور اُسپر یہ عبارت کندہ ہے۔

ھوالحی القیوم

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا　　　که قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

الفقیرۃ الفانیہ جہان آرا بیگم مرید خواجگان چشت بنت شاہجہاں بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ

سنہ ۱۰۹۲ھ

جہان آرا نے اپنی وفات کے بعد بہت سی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ اپنے باپ شاہجہاں کی طرح اسکو بھی عمارتوں کا بہت شوق تھا۔

سب سے بڑی عمارت جو اس نے تعمیر کرائی وہ آگرہ کی جامع مسجد ہے جو ابتک نہایت آباد ہے۔ یہ عمارت قلعہ معلے کے بالکل قریب واقع ہے۔ پانچ سال میں اتمام کو پہونچی۔ اور تخمیناً پانچ لاکھ روپیہ اس میں صرف ہوئے۔ یہ مسجد طول میں ایک سو بتیس فٹ اور عرض میں سو فٹ ہے۔ اس کی دیواریں قد آدم تک سنگ مرمر کی ہیں۔ اور اس میں پانچ عالیشان دروازے ہیں۔ وسط کا دروازہ چالیس فٹ سے زیادہ عریض ہے سنہ ۱۰۸۰ھ میں متھرا کے بتوں کی جو مورتیں آئی تھیں وہ عالمگیر کے حکم سے اسکے زینے کے نیچے دفن کر دی گئیں۔

بیگم صاحبہ نے ایک مسجد کشمیر میں بھی تعمیر کرائی جسکو مسجد ملا بدخشی کہتے ہیں۔ اس وقت وہ ملا مذکور کی زیارت کے لیے گئی ہوئی تھی۔ اس کی تعمیر میں چالیس ہزار روپیہ صرف ہوئے۔

دہلی میں اس نے ایک کارواں سرائے بنوائی تھی۔ جسکے متعلق برنیر لکھتا ہے کہ کاش یہ عمارتیں پیرس میں ہوتیں۔ افسوس ہے کہ مٹتے مٹتے اس عمارت کے بہت کم

آثار صفحہ ہستی پر باقی رہ گئے ہیں۔

عمارات کے علاوہ جہان آرا بیگم کو باغات کا بھی بہت شوق تھا۔ دہلی میں اسکا ایک نہایت دلکش باغ تھا جو آجھوں کے نام سے مشہور تھا۔ اس میں خوبصورت بنگلے اور مکانات بنے ہوئے تھے۔ بہت سے حوض اور آبشاریں تھیں جن میں فوارے لگے ہوئے تھے۔ آگرہ میں بھی اسکا ایک باغ تھا جسکو اب سید کا باغ کہتے ہیں۔

اس باغ کو شاہجہاں نے اپنی شاہزادگی کے زمانہ میں تعمیر کرایا تھا۔ جب جہان آرا سن شعور کو پہونچی تو اسکے سپرد کردیا۔

یہ باغ نہایت آراستہ رہتا تھا۔ بادشاہ بھی کبھی کبھی وہاں تشریف لیجاتے تھے افسوس جہاں پر ہر وقت نظر فریب پھول کھلے رہتے تھے وہاں اب حسرت برستی ہے اور جس باغ میں پری پیکر بیگمات خرام ناز کرتی تھیں وہاں اب عبرت کے سوائے کوئی نظر نہیں آتا۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید ست صنادید عجم را

روشن آرا بیگم

خواتین اسلام میں روشن آرا بیگم وہ عورت ہے جو علمی قابلیت اور فہم و ذکاوت میں نہایت ممتاز تھی۔ یہ اورنگ زیب کی حقیقی چھوٹی بہن تھی۔ اور فطرتاً اُس سے بہت کچھ مشابہت رکھتی تھی۔ اس کی مادر مہربان ارجمند بانو بیگم عرف ممتاز محل تھی جسکا سایہ عاطفت عہد طفولیت ہی میں اُس کے سر سے اُٹھ گیا تھا شاہجہاں نے اسکو تعلیم کے لیے ستی النسا خانم کے سپرد کیا جو ممتاز محل کی بہت عرصہ تک مصاحبہ رہی تھی۔ ستی النسار خانم مشہور شاعر

طالب آملی کی ہمشیرہ تھی جسکو جہانگیر نے ۱۰۲۸ھ میں ملک الشعرا کے خطاب سے سربلند کیا تھا اور وہ نصیرا کی زوجہ تھی جو معروف شاعر حکیم رکنا کاشی کا بھائی تھا۔

ستی النسا خانم بڑی قابل عورت تھی۔ فن طب اور قرأت وغیرہ میں اپنے ہمعصروں میں یکتا تھی۔ اور شاعری تو اسکے گھر کی لونڈی تھی۔ ستی النسا خانم نے روشن آرا کو باقاعدہ تعلیم دی جس سے بہت جلد اُسنے علم و ہنر میں کمال پیدا کیا۔

روشن آرا کی ایک بڑی بہن جہان آرا تھی جس کی تصنیف سے مونس الارواح ہے اور جو عہد شاہجہاں میں سیاست اور حکومت کی روح رواں تھی۔ اور بادشاہ پر اسکو اسقدر اقتدار تھا کہ بغیر اس کی صلاح و مشورے کے وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ روشن آرا کو جہان آرا کے ساتھ حاسدانہ تعلقات تھے اور دونوں میں اسی وجہ سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ جب تک شاہجہاں کا آفتاب اقبال درخشاں رہا۔ جہان آرا کے جاہ و وقعت میں روز افزوں ترقی ہوتی رہی۔ اور اُس زمانہ تک روشن آرا کے حسد میں اضافہ ہوتا رہا۔

آخر ۱۰۶۷ھ میں روشن آرا کے نصیب نے کروٹ لی۔ اور شاہجہاں کی علالت نے اُسکے بیٹوں میں خانہ جنگی برپا کر دی۔ عالمگیر بھی دکن سے بڑے کروفر کے ساتھ دار الخلافہ آگرہ کو روانہ ہوا۔ اور اثنار راہ میں داراشکوہ کی فوجوں کو شکست دیتا ہوا داخل آگرہ ہوا۔ اور یہ کوشش کرنے لگا کہ قلعہ پر کسی طرح قبضہ ہو جائے۔ اُسوقت تجربہ کار اور جہان دیدہ بادشاہ نے اُسکو ایک محبت نامہ کے ذریعہ سے مدعو کیا۔ اور اورنگ زیب بھی والد بزرگوار کی زیارت پر آمادہ ہو گیا۔ شاہجہاں نے اس موقع پر حفاظت قلعہ کا بہت کافی انتظام کیا تھا اور اسی غرض سے قلعہ کے اندر بہت سی قلماقنیاں مسلح پہرے پر متعین کر دی تھیں۔

روشن آرا نے قلعہ کا یہ سب انتظام دیکھ کر اورنگ زیب کو پوشیدہ طور پر فوراً اطلاع دی کہ وہ قلعہ میں آنے کا ہرگز ارادہ نہ کرے ورنہ جان کی خیر نہیں اور قلعہ کے سب اندرونی حالات سے بھی اُسکو آگاہ کیا۔ اورنگ زیب نے یہ متوحش خبر سُنکر عیادت شاہجہاں کے

عزم کو فسخ کیا۔ اور روشن آرا کا وہ انتہا درجہ کا مشکور ہوا کہ اُس نے اُس کی جان ہلاکت سے بچائی۔ روشن آرا کی محبت اورنگ زیب کے دل میں اُسیوقت سے متمکن ہوگئی اور وہ بھی خانہ جنگی کے زمانہ تک قلعہ کے تمام حالات سے خفیہ طور پر اُسکو آگاہ کرتی رہی۔ آخر اس خانہ جنگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب نے اپنی چالاکیوں سے قلعہ پر قبضہ کرلیا اور تھوڑے دن میں افق سلطنت تمام بغاوت کے گرد و غبار سے پاک و صاف ہوگیا۔

عالمگیر کے تخت پر جلوہ گر ہوتے ہی روشن آرا کا اختر بخت چمکا۔ شاہی خاندان میں اب اس کی سب سے زیادہ عزت ہونے لگی۔ اور پولیٹیکل امور میں بھی بادشاہ اُس سے مشورہ طلب کرنے لگا۔ اب وہی رتبہ جو جہان آرا کو عہد شاہجہاں میں تھا روشن آرا کو حاصل ہوگیا۔ اسکی جاگیر میں بھی بہت اضافہ کیا گیا۔ ارکان سلطنت اسکے در دولت پر نذر پیشکش کرنیکے لیے حاضر ہوتے تھے اور وہ اُن کو گرانبہا خلعت عطا کرتی تھی۔

روشن آرا نے جہان آرا بیگم کی طرح سے بہت جاہ و شوکت کے سامان کیے۔ اُسکی سواری کا جلوس اس شان سے نکلتا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہوجاتی تھیں۔ چنانچہ ڈاکٹر برنیر اپنے سفرنامہ میں اُس چشم دید واقعہ کی ان لفظوں میں تصویر کھینچتا ہے۔

چنانچہ آپ اپنے خیال کو کیسی ہی وسعت دیجیے مگر روشن آرا کی سواری سے زیادہ اعلیٰ درجہ کا تماشا قیاس میں نہ آئیگا۔ یہ بیگم پیگو کے نہایت عمدہ اور بڑے قدآور ہاتھی پر ایسے میگھ ڈنبر میں سوار ہوتی ہے۔ جسکے سنہری اور لاجوردی رنگوں کی چمک قابل دید ہے۔ اسکے ہاتھی کے پیچھے چھ اور ہاتھی چلتے ہیں جنپر اُسکے محل کی معزز عورتیں ہوتی ہیں اور اُنکے میگھ ڈنبر بھی شان اور خوبصورتی میں روشن آرا کے میگھ ڈنبر جیسے بلکہ تقریباً ویسے ہی ہوتے ہیں۔ شاہزادی کے بڑے بڑے اور خاص خاص خواجہ سرا بھاری بھاری پوشاکیں پہنے ہوئے گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور ہاتھوں میں چھڑیاں لیے ہوئے ہوتے ہیں اور اسکے ہاتھی کے اردگرد ایک سالہ کشمیری اور تاتاری عورتوں کا

ہوتا ہے، جو بناؤ اور سنگار کیے ہوئے خوبصورت اور بادپا گھوڑوں پر سوار ہوتی ہیں انکے علاوہ اور بہت سے خواجہ سرا گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں جنکے ساتھ بڑی بھیڑ پیدل ملازموں کی ہوتی ہے جو ہاتھوں میں بڑی بڑی چھڑیاں لیے ہوئے شاہزادی کی سواری کے دائیں بائیں بہت دور آگے آگے سامنے کے لوگوں کو ہٹاتے چلتے ہیں کہ رستہ صاف رہے۔ ان ساٹھ ستر ہاتھیوں کا تول تول کر قدم رکھنا اور میگھ ڈنبر کی چمک دمک اور نہایت خوش لباس اور بے شمار خدم وحشم کا انبوہ واقع میں دیکھنے والے کے دل پر شاہی شان وشوکت کا ایک عجب اثر ڈالتا ہے۔ میں ان سب دلفریب سامانوں کو فلسفیانہ بے اعتنائی کی نظر سے نہ دیکھتا تو بیشک میں بھی اُنہیں ہندوستانی کبیشروں کی مانند جو استعارے کے طور پر کہتے ہیں کہ "یہ شاہزادیاں نہیں بلکہ دیویاں ہیں جو ہاتھیوں پر میگھ ڈنبروں میں بیٹھی ہوئی خلائق کی نظروں سے پوشیدہ جارہی ہیں" اپنی خیالات کی بلند پروازی کا مغلوب ہوجاتا۔ یہ حسین بیگمیں اپنے میگھ ڈنبروں میں یوں دکھائی دیتی ہیں گویا ہوا میں پریاں اُڑی جارہی ہیں۔ ان بیگمات کی سواریوں کا تجمل اسقدر دلچسپ ہے کہ اس کی یاد سے اب بھی (فرانس میں) طبیعت کو ایک مسرت حاصل ہوتی ہے"

حاصل یہ کہ روشن آرا کا عروج ابتدائے سلطنت عالمگیر میں معراج کمال پر پہنچگیا تھا۔ لیکن مثل مشہور ہے کہ "ہر کمالے را زوالے" بہت جلد اسکو تنزل بھی ہوگیا۔

مورخین نے اسکی یہ وجہ لکھی ہے کہ عالمگیر تخت ہند پر بیٹھتے ہی کچھ دنوں بعد سخت علیل ہوگیا۔ اس موقع پر روشن آرا نے سب انتظامات سلطنت اپنے ذمہ لے لیے۔ اور تمام احکام اسی کے نام سے جاری ہونے لگے۔ اُس نے شاہی مُہر پر بھی قبضہ کرلیا تھا اور تمام فرامین پر وہی مُہر لگاتی تھی۔ اسی کے ساتھ اعیان سلطنت کو اُسنے عیادت بادشاہ سے محروم رکھا۔ یہانتک کہ بیگمات محل بھی عالمگیر کی حالت کو بچشم خود دیکھنے کی جرأت

نہیں کر سکتی تھیں۔ اس زمانہ میں اکیلی روشن آرا عالمگیر کی تیمار دار تھی۔ اور اسی کے حکم کے مطابق عالمگیر کا علاج ہوتا تھا۔ اس بنا پر سخت بے چینی پھیلی اور تمام لوگ روشن آرا کی ان حرکتوں سے برافروختہ ہوگئے۔

روشن آرا نے اسی کے ساتھ یہ اور غضب کیا کہ جبکہ عالمگیر کی ایک ہندو بیگم نے جسپر عالمگیر دل وجان سے فریفتہ تھا بیتابانہ محل میں داخل ہوکر شاہنشاہ کو خود دیکھنا چاہا تو روشن آرا نے اس کے نازک رخسارے پر ایسا سخت طمانچہ مارا کہ وہ تلملا گئی۔

کچھ دنوں کے بعد جب عالمگیر کو افاقہ ہوا تو اُسنے روشن آرا کی یہ نازیبا حرکتیں سُنیں اور اسکو ان باتوں سے ایسا رنج ہوا کہ روشن آرا کی اگلی وفاداری کے تمام کارناموں پر پانی پھر گیا اور وہ اسکی نظر سے اُتر گئی۔ روشن آرا کو جو پہلے جاہ و فر حاصل تھا وہ بھی اب باقی نہیں رہا۔ یہانتک کہ محل کی عورتیں بھی اُسکے سایہ سے بھاگنے لگیں کہ کہیں اس کے عتاب کے شمول میں وہ بھی معرض نقصان میں نہ پڑجائیں ؎

کون ہوتا ہے بھلا وقت مصیبت کے شریک کام جب دل پہ پڑا ساتھ جگر نے نہ دیا

لیکن اسپر بھی اورنگ زیب کا عتاب زیادہ تر دل ہی تک محدود رہا۔ اس نے روشن آرا کی جاگیر میں کسی طرح کی کمی وبیشی نہیں کی۔ نہ اُسنے کسی اور طرح پر اپنے عتاب کا عملاً اظہار کیا۔ لیکن اس شاہی عتاب نے روشن آرا کے عیش و مسرت کو منغص کردیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انسان ایک بار رفعت کے معراج کمال پر پہنچکر اپنے کو قعر مذلت میں دوبارہ دیکھنا گوارا نہیں کرسکتا۔

روشن آرا نے یہ حالت دیکھ کر عالمگیر سے اجازت چاہی کہ وہ شاہی محلسرا کو چھوڑکر کہیں اور بود وباش کا انتظام کرے۔ لیکن عالمگیر نے اس بات کو پسند نہیں کیا۔ اور اسکو دوسری جگہ رہنے کی اجازت نہیں دی۔ اس عدم اجازت کی قوی وجہ یہ تھی کہ

روشن آرا اُس زمانہ میں اورنگ زیب کی شاہزادیوں کی اتالیق تھی - اور اُن کو تعلیم دیتی تھی - عالمگیر نے سمجھا تھا کہ اس سے بہتر اتالیق شاہزادیوں کے لیے نہ مل سکے گی - اس بیگم نے بمقام دہلی انتقال کیا اور وہیں دفن بھی ہوئی -

زیب النسا بیگم

سلاطین مغل کے خاندان میں زیب النسا بیگم نہایت فاضل اور دانشمند بیگم گذری ہے اسکا نام بچہ بچہ کی ورد زبان ہو - اور تمام مورخین بھی اس کی قابلیتوں کے معترف ہیں اس کی قابلیتیں اور پولیٹکل کارنامے، اس امر کی کافی دلیل ہیں کہ ایک پردہ نشین عورت باوصف کمال پابندی پردہ کے بھی، فضل وکمال میں، نام ونمود حاصل کرسکتی ہو -

زیب النسا بیگم - عالمگیر کی پیاری بیٹی تھی - یہ پانچویں فروری ۱۶۳۹ء کو پیدا ہوئی اس کی چار اور بہنیں تھیں - لیکن جو دولت علم وفضل اسکو نصیب ہوئی وہ اسکی بہنوں کو تو کیا شاہی خاندان میں بھی سوائے ایک آدھ کے کسی کو حاصل نہ ہوئی -

بادشاہ عالمگیر نے صغرسنی میں اس کی تعلیم کی طرف کافی توجہ مبذول کی - پہلے روشن آرا بیگم کے سپرد اس کی تعلیم ہوئی - تھوڑے ہی سے سن میں اس نے کلام مجید حفظ کرلیا - بادشاہ نے اس موقع پر ایک جشن نہایت دھوم دھام سے کیا جسمیں تمام علماء وصلحاے زمانہ مدعو کیے گئے تھے - اور سب بادشاہ کی سخاوت سے فیضیاب ہوئے زیب النسا بیگم کو بھی تیس ہزار اشرفیاں انعام میں دیں -

ختم قرآن کے بعد، زیب النسا بیگم کو ملا جیون صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا - جو ایک نامور مصنف تھے، اور وہ عالمگیر کے بھی اُستاد رہ چکے تھے - زیب النسا بیگم

نے ان سے تمام کتابیں پڑھیں۔ اسکے علاوہ زیب النسا کو خوشنویسی کا بھی بہت شوق تھا
چنانچہ پایہ تخت کے مشہور خوشنویسوں سے اسنے مختلف قسم کے خط سیکھے نستعلیق،
نسخ اور شکستہ میں اسے کمال تھا۔ تمام ہمعصر اسکے خط کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے
تھے اور وہ اسوجہ سے نہیں کہ بادشاہ وقت کی بیٹی کا خط ہی، بلکہ اسوجہ سے کہ وہ بجائے خود
کمال فن کا قطعی نمونہ تھا۔

زیب النسا بیگم کو انتہا درجہ کا علمی مذاق تھا۔ وہ اور بیگمات کی طرح آرام طلبی میں منہمک
نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے اوقات کا زیادہ حصہ علمی اشغال میں صرف کرتی تھی۔ اور یہی چیزیں
اسکے دل بہلاؤ کا ذریعہ بنی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اسکے پاس ایک ایسا کتب خانہ تھا جس میں
تمام علوم کی کتابیں جمع تھیں۔ جہاں اسکو کسی نادر کتاب کا پتہ چلا اُسنے فوراً منگوالی
اسی طرح پر اسکا کتب خانہ تمام نادر اور بیش بہا کتابوں کا مجموعہ تھا۔ اور وہ اپنے عزیز اوقات
کو اس چمن کی سیر میں گزارتی تھی۔ اسکے کتب خانہ میں زیادہ تر مذہبی اور ادبی مذاق کی
کتابیں تھیں۔

اسکے علاوہ زیب النسا بیگم اہل علم و کمال کی حد درجہ قدردان تھی چنانچہ اسکے
ملازمین میں زیادہ تعداد ایسے اشخاص کی تھی جو اُس زمانہ میں علم و فضل میں خصوصیت کے
ساتھ ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے سپرد علمی کام تھے۔ ان میں سے زیادہ تر شاعر
مصنف اور خوشنویس تھے۔ علما عمدہ اور مفید کتابیں تصنیف کرتے تھے بعض کے
سپرد ترجمہ کا کام تھا۔

اُن کتابوں میں سے جو اُسکے عہد میں ترجمہ ہوئیں ایک زیب التفاسیر ہی جو اُس کے
نام سے منسوب ہے۔ یہ ترجمہ قرآن کی مشہور تفسیر تفسیر کبیر کا ہی۔ جو امام رازی کی نامور تصنیف ہے
اسکا ترجمہ ملا شفیع الدین عرض بیگی نے کیا تھا جنکو بیگم مذکور نے کشمیر میں اس کام پر مقرر کیا
تھا۔ اسکے علاوہ زیب النسا نے اور بہت سی کتابیں ترجمہ و تصنیف کرائیں تھیں

لیکن افسوس ہے کہ ان کی زیادہ تعداد آج صفحۂ عالم سے ناپید ہے۔

زیب النسا بہت بڑی سخن سنج اور سخن فہم تھی۔ فی البدیہ شعر کہنے میں اُسے ید طولےٰ حاصل تھا۔ کہتے ہیں کہ فارسی کے نامور شاعر ناصر علی سے زبان شعر میں اس سے سوال و جواب ہوتے تھے۔ چنانچہ اسکے اکثر شعر زبان زد خاص و عام ہیں۔ لیکن ہم کو اسکے ماننے میں کلام ہے کیونکہ وہ اشعار اسقدر تہذیب و شائستگی سے دور ہیں، کہ عقل ایک لمحہ کو باور نہیں کر سکتی کہ اتنی بڑی فاضل اور خدا پرست بیگم کے منہ سے ایسے لفظ نکلے ہونگے۔ اور نہ دیانت یہ تسلیم کر سکتی ہے کہ ایسے بادشاہ اجل کی بیٹی کو جسکے نام سے دل دہلتے تھے ایک ادنی آدمی نے، ایسے الفاظ میں مخاطب کیا ہوگا۔

زیب النسا بیگم کا تخلص مخفی تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ "دیوان مخفی" اسی کی تصنیف ہے لیکن اس میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک ایرانی اُستاد کا طبعزاد ہے۔ لیکن یہیں ایک غزل کا مقطع اس خیال کی تردید کرتا ہے۔ اگر یہ شعر اضافہ کا نہو تو ہم کو بھی اُسے زیب النسا کے کلام ماننے میں کچھ تامل نہیں ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

دختر شاہم ولیکن رو بہ فقر آوردہ ام
زیب و زینت بس ہمینم نام من زیب النسا است

حاصل یہ کہ زیب النسا بہت بڑی سخنگو تھی۔ لیکن جو شعر اس سے منسوب کیے جاتے ہیں انکے زیب النسا کے طبعزاد ہونیکا کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے۔

سلاطین مغل کی ملکی سیاست میں اکثر بیگمات نے بھی بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ مثلاً جہانگیر کے عہد میں نورجہاں بیگم نے روح رواں کا کام دیا۔ شاہجہاں کی ابتدائی سلطنت میں ممتاز محل کا بہت کچھ اثر تھا۔ ممتاز محل نے جب وفات پائی تو اس کی فاضل بیٹی جہاں آرا بیگم نے امور سلطنت میں بہت کچھ دخل دیا۔ اور زیادہ تر کام اُسی کی رائے سے ہوتے تھے جب عالمگیر تخت پر بیٹھا تو روشن آرا کا ستارہ چمکا۔ کیونکہ خانہ جنگی کے زمانہ میں عالمگیر کی

طرفدار بھی اور قلعہ کی تمام خبریں خفیہ طور پر پہنچاتی تھی۔ اسوجہ سے عالمگیر اُس کا بہت ممنون احسان تھا۔ اور اُسکے ساتھ دلی محبت رکھتا تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام امور ریاست اُسی کی رائے سے انصرام پاتے تھے۔ فرامین کا نفاذ اسکے حکم پر منحصر تھا۔ لیکن اُسکا یہ عروج زیادہ عرصہ تک نہیں رہا۔ جب زیب النساء کے علم و فضل اور روشن دماغی کا سکہ تمام دلوں پر بیٹھ گیا۔ بادشاہ بھی اُس سے زیادہ محبت کرنے لگا۔

اُسی زمانہ میں ایک اور حادثہ وقوع میں آیا۔ جو روشن آرا کی قسمت کا فیصلہ تھا سنہ ۱۶۶۴ء میں عالمگیر سخت علیل ہو گیا۔ ہمیشہ اُسپر غشی طاری رہتی تھی۔ روشن آرا اُس کی تیماردار تھی اور کسی متنفس کو اُس مکان میں، جہاں عالمگیر تھا وہ جانے نہیں دیتی تھی۔ مکان کے باہر قلمانیوں کا سخت پہرہ رہتا تھا۔ بادشاہ کی حالت مزاج سے کسی شخص کو آگاہی نہیں ہو سکتی تھی۔

روشن آرا اس کوشش میں تھی کہ عالمگیر اگر وفات پائے تو اس کی جگہ، شاہ عالم اسکا بڑا بیٹا جو ایک رانی کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور مستحق سلطنت بھی تھا تخت نشین نہو۔ بلکہ اُسکے چھوٹے بھائی کو تخت ملے۔ لیکن اس کی عمر اسوقت صرف چھ سال تھی۔ اسکے لیے اُس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ اسکے جوان ہونے تک میرے ہاتھ میں عنان سلطنت رہیگی۔ اس غرض سے اُسنے شاہی مُہر بھی عالمگیر کے ہاتھ سے نکال لی تھی۔ اور تمام فرامین اُس زمانہ میں اعظم شاہ کے نام سے جاری ہونے لگے۔ تمام صوبہ داروں۔ راجاؤں اور عاملوں کو بھی اس مضمون کے خط اُسنے بھیجدیئے۔

محلسرا میں ہر ایک سخت اضطراب میں تھا۔ کسی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بادشاہ زندہ ہے یا انتقال کر گیا۔

آگرہ میں عام طور پر یہ چرچا تھا کہ عالمگیر اب بچ نہیں سکتا۔ اسکے بعد شاہجہان (جو قلعہ آگرہ میں قید تھا) پھر سلطنت حاصل کریگا۔ لیکن عالمگیر کا خوف اسقدر تھا کہ اُسکے زمانہ علالت میں بغاوت کے لیے ایک ذرہ بھی نہیں ہل سکا۔

آخر خدا خدا کر کے عالمگیر کو افاقہ ہوا۔ اُسنے اس خوشی میں دہلی میں ایک جشن نہایت دھوم دھام سے کیا۔ اس جلسہ میں اعلیٰ سے ادنیٰ طبقہ تک کے لوگوں کو شرکت کی اجازت تھی۔ رعایا نے اپنے بادشاہ کو دوبارہ تخت پر بیٹھے دیکھ کر جو خوشی کی اس کی کوئی حد نہ تھی

بادشاہ کا روشن آرا کی ان حرکتوں کے باعث اُسپر سخت قہر عتاب نازل ہوا۔

روشن آرا کا زوال زیب النسا کے عروج کا زینہ تھا۔ اب اس بیگم نے بہت کچھ اختیار حاصل کر لیا۔ اور امور سلطنت میں بھی دخل دینے لگی۔ اہم معاملات میں بادشاہ اس سے استصواب رائے کرنے لگا۔ اُسکے علم و فضل فہم و دانش نے اس کی وقعت اور اثر کو دوبالا کر دیا تھا۔

منوچی لکھتا ہی کہ "زیب النسار کی بحیثیت سلطنت مغلیہ کے ایک روشن تر ستارہ ہونے کی پرستش کیجاتی تھی" اسوقت اس کی عمر پچیس سال کی تھی۔ بادشاہ کو ہنوز شفائے کامل حاصل نہوئی تھی۔ زیب النسار نے اسے سفر کشمیر کی صلاح دی۔ لیکن دو امور بادشاہ کو اس ارادے میں سدّ راہ تھے۔ اول یہ کہ موسم گرما کی حرارت اسکی تندرستی کے لیے شاید مضر ثابت ہو۔ دوسرے یہ کہ شاہجہاں ابتک زندہ تھا۔ عالمگیر کو خوف تھا کہ دار الخلافت چھوڑنے سے کہیں بغاوت کا ہنگامہ برپا نہو۔ کیونکہ شاہجہاں کے ابتک بہت لوگ ہمدرد تھے۔

بعض مورخین نے لکھا ہی کہ اس موقع پر عالمگیر کا ارادہ ہوا کہ بھائیوں اور بھتیجوں کی طرح باپ کی بھی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ چنانچہ اسکے متعلق زیب النسار سے بھی اُس نے مشورہ لیا۔

زیب النسا نے اسکی بہت زوروں کے ساتھ مخالفت کی۔ اور بادشاہ کو اس گناہ عظیم کے ارتکاب سے بچایا۔ اور یہ سمجھا دیا کہ وہ تو اب خود شیخ فانی ہیں۔ ۷۵ برس کی انکی عمر ہو گئی تندرستی کا یہ حال ہے۔ اعلیٰحضرت چند روز اور صبر کریں۔ انکے مرنے میں کچھ دیر نہیں۔

ایسی حالت میں کیا ضرور ہی کہ اتنا بڑا گناہ عظیم اپنے سر لیں۔ اور ملک میں بدنام ہوں۔

آخر تھوڑے دنوں کے بعد، شاہجہاں کا انتقال ہوگیا۔ اور عالمگیر سے زیب النساء نے سفر کشمیر کی پھر تحریک کی۔ عالمگیر رضی ہوگیا چھٹی دسمبر کو دہلی سے روانہ ہوا۔ برنیر لکھتا ہی کہ اس موقع پر بادشاہ کے ہمرکاب پینتیس ہزار سوار اور دس ہزار پیادہ تھے ستر توپیں بھی تھیں۔ زیب النساء نے ایک مرتبہ جہان آرا کو شاہجہاں کے ساتھ نہایت دھوم دھام کے ساتھ سفر کشمیر کرتے دیکھا تھا۔ اور اُسی وقت سے اسکی تمنا تھی کہ میں بھی اُسی طرح پر سفر کروں۔ چنانچہ اس موقع پر اُسنے تمام حوصلے نکالے۔ زیب النساء ایک بلند اور خوبصورت ہاتھی پر سوار تھی جسکا ہودج سونے کا بنا ہوا تھا اور اُس میں بیش قیمت جواہر لگے ہوئے تھے۔ ہاتھی کے اردگرد دور تک قلمانیوں اور خواجہ سراؤں کی جماعت رہتی تھی۔ اسکے پیچھے پیچھے اور بیگیات کے ہاتھی تھے۔ یہ منظر قابل دید تھا۔ زیب النساء نے اس سفر میں بہت زیادہ سخاوت اور دریا دلی سے کام لیا تھا۔

زیب النساء کی شادی نہو سکی۔ سلاطین مغل کی اکثر لڑکیاں شادی سے محروم رہیں۔ اسکی وجہ یہ ہی کہ وہ لوگ شادی کے لیے اپنے مقابل کا آدمی چاہتے تھے۔ دوسرے اُن لوگوں سے بغاوت کا بھی کھٹکا لگا رہتا تھا۔

زیب النساء کے دامن عصمت پر بازاری گیتوں نے بڑا دھبا لگا رکھا ہی۔ بعض ملک کے کوتاہ اندیش، اس کی اشاعت کرتے پھرتے ہیں۔ اور ان نقلوں سے مجلسوں کی دلچسپی بڑھاتے ہیں۔ ان بے اصل روایتوں کے سرچشمہ حضرات مورخین یورپ ہیں جنکو ایسے بے سروپا قصے گھڑنے میں خاص ید طولیٰ حاصل ہی۔ اور برنیر اور ٹورنیر تو اس گروہ کے پیشوا ہیں۔

زیب النساء نے ۱۷۰۲ء میں چھ سال اپنے والد بزرگوار سے پیشتر وفات پائی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ لاہور میں دفن ہوئی۔ لیکن یہ بالکل غلط ہی۔ وہ باغ جو اُسکا مدفن

قرار دیا جاتا ہے بیشک اُسی کا باغ ہے جسکو اُسنے میابائی اپنی انا کو ہبہ کردیا تھا۔ اُس میں وہ دفن نہیں ہوئی۔ سرسید مغفور لکھتے ہیں کہ وہ دہلی میں زینت المساجد میں مدفون ہوئی۔ لیکن مجھے اس سے بھی اختلاف ہے۔ غالباً وہ مسجد اُس کی بہن زینت النسا کی ہے۔ اور اُس میں وہی دفن ہے۔

پنجاب کے بہترین مورخ اور ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز شمس العلماٗ مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ اس کی قبر بیرون دہلی تھی میں نے اسکی قبر خود دیکھی تھی اسکا کتابہ جس میں آیت "فادخلی فی جنتی" بھی شامل تھی جس سے عالمگیر نے اسکا سن وفات نکالا تھا اپنے آنکھوں سے دیکھا تھا۔ افسوس کہ اسکے سینہ پر اب ریل جاتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

صاحب جی

عہد شاہجہاں بادشاہ میں جن امیروں کو عروج ہوا تھا اُن میں نواب علی مردان خان سب سے ممتاز ہیں۔ اس نامور امیر کی شان و شوکت اور جوانمردی و دانائی کی نظیر دیجاتی تھی۔ کشمیر اور پنجاب دو صوبوں کے حاکم تھے۔ گرمی کی بہار کشمیر میں جاڑے کا لطف پنجاب میں حاصل تھا۔ امیر الامرا دربار شاہی سے خطاب ملا تھا۔ بلخ میں اُزبک بہادروں کے مقابلہ میں اُن کی تلوار نے [illegible]دی کے جوہر دکھائے تھے۔ اپنے ولی نعمت شاہجہاں بادشاہ کی ایکبار دعوت کی تو سو قابیں مع سرپوش سونے کی اور تین سو قابیں مع سرپوش چاندی کی نعمت خانہ میں لگائی گئیں۔ دار السلطنت لاہور میں دریائے راوی سے نہر لاکر چشمہ فیض جاری کیا تھا۔ یہ وہی نہر تھی جسکے کنارہ پر مشہور شالامار باغ خلیل اللہ خان کے اہتمام سے آٹھ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا تھا چند اونچے نیچے ٹیلے تھے جنکو کاریگروں نے بہار نظر بنادیا۔ اسی نامور امیر

کی بیٹی وہ بیگم تھی جسکے حیرت انگیز کارنامے آج ہم سُنا تے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں بہت سی بیگمات ایسی گذری ہیں جنکے نام سے قابلیت کے جوہر آجتک روشن کر رہے ہیں۔ مثلاً بادشاہ بیگم نور جہاں۔ شاہزادی جہان آرا بیگم۔ زیب النسا بیگم وغیرہ وغیرہ۔ یہ بیگمات علم و ادب سلیقہ و تمیز میں ایسی ممتاز تھیں کہ ابتک ہماری سوسائٹی اُنکے ہُنر کی اور ہمارا لٹریچر اُن کی تصنیفات کا ممنون ہے۔ لیکن ہماری ہیروئن کے کارنامے اُنسے مختلف ہیں۔ اُس کی لیاقت کے جوہر ملک داری اور جنگ کے میدان میں چمکے ہیں۔ کابل کا صوبہ پہاڑوں کی کثرت اور پٹھانوں کی جرات کے سبب ہمیشہ سے سرکش اور خود سر رہا ہے تیموریہ سلاطین کے زمانہ میں وہاں بڑے بڑے معرکے ہوئے ہیں۔ بادشاہی فوج کو غلبہ ہوا تو دب گئے۔ جب موقع ملا پھر بگڑ بیٹھے۔ عالمگیر بادشاہ کے زمانہ میں بھی وہاں شورش کا زور شور تھا۔ ایمل خاں افغاں نے بادشاہی کا خطاب لیکر سکہ اپنے نام کا جاری کر رکھا تھا۔ بہت سی ناکامیابی کے بعد کابل کی حکومت امیر خاں میر میراں کے سپرد ہوئی۔ اس امیر میں بہادری و تدبیر دونوں جمع تھیں۔ اول اُسنے تلوار کے زور سے سرکشوں کو قابو میں کیا اُسکے بعد تالیف قلوب کے ذریعہ سے اُنکے دل ہاتھ میں لیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شورش برطرف ہوگئی۔ اور ہر طرف امن و امان کی برکت نظر آنے لگی۔ بائیس برس میر میراں باجاہ و جلال اس صوبہ پر فرمانروان رہا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ سر اُٹھاتا یا پاؤں نکالتا۔ امیر الامرا علی مردان کی بیٹی جنکا لقب صاحب جی تھا۔ امیر خاں میر میراں کی بیگم تھیں۔ اس بیگم کو جو تدبیر اور اولوالعزمی عالیجاہ باپ سے ترکہ میں ملی تھی اُس میں والا مرتبہ شوہر کی ہمنشینی سے اور زیادہ ترقی اور قوت حاصل ہوگئی تھی۔ صوبہ کابل کے بندوبست اور انتظام میں اپنے شوہر کی شریک اور مشیر رہتی تھی۔ اور بہت سے عمدہ کام اُس کی معاملہ فہمی اور تدبیر کی وجہ سے انجام پذیر ہوتے تھے۔

عالمگیر بادشاہ ایک روز شب کو تخلیہ میں صوبوں کی رپورٹیں ملاحظہ فرمارہے تھے

صوبہ کابل کی رپورٹ جو پڑھی تو اُس میں نواب امیر خاں کی وفات کی خبر درج تھی۔ بادشاہ کو سخت تردد ہوا اور فوراً نواب ارشد خاں کو (جو مدت تک کابل میں دیوان رہے تھے اور وہاں کی حالت سے خوب واقف تھے) یاد فرما کر ارشاد کیا" امیر خاں نے انتقال کیا ایسے سرکش ملک کا بے سر رہجانا خطرہ سے خالی نہیں۔ اندیشہ ہے کہ دوسرے صوبہ دار کے پہنچنے تک وہاں بغاوت نہ پھیل جاوے" ارشد خاں نے جرأت کرکے عرض کی کہ پیر و مرشد امیر خاں زندہ ہیں۔ کون کہتا ہے کہ مر گئے۔ بادشاہ نے کہا کہ کابل کی رپورٹ ابھی ملاحظہ ہوئی ہے۔ ارشد خاں نے کہا کہ پیر و مرشد نے بجا ارشاد فرمایا۔ لیکن افغانستان کا انتظام صاحب جی کی تدبیر و دانشمندی کے دامن سے وابستہ ہے۔ جبتک وہ وہاں ہیں بدانتظامی ناممکن ہے۔ فوراً اُس مدبرۂ روزگار کے نام فرمان شاہی صادر ہوا کہ جبتک شاہزادۂ شاہ عالم وہاں پہنچیں افغانستان کو قابو میں رکھو۔

صاحب جی کو جو مشکل مرحلے پیش آئے اُن کا بیان دشوار ہے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ اُس خطرناک کوہستان میں سے لشکر سلامت لے آنا بڑے بڑے جوانمردوں کو نصیب نہیں ہوا۔ اس قول کی تائید ہمارے زمانہ کے معرکوں سے بھی ہوتی ہے۔

الغرض سب سے اوّل مرحلہ صاحب جی کو یہی پیش آیا کہ لشکر کا انتظام قائم رکھنا اور سلامتی سے کوہستان طے کرکے میدان میں پہنچنا تھا۔ اور اس کی باتدبیر بیگم نے وہ تدبیر سوچی کہ ذرا بھی بدنظمی نہیں ہوئی۔ امیر خاں کی وفات کا حال پوشیدہ رکھا امیر خاں کا لباس ایک ہمشکل شخص کو پہنا کر اور آئینہ دار پالکی میں بٹھا کر فوج کا کوچ جاری رکھا افسر و سپاہی یہ سمجھتے کہ اُن کا سردار زندہ ہے۔ چنانچہ ہر روز صبح کو حسب قاعدہ پالکی کے سامنے آکر مجرا کرتے تھے۔ جب فوج کوہستان کو طے کر آئی تو صاحب جی نے صورت حال سے پردہ اُٹھا دیا۔ اور وفات امیر خاں کا اعلان کرکے سوگ میں بیٹھیں۔ یہ خبر سنکر کثرت سے افغانستان کے سردار تعزیت کو آئے۔ تعزیت کے پردہ میں غالباً یہ بھی مطلب ہوگا کہ لشکر کی حالت

جانچکر یہ فیصلہ کریں کہ اب اُن کو کیا کرنا چاہیے اطاعت یا بغاوت۔ صاحب جی نے سب کو نہایت عزت اور تپاک سے لیا اور ٹھیرایا۔ فاتحہ کے بعد اُسنے کہلا بھیجا کہ اگر بادشاہ کی فرماں برداری کروگے تو جو تمہارا وظیفہ مقرر ہے وہ بدستور جاری رہے گا۔ اور اگر سرکشی کا حوصلہ ہو تو بسم اللہ آؤ اسی میدان میں فیصلہ ہو جائے۔ اگر میں عورت ذات غالب آگئی تو قیامت تک نام روشن رہیگا۔ افغانی سردار جانتے تھے کہ یہ الفاظ کسی معمولی پردہ نشین بیگم کے نہیں ہیں۔ صاحب جی کی زبان سے نکلے ہیں سب نے سر جھکا دیا اور اطاعت و فرماں برداری کا ازسر نو عہد کرکے اپنے اپنے گھروں کو واپس گئے۔ شاہ عالم کے کابل پہنچنے میں عرصہ لگا اور اس مدت میں صاحب جی نے بندوبست و انتظام پوری قوت سے جاری رکھا۔

دو برس کامل کابل کا انتظام کرکے یہ بانوے عصمت آئیں بمقام برہان پور دربار شاہی میں پہنچی اور بادشاہ مجازی سے اجازت لیکر خداوند حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہونے کیواسطے سفر حجاز اختیار کیا۔ ملک عرب میں بھی اُسکے فیض و سخاوت نے اپنے جوہر دکھائے اور شریف مکہ وغیرہ عمائد نے نہایت اعزاز و توقیر سے اُن کا استقبال کیا۔ صاحب جی کی کوئی اولاد نہ تھی اپنے شوہر کے بچوں کو مثل اپنی اولاد کے پالا تھا۔

جب برہان پور میں بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوئیں تو اس امانت کو دربار کے سپرد کیا ان لڑکوں میں کئی نامور عہدوں پر ممتاز ہوئے۔

ایک بار صاحب جی کی پالکی ایک کوچے سے گذر رہی تھی کہ ناگاہ ایک مست بادشاہی ہاتھی سامنے سے آگیا۔ بیگم کے چوبداروں نے ہر چند فیلبان کو آواز دی کہ ہاتھی ہٹاؤ مگر مہاوت شاہی ملازمت کے نشہ میں تھا ایک نہ سُنی اور ہاتھی کو برابر لے آیا جب قریب آگیا تو بیگم کے آدمیوں نے سونڈ میں تیر مارے۔ ہاتھی ان لکڑیوں کو کیا خطرہ میں لاتا۔ جھپٹ کر پالکی پر سونڈ ڈالی کہاروں نے خوف زدہ ہو کر پالکی زمین پر پٹک دی اور اک طرف کو

بھاگ گئے۔ بہادر بیگم کے حواس اب بھی قائم تھے۔ جوں ہی ہاتھی کی سونڈ پالکی پر آئی جست کر کے ایک صراف کی دوکان میں جو قریب تھی ہو رہی۔ اور کوٹھری میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ اُس زمانہ کی غیرت بھی عجیب تھی۔ امیر خاں اسپر بگڑ گئے کہ کیوں پردہ سے باہر نکلی۔ کچھ عرصہ تک کھنچے رہے۔ آخر رعیت نواز بادشاہ نے یہ سمجھا کر باہم مصالحت کرا دی کہ بیگم نے اپنا پردہ اور تمہارا ناموس قائم رکھا اگر ہاتھی سونڈ میں لپیٹ کے اُچھال دیتا تو کیا ہوتا۔

زوجہ داؤد خاں پنی

ہندوستان نے بھی زنانہ بہادری، شوہر پرستی اور وفا شعاری کے عنوان میں جو مثالیں قائم کی ہیں۔ وہ انگلستان بلکہ یورپ بھر سے کسی طرح گھٹی ہوئی نہیں، بلکہ اگر انصاف کی عینک لگا کر دیکھیں تو یہاں کی جانبازانہ دلیریاں کچھ عجب خاموش اور تلوار سے زیادہ کارگر ہونے والے اثر سے بھری ہوئی ہیں۔ بلاشبہ کوئن ایلین کا چپ چاپ نہ سر چوس کر اپنے خاوند کی ناگہانی موت کے موذہ میں اپنے آپ کو دیدینا جان پر کھیل جانے کا انتہائیہ ٹکٹ ہی۔ جون آف آرک فرانس کی کنواری کا متعدد نبرد آزمائیاں کر کے اپنے وطن کو انگلستان کے پنجہ سے نجات دلانا عظیم بالشان تاریخی واقعہ ہی۔ لیڈی تھس ڈیل کا بھیس بدلکر شاہی قید خانہ سے اپنے خاوند کو چھڑا کر نکال لانا بہت بڑی چالاکی، اور شہزادی میٹلڈا کا بادشاہ سٹیون کو اپنی حق یابی کے لیے برسوں چین نہ لینے دینا، فرقہ نسواں کی علو ہمتی و جوانمردی وغیرہ کی اعلیٰ مثالیں ہیں جن پر یورپ جسقدر ناز کرے بجا ہی۔ لیکن ذیل میں جو واقعہ میں بیان کرنے والی ہوں، نوعیت میں وہ بھی اپنا آپ ہی نظیر ہے۔

افسوس ہی کہ زنانہ کارگزاریوں کو ہمارے مورخین نے بہت بے اعتنائی کی نظر سے

دیکھا ہی۔ اس فرقہ کا کوئی فعل خواہ وہ اخلاقی ہو یا تمدنی۔ علمی ہو یا ملکی ہندستان کیا تمام ایشیائی
مورخین کے نزدیک چنداں قابل توجہ اور وقعت تھا ہی نہیں۔ اگر شاید کسی نے چلتے چلتے
کچھ لکھدیا ہی تو وہ بالکل اوٹ پٹانگ اور ایسے ایجاز مخل کے ساتھ جس سے صاف ظاہر ہوتا
ہی کہ یہ لوگ تاریخی فلسفہ سے کماحقہ واقف نہ تھے۔ گویا وہ جانتے ہی نہ تھے کہ اس قسم کی
مثالیں نسل انسانی پر کیا اثر ڈالتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عظیم الشان مردانہ کارگزاریوں
نے دنیا میں تغیرات عظیم پیدا کیے ہیں۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ نازک و کمزور عورتوں کے
دل و دماغ یا دست و بازو سے جو کچھ ہو گزرا اسکا فوری اثر خنجر خوں ریز سے زیادہ گہرا اور جادو
سے زیادہ زوردار ہی۔ بلکہ اگر اسکو زندہ جادو کہیں تو بجا ہی۔ حق یہ ہی کہ اس گر کو اہل یورپ
نے خوب پایا ہی۔ تاریخ کے زنانہ حصے سے اُنھوں نے یہانتک اعتنا کیا ہی کہ اگر کوئی واقعہ
جھوٹا یا مشتبہ بھی ہی اور زباں زد خلائق ہو گیا ہی تو اسکو بھی داخل تاریخ کرنے سے باز
نہیں رہے ہیں۔ پھر وہ بھی اُسی شد و مد۔ دلچسپی اور اثردار لفظوں میں جیسے کہ کوئی
سچّا واقعہ لکھتے ہیں۔

مثلاً کوئن ایلین کے زہر چوسنے کا قصہ بالکل فرضی اور بے بنیاد ہی مگر چونکہ طبیعت
میں مہر و وفا ثابت قدمی و استقلال کے پیدا کرنے یا چمکانے کا ایک اچھا منتر ہی۔ اسلیے اسکو
بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ پھر بیان میں وہی زور شور جس سے خواہ مخواہ ایک عمدہ اشتعال پیدا
ہو۔ واہ رے اہل یورپ! فلسفہ تاریخ کے اس باریک اور نازک نکتہ پر پہنچکر اس سے وہ فوائد
حاصل کیے جنکو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ انکی عورتیں اور بچے تک ہمارے مردوں سے
زیادہ دلیر، ذہین، کارگزار اور زندہ دل ہیں۔ برخلاف اسکے ایک ہمارے مورخین ہیں کہ چاہے
عورت کیسے سے کیسا ہی مردانہ اور غیر معمولی کام کر گزرے نہ اُسکے نام سے غرض، نہ اُس سے
مطلب کہ وہ کب پیدا ہوئی اور کب مری۔ اور دوسری باتیں تو درکنار گویا ایک عورت ہونا اسکی
ہزار خطاؤں کی ایک خطا ہی جسکی سزا میں اُسے گمنام ہی رہنا چاہیے۔ افسوس!

میرانشاں جو کوچۂ قاتل میں ڈھونڈھیے　　　اک مشتِ خاک وہ بھی اُڑائی ہوئی سی ہے

جس واقعہ کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ ایک فرخ سیری سردار داؤد خاں کی بیوی کا ہے۔ جب فرخ سیر اور اسکے سپہ سالار اور امیرالامرا حسین علیخاں میں کھٹ پٹ ہوئی۔ اور حسین علیخاں کی خیرہ سری اور جاؤ بیجا دباؤ نے بادشاہ کا ناک میں دم کیا تو بادشاہ نے اسکو داؤد خاں نپی صوبہ احمد آباد گجرات کے مقابلہ کے لیے بھیجا کہ کہیں اسی بہانہ قصہ پاک ہو جاوے اس بلائے بے درماں سے پیچھا چھوٹے۔

داؤد خاں قوم کا افغان اور دلیری وجانبازی میں سلطنت کے چیدہ سرداروں میں سے تھا۔ جب حسین علیخاں نے ایک بڑے لشکر کی سرکردگی میں داؤد خاں پر فوج کشی کی۔ اور قریب پہنچکر کہلا بھیجا کہ حاضر ہو کر تجدید اطاعت کرے۔ تو اُسنے آنے سے انکار کیا۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ کے اشارے سے ایسا کیا تھا۔ اُس کی رفاقت میں بھی بڑے بڑے جانباز سپاہی اور دلیران وقت موجود تھے۔ چنانچہ دونوں طرف سے مقابلہ کی پوری تیاریاں ہونے لگیں۔

داؤد خاں کی بیوی ایک ہندو زمیندار کی بیٹی تھی۔ جس سے اُسکی باقاعدہ شادی ہوئی تھی۔ یہ بیوی داؤد خاں کے عمدہ برتاؤ، شریفانہ سلوک اور خالص محبت کی وجہ سے مسلمان ہو گئی تھی۔ اور اسکے ساتھ ایسی ہی وفادار تھی جیسی کہ ایک بیاہتا بیوی ہونی چاہیے۔

داؤد خاں بھی اس کی عمدہ صفات کی وجہ سے اسکو جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ جب تیار ہو کر حسین علیخاں کے مقابلہ کے لیے چلا تو سب سے پہلے بیوی کے پاس رخصت ہونے کو آیا۔ اور نہایت الفت وعظمت بھرے الفاظ میں اس سے میدان جنگ کی اجازت چاہی۔ بیوی نے آبدیدہ ہو کر کہا میرے لیے کیا حکم ہے۔

داؤد خاں نے کہا کہ پیاری بیوی! تم ایک معزز سردار کی بیٹی اور ایک بہادر سپاہی کی ننگ وناموس کی مالک ہو۔ کسی ہدایت کی تم کو ضرورت نہیں۔ تم خود اپنے اور اپنے خاوند کے درجے سے واقف ہو۔ اور اُس کی عزت وحرمت کے محفوظ رکھنے کے طریقہ سے

آگاہ ہو۔ میں نے تم کو خدا کے اور اپنے شوہری حقوق کو تمہارے سپرد کیا۔ داؤد خاں تو یہ کہکر بڑے اطمینان کے ساتھ میدان کارزار کی طرف روانہ ہوا۔ دانشمند اور دلیر بیوی نے اپنے محل سے میدان جنگ تک ہرکاروں کی ڈاک بٹھادی تاکہ دم دم کی خبریں اُسے پہنچتی رہیں اور لڑائی کے اُتار چڑھاؤ کو وہ خود جانچ سکے۔

دونوں لشکروں میں مقابلہ شروع ہوا۔ افغانی سرداروں سے لگا کر سپاہیوں تک نے مردانگی کا حق ادا کر دیا۔ کئی دفعہ امیر الامرائی جمعیت کے پرخچے اُڑا دیئے۔ لیکن آخر میں حسین علیخاں کے لشکر کو غلبہ ہونا شروع ہو گیا۔ اب داؤد خاں خود مقابلہ کے لیے نکلا۔ اسنے کئی بار کوشش کی کہ حسین علیخاں کو قتل کرکے فرخ سیر کی مصیبت کا خاتمہ کردے۔ مگر خدا کی مرضی اسکے برعکس تھی۔ داؤد خاں کی بہادر بیوی محل میں بیٹھی بذریعہ خبرداروں کے یہ ساری خبریں پا رہی تھی جسوقت تک افغانیوں کا پلہ بھاری رہا اسے چنداں فکر نہوئی۔ مگر جب اُسنے سُنا کہ تمام چیدہ چیدہ افغانی سردار کام آچکے۔ اور اب خود داؤد خاں کی باری آگئی تو وہ خود اپنی تدبیر میں سرگرم ہو گئی۔

اُس نے اپنی ایک خواص کو حکم دیا کہ میاں کی فلاں پیش قبض لاکر جلدی سے میرے پاس رکھدے۔ خواص کو حکم کی تعمیل بغیر چارہ نہ تھا۔ تمام محل پر ایک ہیبتناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کیونکہ سب کے سب اپنے آقا کے انجام کی فکر کے علاوہ اپنی بیوی کی تہورانہ دلیری کی طرف سے دل ہی دل میں سہمے جاتے تھے۔ جانباز رانی کے تیوروں سے لونڈی باندیاں" مامائیں اصیلیں تاڑ چکی تھیں کہ ایسی ویسی خبر پاتے ہی ضرور جان پر کھیل جائیگی۔

یہ لوگ زیادہ تر اس وجہ سے اور بھی خائف تھے کہ داؤد خاں کی بیوی حاملہ تھی۔ میدان نبرد کی خبریں ہر آن چلی آتی تھیں۔ آخر ہرکارے نے خبر دی کہ داؤد خاں کا ہاتھی دشمنوں میں گھر گیا۔ اور آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ بہادر بیوی فوراً سانولی ہو گئی۔ اپنی خاص معتمد خواص کو اپنے پاس بُلا کر بٹھالیا۔ اور آخری فیصلہ کے انتظار میں ہمہ تن گوش ہو گئی۔

چند لمحے نہ گزرنے پائے تھے کہ خواس باختہ ہرکارے نے رو کر سنایا کہ افسوس دشمنوں نے ہماری امید کا اور تیر قضا نے داود خاں کا فیصلہ کر دیا۔

اس قیامت خیز خبر نے تمام محل میں کہرام مچا دیا۔ رانی نے جو اپنی قسمت کا فیصلہ کر چکی تھی، لوگوں کی گریہ وزاری اور شور و شیون میں ذرا شرکت نہ کی۔ بلکہ ان کی مصروفیت کو غنیمت سمجھ کر اپنے انجام کی فکر میں لگ گئی۔ اُسنے باوقار خاموشی، وفادارانہ مایوسی اور دانشمندانہ عجلت کے ساتھ اپنے خاوند کی اُس پیش قبض کو جو پہلے ہی سے مسند پر زانو کے پاس رکھی تھی اُٹھائی اور بغیر گھبراہٹ کے آہستہ سے اپنے پیٹ کو چاک کر لیا۔ اور سات ماہ کے بچے کو الگ سے جدا کر کے اُس خواص کو دیا جو قریب حاضر تھی۔ گویا منشا یہ تھا کہ اس بے ماں باپ کے بچے کی پرورش تمہارے سپرد کی جاتی ہے۔ اگر اس کی عمر وفا کرے تو داوُد خاں کی نشانی کو مٹنے نہ دینا۔ بچے کو سپرد کرنے کے بعد اُسی پیش قبض سے رہا سہا کام تمام کر لیا۔ تمام محل میں دوہرا کُہرام مچگیا۔

تھوڑی دیر میں حسین علیخاں کے آدمی داوُد خاں کے . . دار الامارت پر قبضہ کرنے آئے تو سوائے حسرت و یاس کے اور کوئی منظر اُن کو نظر نہ آیا۔ رانی کی اس سانحہ انگیز حرکت سے سب پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ کیا دوست کیا دشمن ہر ایک کی آنکھوں سے جاری ہو گئے۔ حسین علیخاں خود متاثر ہوا۔ اور ساری کیفیت لکھکر دار الخلافہ دہلی کو روانہ کی۔ چند روز میں یہ زندہ جاوید کہانی تمام ہندوستان میں مشہور ہو گئی۔

سچ یہ ہے کہ جبتک تاریخ ہند کے صفحے دنیا میں باقی رہیں گے اُسوقت تک زوجہ داوُد خاں کا نام شہیدان وفا عصمت مآب اور شوہر پرست بیویوں کی فہرست میں سُنہری حرفوں کی طرح چمکتا رہیگا۔

بہو بیگم

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد جب دلّی کی سلطنت پر زوال آنا شروع ہوا اور فرخ سیر، محمد شاہ اور انکے جانشین بابر و اکبر کے نااہل وارث ثابت ہوئے، تو تیموری خاندان کی باکمال خواتین کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا اور حرم سرائے قلعۂ معلی کی وہ شاندار روایات قائم نہ رہ سکیں جو نور جہاں، جہاں آرا اور زیب النسا، کے قابل یادگار کارناموں کے ساتھ وابستہ تھیں۔

لیکن دلّی کے بگڑنے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اودھ اور حیدر آباد میں خودمختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔ اور ان دونوں صوبوں نے دار الخلافہ کے تمدن کو بہت کچھ اخذ کیا۔ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری، محمد شاہی دربار کا ایک طاقتور رکن تھا۔ اسی نے فرمانروایان اودھ کے خاندان کی بنا ڈالی تھی۔ سعادت خاں کے بعد اُسکا خواہرزادہ اور داماد ابو المنصور خاں صفدر جنگ اودھ کا حاکم ہوا۔ دربار دہلی کی وزارت بھی صفدر جنگ کو اپنے خسر سے ترکہ میں ملی۔ یہ عجیب بات ہے کہ جبتک والیان اودھ برسر عروج رہے نواب وزیر، کہلاتے رہے اور جب اودھ کا انحطاط شروع ہوگیا تو انھوں نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ صفدر جنگ کی بیگم صدر النسا، جو برہان الملک کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور اودھ کی تاریخ میں نواب بیگم کے نام سے مشہور ہے بڑے دبدبہ کی عورت تھی صفدر جنگ کے بعد اسکا بیٹا شجاع الدولہ سرآرائے وزارت ہوا۔ شجاع الدولہ کی بیگم اودھ کی تاریخ میں بہو بیگم کے نام سے مشہور ہے۔

بہو بیگم کا بچپن لال قلعہ میں گزرا۔ کہتے ہیں کہ محمد شاہ بادشاہ اُسے اپنی گود میں کھلایا کرتے تھے۔ مسلمان امرا اور والیان ملک میں یہ کمزوری ہمیشہ پائی گئی کہ

اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کے بعد فوراً عیش و عشرت میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ صفدر جنگ کی حرم سرا میں متعدد عورتیں تھیں۔ یہ تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ شجاع الدولہ ایک جری اور معاملہ فہم شخص تھا۔ لیکن اُسی کے وقت میں دربار اودھ کی شرمناک روایات کا آغاز ہوا۔ باوجود کثرت ازدواج کے مسلمان رؤسا بالعموم منکوحہ بیگموں کی بہت عزت اور قدر کرتے تھے۔ شجاع الدولہ نے بھی بہو بیگم کے وقار اور احترام کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ اس کی حرم سرا کی کوئی عورت مال و دولت، خدم و حشم کے اعتبار سے بہو بیگم کی ہمسری نہ کر سکتی تھی۔ بیگم کو نواب کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ اسکے رسوخ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ نواب نے اپنی زندگی میں لاتعداد دولت اسکے حوالے کر دی۔ بیگم کے رسوخ کا ایک بہت برا نتیجہ یہ ہوا کہ آصف الدولہ جو اُسکا اکلوتا بیٹا تھا غیر معمولی ناز و نعم میں پالا گیا اور نواب شجاع الدولہ کی حسب منشا ولی عہد کی تعلیم و تربیت نہ ہو سکی۔ شجاع الدولہ کے درباری بیگم کا نام "جناب عالیہ متعالیہ" کہے بغیر نہ لے سکتے بیگم کے بھائی نواب مرزا علی خاں اور نواب سالار جنگ دربار کے بااثر اراکین میں تھے۔ بیگم اپنے شوہر کی وفات کے بعد اکتالیس سال زندہ رہی اور اُس نے اپنی زندگی تزک و احتشام کے ساتھ بسر کی۔ شجاع الدولہ کے وقت تک فیض آباد اودھ کا دارالحکومت رہا۔ آصف الدولہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد لکھنؤ میں قیام کرنا شروع کر دیا لیکن نواب بیگم اور بہو بیگم آخر تک فیض آباد میں رہیں۔

نواب شجاع الدولہ کی وفات کے وقت (۱۷۷۵ء) علاوہ بے شمار زر نقد اور مال و متاع کے بیگم کے قبضہ میں لکھنؤ سے مشرق و مغرب دونوں طرف نہایت وسیع اور سیر حاصل جاگیرات تھیں۔

بیگم نے آصف الدولہ کو اپنی آنکھوں میں پرورش کیا تھا۔ اُسے اپنے بیٹے سے بڑی امیدیں تھیں۔ لیکن یہ سب امیدیں بہت جلد خاک میں مل گئیں۔ آصف الدولہ

نے باپ کے مرتے ہی وحشیانہ عیاشی شروع کر دی اور ماں سے وہ پوشیدہ خزانے طلب کرنے شروع کر دیئے جو شجاع الدولہ بیگم کو دے گیا تھا۔ بیگم نے دو تین بار بیٹے کی درخواستیں منظور کر لیں۔ رفتہ رفتہ آپس میں کشیدگی پیدا ہو گئی اور بیگم نے تہیہ کر لیا کہ آصف الدولہ کو اپنی دولت سے محروم کر دے۔

جب آصف الدولہ کو مایوسی ہوئی تو اُس نے انگریزی قوت کا سہارا تلاش کیا۔ وارن ہیسٹنگز اُس زمانہ میں روپیہ کی طلب میں سرگرداں تھا۔ بنارس کی شورش اسی سلسلہ میں ہو چکی تھی۔ نواب نے قلعہ چنار میں وارن ہیسٹنگز سے ملاقات کی اور انگریزی فوج کے جو اخراجات اودھ کے ذمہ واجب الادا تھے ان کی ادائگی کی یہ تدبیر بتائی کہ نواب بیگم اور بہو بیگم کے خزانوں سے اسقدر رقم وصول کر لیجائے۔ نواب کا دعویٰ تھا کہ ان دونوں بیگموں نے شجاع الدولہ کی دولت اور ریاست کے ایک حصہ پر ناجائز تصرف حاصل کر لیا ہے۔ ورنہ درحقیقت یہ تمام املاک وارثِ تخت و تاج کا حق ہیں۔ وارن ہیسٹنگز نے نواب کی رائے سے اتفاق کیا۔

نواب کے آدمی انگریزی سپاہ کے ساتھ بیگموں کی ڈیوڑھی پر پہونچے۔ خواجہ سراؤں نے کچھ تو اس وجہ سے کہ بیگموں کا روپیہ اُنھیں کے کام آتا تھا اور کچھ حق نمک خواری ادا کرنیکے خیال سے کسی قدر مقابلہ کیا۔ لیکن مقابلہ بے سود تھا۔ عشرت پسند خواجہ سراؤں کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ انجام کار جسقدر روپیہ کی ضرورت تھی وہ دونوں بیگموں کے معمور خزانوں سے وصول کر لیا گیا۔ اس جبر و تعدی کے سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ بیگموں کی عزت و حرمت بالکل محفوظ رہی۔

آصف الدولہ کے بعد نواب یمین الدولہ سعادت علیخاں تخت نشین ہوئے۔ یمین الدولہ کے عہد میں انگریزی فوج کے اخراجات کا مسئلہ از سرِ نو چھیڑا گیا۔ نواب نے بہو بیگم کی دولت اور جاگیر پر ہاتھ مارنے کا ارادہ کیا۔ بیگم نے سوتیلے بیٹے کی نیت بدلی

بدلی ہوئی دیکھی تو سرکار انگریزی سے گفت و شنید شروع کی۔ صاحب رزیڈنٹ نے بیگم سے ایک وصیت نامہ لکھوایا جس کی رُو سے سرکار انگریزی بیگم کے علاقہ کی وارث قرار پائی۔ ابھی معاملہ ختم نہوا تھا کہ نواب نے مجتہدین لکھنؤ سے وصیت نامہ کے عدم جواز کا فتویٰ حاصل کرلیا۔ اور رزیڈنٹ کی غیر مکمل کارروائی فسخ ہوگئی۔

بیگم کے کارآزمودہ خواجہ سراؤں میں بہار علیخاں، شکوہ علیخاں، نسبت علیخاں ممتاز تھے۔ یہ لوگ محاصل وصول کرتے تھے اور جاگیرات میں سیاہ و سفید کے مالک تھے جواہر علیخاں خواجہ سرا جو "نواب ناظر" کے لقب سے ملقب تھا۔ شجاع الدولہ کی وفات سے لیکر خود اپنی وفات تک بیگم کا معتمد علیہ کارندہ رہا۔ جواہر علیخاں ایک باہمت شخص تھا۔ وہ بیگم کی جائداد سے علماء و فضلا کی قدردانی پر بھی خرچ کیا کرتا تھا۔

بہو بیگم کی سرکار میں جو باکمال جمع تھے۔ آصف الدولہ کے دربار کو کبھی نصیب نہوئے۔ بیگم کے متوسلین میں ایک شخص لچھمی نرائن نامی لاہور کا رہنے والا بڑا جید فاضل تھا۔ عربی و فارسی میں اُسے یدِطولیٰ حاصل تھا۔ فارسی میں غزل، قصیدہ، مثنوی۔ تینوں صنفوں میں شعر کہتا تھا اور بہت اچھا کہتا تھا۔ افسوس کہ اُس کی تصنیفات نایاب ہیں۔ مولوی محمد منیر کہ اُن کی قوت حافظہ غیر معمولی تھی۔ عربی و فارسی دونوں زبانوں کی ادبیات میں ماہر تھے۔ تمام مشہور کتابیں اُن کو ازبر تھیں۔ اور ہر سوال کا جواب زبانی دیتے تھے۔

محمد فیض بخش مصنف "تاریخ فرح بخش"، جسنے فیض آباد کے تذکرہ میں بیگم کے زمانۂ بیوگی کے حالات بالتفصیل لکھے ہیں۔ محمد خلیل خوشنویس کہ تحریر کی ۱۰ طرزوں میں اُستاد تھا اور قدیم مکتوبات کی نقل اس خوبصورتی سے اُتارتا تھا کہ اصل و نقل میں تمیز نہو سکتی تھی۔ مرزا محمد علی جو اُس زمانہ کا نہایت مشہور مُہرکن تھا۔

جب بیگم کے وسائل آمدنی میں کمی ہوئی تو نواب آصف الدولہ نے ان باکمالوں کو

اپنے یہاں بلالیا۔ لیکن جواہر علیخاں کی علم دوستی نے شیخ محمد خلیل اور منشی چھمی نرائن کو آخر تک ہاتھ سے نہ جانے نہ دیا۔

بہو بیگم کی صحت بتدریج خراب ہوتی جاتی تھی۔ آخر کار ۲۶۔ محرم سنہ ۱۲۳۰ھ (سنہ ۱۸۱۵ء) کو ۸۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔

مرنے سے کچھ مدت قبل اُس نے گورنمنٹ انگریزی کے توسط سے اپنی جاگیرات اور مال منقولہ کا آخری تصفیہ کر دیا تھا۔ وفات کے بعد اس کی جاگیرات نواب غازی الدین حیدر (ابن نواب یمین الدولہ) کے حوالے کر دی گئیں۔ زر نقد گورنمنٹ انگریزی کے قبضہ میں آیا۔

بیگم نے اپنے دیرینہ ملازموں کے لیے جو وظیفے مقرر کر دیئے تھے وہ برابر اُن کو ملتے رہے۔ جواہر علیخاں کا انتقال بیگم کی وفات سے ایک سال پہلے ہو چکا تھا۔ داراب علیخاں نظارت میں جواہر علیخاں کا جانشین ہوا۔ اُس نے بیگم کی تجہیز و تکفین کے مراسم بے نظیر شان و شوکت کے ساتھ ادا کیے۔

بیگم فیض آباد سے دو میل کے فاصلہ پر جواہر باغ میں دفن ہوئی۔ داراب علی نے اپنی محسنہ بیگم کی وفات کے بعد نظارت سے استعفا دیدیا۔ اور اپنی فرصت کے اوقات کو بیگم کے عالیشان مقبرہ کی تیاری میں اور فاتحہ و عرس وغیرہ رسوم مذہبی کے ادا کرنے میں صرف کرنا شروع کیا۔ بیگم نے اپنے وصیت نامہ میں ان اخراجات کے لیے رقم کثیر علیحدہ کر دی تھی۔

یہ بانصیب اور بااقبال بیگم عمر بھر زمانہ کی گردش سے مصئون رہی۔ اُس نے دلی کی شاہی حرم سرا میں پرورش پائی تھی، دولت مغلیہ کے جاہ و جلال میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ پھر صفدر جنگ کی بہو اور شجاع الدولہ کی بیگم رہی۔ اودھ کے زرخیز صوبہ کی دولت اسکے قدموں پر نثار کی گئی۔

زمانہ عروج میں اسکے پاس سوار و پیادہ دس ہزار فوج تھی۔ اس کے فیلخانے اور اصطبل میں بے شمار ہاتھی اور گھوڑے تھے۔ اسکے زر و جواہر کے متعلق لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے خیالات تھے۔ جو لوگ براہ راست یا بالواسطہ اس کی سرکار سے روزی حاصل کرتے تھے ان کی تعداد ایک لاکھ تک بیان کی گئی ہے۔ مشرقی مبالغہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی اس تعداد سے بیگم کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ بیگم کے ملازم نہایت خوش و خرم اور آسودہ و مرفہ الحال رہتے تھے۔ اس کی سرکار کے ایک وظیفہ خوار کا بیان ہے کہ "فرخ آباد کے نوابان بنگش اُسکے ادنیٰ عہدہ داروں کی ہمسری نہ کر سکتے تھے۔ اور اُس زمانہ میں کوئی ہندوستانی عورت اسقدر خوشحال اور معزز نہ تھی۔"

اپنے دیرینہ نمک خواروں کے ساتھ بیگم ہمیشہ نوازش اور کرم کا برتاؤ کرتی تھی۔ انگریزوں کے ساتھ ہمیشہ مصالحت اور رواداری کا برتاؤ کیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ نواب شجاع الدولہ کے تعلقات انگریز حکام کے ساتھ نہایت مخلصانہ تھے۔ علاوہ بریں بیگم آصف الدولہ، یمین الدولہ اور غازی الدین حیدر، تینوں نوابوں سے کبیدہ خاطر رہی۔ وہ ایک اولوالعزم عورت تھی، اُسکو یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی شخص اُس کی آزادی اور شان و شوکت میں خلل انداز ہو۔

اُس کی دوران زندگی میں مغلیہ سلطنت بالکل تباہ ہو گئی اور انگریزی تسلط ہندوستان میں قائم ہو گیا۔ وہ دو ایک مرتبہ انقلاب کی زد میں ضرور آئی۔ لیکن اُس نے کبھی برگشتہ بختی کا رنج نہ اُٹھایا۔ اُسنے اپنے شاہانہ ٹھاٹھ کو آخر تک نباہ دیا۔ اس کی پُر شوکت زندگی اسلامی حرمسراؤں کی دیرینہ عظمت کی ایک آخری یادگار تھی۔

قدسیہ بیگم

نصیرالدین حیدر بادشاہ اودہ کا عہد دولت وعیش وعشرت کے لیے ضرب المثل ہے۔ اسکے زمانے میں ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ طبقے تک کے لوگ مرفہ الحال تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علاوہ محاصل سلطنت کے چودہ کروڑ روپیہ نواب سعادت علی خاں کا ترکہ خزانے میں جمع تھا۔ علاوہ بریں ملک اُس زمانہ میں قحط وغیرہ سے پاک تھا۔ اسی دولت اور مرفہ الحالی کی وجہ سے لکھنؤ اہل کمال اور متلاشیان روزگار کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اُسوقت اکثر اہلِ یورپ و شاہزادگانِ دہلی لکھنؤ آتے تھے۔ اور بادشاہ کی فیاضی سے فائز المرام ہوتے تھے۔ اسوقت لکھنؤ میں جو بڑے بڑے عالیشان محل ہیں وہ اسی عہد کے تعمیر کردہ ہیں۔ اگر تحقیق کرو کہ اُنکے بانی کون تھے تو معلوم ہوگا کہ وہ ادنیٰ درجہ کے لوگ تھے اور ان کی تنخواہیں اتنی قلیل تھیں کہ مشکل سے آجکل دو تین آدمی اُس میں زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ نصیرالدین حیدر کی فیاضی نے کچھ دنوں کے لیے اودہ میں غربت کو لفظ بے معنی بنا دیا تھا۔ اور اسکے دریائے جود سے سب چھوٹے بڑے سیراب تھے۔

بادشاہ نصیرالدین حیدر کی بیویوں کی تعداد تو کئی سو تک تھی۔ لیکن وہ اپنی دو بیگموں سے بہت زیادہ محبت رکھتا تھا۔ چنانچہ اُن دونوں نے لکھنؤ کی تاریخ میں نمایاں حصہ لیا۔ اور اُس زمانہ کے پالٹکس کی کشتی انھیں دونوں کے اشاروں پر چلتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں بیگمات کا نام تاریخ اودہ میں قیامت تک باقی رہیگا۔ ان دونوں کے نام یہ ہیں اول ملکہ زمانیہ بیگم۔ دوسری نواب قدسیہ محل۔

نواب ملکہ زمانیہ کا عروج ابتدائے سلطنت نصیرالدین حیدر میں زیادہ تھا۔ جنرل سلیمن

ریزیڈنٹ لکھنؤ اپنی کتاب میں (جو حقیقۃً باعث انتزاع اودھ ہوئی) اس بیگم کو اصلی فرماں روائے اودھ قرار دیتے ہیں۔ اُنھوں نے لکھا ہو کہ یہ بیگم اصل میں ایک کُرمی کی لڑکی تھی۔ ایک شخص فتح مراد نے اسکو اپنے قرضہ کی عوض میں اسکے باپ سے لے لیا تھا۔ فتح مراد کی بہن کرامت النسا نے اُسکو اپنی بیٹی بناکر پرورش کیا۔ جب دولاری (ملکہ زمانیہ کا پہلے یہی نام تھا) سن شباب کو پہنچی تو اُس کی رستم خاں نامی ایک شخص سے شادی کردی۔ ان دونوں نے آخر میں رستم نگر میں بودوباش اختیار کی۔ کیونکہ رستم خاں اُسکا شوہر نواب مجیب خاں کے یہاں جو اسوقت ایک افسر فوج تھے ملازم تھا۔ اُسی زمانہ میں دولاری کے دو اولاد ہوئیں ایک بیٹا تھا جسکا نام محمد علی رکھا گیا اور دوسری بیٹی جسکا نام زینت النسا تھا۔

دولاری کی اُس زمانہ میں نہایت عسرت کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔ آخر اُس کے نصیبے کروٹ بدلی۔ اور نصیر الدین کے مشکوئے معلی میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ لڑکا وہی مناجان تھا جس کی تخت نشینی پر سیکڑوں جانیں ضایع ہوئیں۔ اور وہ مدت العمر چنار گڑھ کے قلعہ میں بادشاہ بیگم کے ساتھ قید رہا۔ کچھ لوگ دایہ کی تلاش میں نکلے۔ خوش نصیبی نے اُن کو دولاری کے گھر پہونچایا۔ جب دولاری محلسرائے شاہی میں داخل ہوئی بادشاہ بیگم نے اُسکو پسند کیا۔ اور اطبائے بھی اُسکے دودھ کو مفید بتایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دولاری ملازم ہوئی کچھ دنوں کے بعد اس کی قدرتی خوبیوں نے بادشاہ کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا۔ جسنے بادشاہ بیگم سے اجازت لیکر اُس سے نکاح کرلیا۔ اور نواب ملکہ زمانیہ کے خطاب سے سربلند کیا۔

یہ بیگم بڑی عاقلہ اور دوراندیش تھی۔ کچھ دنوں تک لکھنؤ کی قسمت اسکے ہاتھوں میں تھی۔ ہڑھ پرواکا کُل علاقہ اسکو جاگیر میں ملا جس کی تحصیل چھ لاکھ رُپیے کی تھی! سکے علاوہ بادشاہ کے انعام وعطا کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُسکا بیٹا محمد علی کیواں جاہ کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ اور بادشاہ نے اسکے ولی عہد بنانے کی حتی الامکان بہت کوشش کی لیکن گورنمنٹ نے

منظور نہیں کیا۔ اس کی بیٹی زینت النسا کی شادی نواب ممتاز الدولہ سے ہوئی جسمیں تیس لاکھ روپیے صرف ہوئے تھے۔

ایک مرتبہ بادشاہ نے حکم دیا کہ سب عزیز و اقربا بیگم کی خدمت میں حاضر ہوکر نذریں دیں سب نے طوعاً و کرہاً حکم شاہی کی تعمیل کی۔ لیکن نواب نصیر الدولہ (یعنی محمد علی شاہ) کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اور بادشاہ کا یہ حکم وہ بجا نہ لاسکے۔ جب نصیر الدولہ تخت نشین ہوئے بیگم بقید حیات تھی۔ اُسکو اپنی سمدھن قرار دیا۔ اور بہت مرتبہ اپنے یہاں بلایا لیکن اُسنے عذر علالت کرکے ہمیشہ بہانہ کر دیا۔

حاصل یہ کہ اس بیگم کا انتہا درجہ عروج ہوا۔ یہ قدرتاً بہت فیاض تھی۔ سیکڑوں ہزاروں آدمی کی اسکے ذریعہ سے پرورش ہوتی تھی۔ اسکی سخاوت اور سیر چشمی لکھنؤ میں ضرب المثل ہوگئی زندگی بھر وہ بادشاہ سے متمنی اولاد رہی۔ اسلیے ہر نوچندی کو درگاہ حضرت عباس جاتی تھی اور وہاں دس ہزار روپیے صرف دسترخوان و نذر نیاز میں صرف کرتی تھی۔

اس بیگم نے ۲۲۔ دسمبر ۱۸۴۳ء میں انتقال کیا۔ لکھنؤ میں اسکا عالیشان امام باڑہ و مسجد ابتک موجود ہے۔

ملکہ زمانیہ کا یہ عروج بہت تھوڑے دنوں تک رہا۔ کیونکہ نواب قدسیہ بیگم کے آفتاب اقبال نے اُسکے نصیب کی چمک کو ماند کر دیا۔ یہ بیگم بھی کوئی اعلیٰ خاندان سے نہ تھی۔ یہ نواب ملکہ زمانیہ کے یہاں اوّل اوّل بطور کنیز کے ملازم ہوئی تھی۔ اور فرائض پرستاری ادا کرتی تھی لیکن اُسوقت ملکہ زمانیہ کو کیا معلوم تھا کہ یہ ایک دن بادشاہ کی خوشی و مسرت کی روح رواں بنجائیگی اور عزت کی اسقدر بلندی پر پہنچے گی کہ وہاں سے میرا مرتبہ بھی بہت چھوٹا نظر آئیگا۔

بادشاہ نصیر الدین حیدر سے اسکے تعلق کا دیباچہ یہ ہے کہ وہ ایک روز نواب ملکہ زمانیہ کے محل میں آئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ کچھ پیاس محسوس ہوئی اور آب حیات طلب کیا۔ اُسوقت قدسیہ محل موجود تھی۔ فوراً زریں گلاس میں آب سرد حاضر کیا۔ بادشاہ نے پانی پیکر چند قطرے

قدسیہ پر ڈالدیئے - قدسیہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا - بادشاہ کو اس بیباکانہ حرکت پر
غصہ آگیا اور کہا کہ ہیں!! بادشاہ وقت سے یہ گستاخی؟ اُسنے فوراً جواب دیا کہ کھیل میں
بادشاہی اور غریبی کا ذکر کیا؟ بادشاہ اس جواب معقول سے ساکت ہو گئے اور اُس کی
شوخی اور حاضر جوابی سے بہت خوش ہوئے - اسکے بعد سے جب اُس محل میں جانے کا
اتفاق ہوتا - اُس سے ضرور دو باتیں کرتے تھے - آخر کچھ زمانے کے بعد اُس سے
شادی کر لی -

قدسیہ محل انتہا درجہ حسین اور بہت بڑی سخی تھی - بادشاہ نے بیس لاکھ روپیہ صرف
اسکے زیورات وغیرہ کے لیے عطا کیے تھے - چھ لاکھ روپیہ کی جاگیر تھی - اسکو پڑھنے لکھنے
سے بھی بہت شوق تھا - ایک مغلانی بیگم اس کی اتالیق تھی جو بہت لیاقت رکھتی تھی - اور
علمی تعلیم کے ساتھ اُسکو امور خانہ داری اور کفایت شعاری وغیرہ کا بھی سبق دیتی تھی -
حاصل یہ کہ یہ بیگم بڑی تعلیم یافتہ تھی - قدرت نے فہم و فراست بھی اسکو بہت زیادہ ودیعت
کی تھی - اسی وجہ سے وہ پالٹکس میں بھی بہت زیادہ دخل دیتی تھی - وزرا اور اعلیٰ عہدہ داروں کا
عزل اور نصب وغیرہ اسی کے ہاتھوں میں تھا - سلطنت کے اہم امور میں اس کی رائے بہت
زیادہ اثر رکھتی تھی بادشاہ اس بیگم سے خاص محبت رکھتا تھا شادی کے بعد اُس نے
ایک روز بادشاہ سے کہا کہ میں نے تین لاکھ روپیہ نہیں دیکھے ہیں - اس نے فوراً
حکم دیا کہ مبلغ مذکور خزانۂ عامرہ سے لایا جائے - آخر اس حکم کی تعمیل ہوئی اور تین لاکھ روپیہ
کا ایک چبوترہ بنایا گیا - اُسپر بیگم نے جلوس کیا - بادشاہ نے حکم دیا کہ یہ روپیہ غربا میں خیرات
کر دیا جاوے -

اس بیگم کے مصارف بہت زیادہ تھے کیونکہ شاہانہ ساز و سامان سے بسر کرتی تھی اور
ہزاروں لاکھوں روپیہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں میں خرچ کر دیتی تھی - نواب ظفر الدولہ اکثر کہا کرتے تھے
کہ اگر وزیر اعظم معتمد الدولہ اور نواب قدسیہ بیگم کچھ اور جیتے تو سلطنت اودھ انکی فضولخرچیوں

سے بک جاتی۔

قدسیہ بیگم بہت تند مزاج اور غصیل عورت تھی۔ اگرچہ بادشاہ اور اُس میں انتہا درجہ کی محبت تھی مگر کبھی کبھی لڑائی بھی ہو پڑتی تھی۔ آخر اُسکا یہی غصہ و غضب باعث ہلاکت ہوا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہی کہ بادشاہ اور قدسیہ محل بعد انقضاے ایام چہلم تفریح طبع کی غرض سے کوٹھی دلکشا میں گئے ہوئے تھے۔ ایک روز بادشاہ بارہ دری میں بیٹھے ہوئے تھے دیکھا کہ کچھ بندر درختوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اندر سے بندوق طلب کی۔ راجہ بختاور سنگھ بھی موجود تھا۔ اُسنے بادشاہ کو اس حرکت سے منع کیا کہ بیوجہ کسی جاندار کو مارنا موجب نزول بلاے آسمانی ہوتا ہی۔ بادشاہ نے ہنسکر دو چار بندر شکار کیے۔ اور محلسرا میں چلے گئے۔ وہاں جاتے ہی قدسیہ بیگم سے لڑائی ہوگئی اور بیگم نے کہا کہ "انشاء اللہ یہ صورت صفحہ ہستی سے مٹ جائیگی"۔ بادشاہ نے غصہ میں جواب دیا کہ قول و فعل مختلف چیزیں ہیں۔ بیگم نہایت درجہ غیور اور تند مزاج تھی۔ پسی ہوئی سنکھیا ہیکل میں رکھی ہوئی تھی فوراً نوشجان کیا۔ اُسپر آب شورہ لیموں پی لیا۔ اور چند دانے بھنے ہوئے بھٹے کے بھی کھالیے تھوڑی دیر بعد خونی استفراغ ہوا جس میں چند لخت جگر بھی نکل آئے۔ اسی کے ساتھ محل میں قیامت برپا ہوگئی۔ بادشاہ بھی دوڑے ہوئے محل میں آئے اور اشک حسرت و یاس برسانے لگے اور کہا کہ اے بانوے باوفا آخر تو نے اپنا کام تمام کیا۔ اسنے جواب دیا کہ ہاں جو کچھ کہا اُسے کر دکھایا۔ بادشاہ شدت غم سے وہاں دیر تک ٹھہر سکے چکر والی کوٹھی میں جو لکھنؤ سے کچھ فاصلہ پر واقع ہی چلے گئے۔

فوراً اطباے حاذق جمع ہوئے اور علاج میں حتی الامکان بہت کوشش کی گئی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر بیگم نے چوبیس سال کی عمر میں ۱۵ ربیع الثانی ۱۲۵۰ھ میں انتقال کیا اس خبر کے ساتھ شہر میں ہرتال پڑگئی۔ چالیس روز تک بادشاہ سے لیکر فقیر تک سیاہ پوش رہے۔ ارکان دولت۔ اقرباے شاہی سب خاک بسر تھے۔ بہشت لکھنؤ ماتم سرا

ہوگئی۔ رات کیوقت جنازہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اُٹھا۔ اور کربلائے نوتعمیر مدفن بنایا گیا۔

بادشاہ بیگم کو بھی حد درجہ افسوس ہوا۔ اور بوجہ جوشش محبت مادری بغیر سیاہ لباس کے بادشاہ کے پاس چلی آئیں۔ اور بہت تسکین وتشفی دی اور کہا کہ خدا تجھ دولہ کو سلامت رکھے ایسی سو بیگم تجکو ملجائینگی۔ اس سے بادشاہ کے غصہ کی آگ بھڑک اُٹھی اور کہا کہ اگر آپ کو کچھ غم ہوتا تو سیاہ پوش ہوتیں۔ بیگم نے جواب دیا کہ میں لباس سیاہ فقط عزاداری جناب سید الشہدا علیہ السلام کو پہنتی ہوں۔ اور یہ کہکر چلی گئیں۔

بادشاہ کے اب تمام ماتمی جذبات غصہ سے مبدل ہوگئے اور بیگم کو حکم دیا کہ وہ فوراً محلسرا کو چھوڑ کر الماس باغ میں قیام کریں۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ عطیہ میرے شوہر کا ہے میں خالی نہیں کرسکتی۔ آخر نوبت یہانتک پہنچی کہ سپاہ بادشاہی پہنچی اور بیلداروں کے ذریعہ سے محل کا کھدوانا شروع ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین سے گولیاں چلنے لگیں اور دیر تک یہ طوفان بے تمیزی رہا۔ بیگم کی طرف کی حبشنیں اور لونڈیاں ماری گئیں۔ اور شاہی فوج میں بھی متعدد جانیں ضائع ہوئیں۔ اس خانہ جنگی نے بہت طول کھینچا۔ اس کی داستان بہت طویل ہے جس کی تفصیل ہم یہاں غیر مناسب سمجھتے ہیں۔ اس سے صرف یہ دکھانا تھا کہ بیگم کے انتقال کا کسقدر صدمہ تھا کہ ذرا سی بات میں اپنی مادر محترمہ سے لڑپڑے۔ اور اُن کو کیا کیا اذیتیں دیں۔

جنرل سلیمن اور سید محمد میر نے اس لڑائی کا جو منجر بہ ہلاکت بیگم ہوئی سبب لکھا ہے لیکن ہم کو اسکے یقین کرنے میں تامل ہے اسوجہ سے اس کی بحث یہاں قلم انداز کرتے ہیں حاصل یہ کہ اس سانحہ سے بادشاہ کو بہت صدمہ پہنچا۔ وہ اکثر بیگم کے مدفن پر جایا کرتے تھے اور اُسپر قطرۂ اشک کے پھول چڑھاتے تھے کبھی کبھی ریزیڈنٹ صاحب بھی ساتھ ہوتے لیکن وہ قبر سے دور کھڑے ہوتے تھے۔ کئی مہینے تک بادشاہ کا یہی حال رہا اور ہمیشہ سیاہ

کی مشین تو بالکل بند ہو گئی۔

اقربائے شاہی بادشاہ کی یہ حالت دیکھکر بہت غمگین ہوئے اور سمجھے کہ جبتک اسی بیگم کی صورت اور سیرت میں مشابہ عورت نہ ملیگی بادشاہ کی حالت درست نہو گی۔ آخر صلاح یہ ٹھہری کہ اُس کی بہن سے جو نواب دولہ کی بیوی تھی طلاق دلواکر بادشاہ کی شادی کر دیجائے مگر وہ عورت بھی نور جہاں کی طرح بہت باوفا ثابت ہوئی اور اُسنے اپنے شوہر کی مفارقت قبول نہ کی۔ میر سید علی اس مہم عظیم پر بیڑہ اُٹھاکر روانہ کانپور ہوئے۔ آخر بہزار جد و جہد نواب دولہ سے طلاق دلواکر اُسکو لکھنؤ لائے۔ لیکن جب بھی وہ رضی نہوئی۔ پھر اُسکے بعد اُسے قید کیا لیکن باانہمہ تکلیفات جسمانی و ترغیبات مالی اُس کی وفا میں ذرا بھی تزلزل واقع نہوا اور وہ زندان سے بھاگ کر کانپور اپنے شوہر سے جاملی (آفریں)

آخر بہزار کوشش بادشاہ کی نسبت شادی پختہ ہوئی اور رجب ۱۲۵۱ھ میں تاریخ عقد معین ہوئی رسم حنابندی ادا کی گئی۔ اسکے بعد محفل شاہانہ آراستہ ہوئی۔ تمام ارکان دولت و جنرل صاحب اور متعدد خواتین انگلشیہ شریک محفل ہوئیں۔ بزم کے گراں بہا ساز و سامان سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ روپیہ کے مصارف کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جنرل لو نے بادشاہ کے فرق مبارک پر سونے کا سہرا باندھا۔ بادشاہ نے ایک گلوری پان مغرق پلیٹ میں رکھ کر پیشکش کی اس شادی میں جو کچھ خرچ ہوا وہ بڑی بڑی ریاستوں کے محاصل کے برابر تھا جن بیگمات کے متعلق روپیہ کی تقسیم تھی اُنکے ہاتھ کی سرخی حنا سیاہی سے بدل گئی تھی۔ ٹھاٹھ بندی کی روشنی نے رات کو دن سے زیادہ روشن بنادیا تھا۔ تکلف نقارخانہ قابل دید تھا۔ بعد رسم شادی بادشاہ مع عروس داخل دولت خانہ قدیم ہوئے۔ اور سلامی کی توپ چلی۔ عروس کو خطاب نواب بادشاہ جہاں ممتاز الدہر عنایت ہوا۔

اس شادی کے بعد بھی بادشاہ کی کچھ حالت متغیر نہوئی۔ کیونکہ ممتاز الدہر نو عروس سے اُن کو نفرت ہو گئی۔ اسکی وجہ مورخین نے یہ لکھی ہے کہ بادشاہ نے کئی لاکھ روپیے اور پینتالیس

بدریاں دوشالے وروما ل وجامہ وار اور تھا نہائے لباس گرما بیگم کو عنایت کیا کہ وہ اپنے
متوسلین وغیرہ میں تقسیم کردے۔ بیگم تو دلہن تھی یہ کام اس کی ماں کا تھا۔ لیکن اُسنے اسمیں
دریغ کیا۔ بادشاہ نے ایک روز جواسکے متعلق پوچھا تو بیگم نے جواب دیا کہ حضور ہم آپ کا
گھر بنانے کو آئے ہیں نہ کہ بگاڑنے کو۔ اسپر بادشاہ کو بہت طیش آیا اور یہ کہکر کہ تو کنگلی ہو کسی کو
کیا دیگی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بیگم نے دامن پکڑا لیکن نہیں مانے اور باہر آکر راجہ غالب جنگ
سے کہا کہ ہم نے اس محل کو خطاب کنگلا محل کا دیا۔ چنانچہ آجتک وہ اس نام سے مشہور ہیں
یہ تھیں شاہان اودہ کی فیاضیاں جس کی یہ ادنیٰ مثال ہو۔

اسکے بعد پھر بادشاہ نے نواب تاج محل سے شادی کی۔ اس کی جاگیر بہت بڑی
تھی۔ اسی کے ساتھ چھ ہزار ماہوار بھی جیب خرچ کو ملتے تھے۔

ان بیگمات کا حال مسز پارک ایک سیاح لیڈی نے لکھا ہو جسکو بادشاہ کی سالگرہ کے
موقع پر محلسرا میں جانے کا شرف حاصل ہوگیا تھا۔ وہ اس طرح لکھتی ہے۔

موجودہ بادشاہ کی بیگمات نہایت بیش بہا ملبوس پہنے ہوئے تھیں اور ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ وہ الف لیلہ کی پریاں ہیں۔ بے شبہ اُن میں سے ایک (تاج محل) اسقدر
خوبصورت تھی کہ اپنے عروسی ملبوس میں وہ مجھے لالہ رخ کو یاد دلاتی تھی۔ میں نے
ہندوستان اور یورپ میں کوئی ایسی خوبصورت عورت نہیں دیکھی۔ اسکے اعضا متناسب
تھے۔ اور ایسی آنکھیں اور پلکیں تو میں نے دیکھی ہی نہیں۔ یہ بادشاہ کی بڑی چاہتی بیگم ہو
اس کی شادی ہوئے ابھی ایک ماہ ہوا ہو۔ عمر بھی اس کی صرف چودہ سال کی ہو۔ یہ چھوٹی
مخلوق ہاتھ پاؤں بھی چھوٹے چھوٹے رکھتی ہو اور بہت زیادہ محجوب اور شرمیلی ہے
اس کی صورت اسقدر موہنی ہو کہ تم دیکھتے ہی اُسپر فریفتہ ہو جاؤ گے۔ اسکا لباس بالکل
زرین اور قرمزی زربفت کا تھا۔ اور اُسکے بال بیش قیمت موتیوں سے گندھے ہوئے تھے
جس کی لڑیں اسکے دوش پر لٹک رہی تھیں اور اُنکے اخیر میں ایک گوہر شاہوار ہوتا تھا

اور چارلس دوم کی طرح اسکے بال گھونگر والے تھے۔ اس کی چمکتی ہوئی پیشانی پر ایک سونے کا زیور تھا جو لٹکتا بھی تھا اور اُس میں بڑے بڑے موتی اور گرانبہا جواہرات مثل زمرد وغیرہ کے جڑے ہوئے تھے۔ اُسکے اوپر ایک بہشتی طرہ لگا ہوا تھا جسمیں سے موتیوں کی لڑیں نکلکر سر کو مزین کرتی تھیں۔ اُسکے کانوں میں بھاری بھاری سونے کے بالے پڑے ہوئے تھے جس میں بڑے بڑے موتی اور بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے ناک میں بھی اُسکے ایک نتھ تھی جس میں جواہرات اور ایک گول اور بڑا گوہر شاہوار پڑا ہوا تھا۔ اور خوبصورت جسم پر ہار وغیرہ کی قسم سے اسقدر زیورات تھے کہ وہ شمار میں نہیں آسکتے۔ اُسکے کپڑے کی آستینیں بہت بہت بڑی بڑی تھیں لیکن کہنیوں کے پاس کھلی ہوئی تھیں۔ اسکا لباس ایک بہت بڑا سایہ تھا جو گلے تک جا کے ختم ہوتا تھا اور نہایت چست تھا۔ جب وہ چلتی تھی تو کئی عورتیں اُسکے پائجامے کے پائینچے کو اٹھاتی چلتی تھیں۔ اور کئی لونڈیاں اُسکے پیچھے اس غرض سے کھڑی رہتی تھیں کہ اُن موتیوں کی لڑیوں کو درست کرتی رہیں جو حرکت کیوقت اُسکے زربفت اور تاش بادلہ کے دوپٹے میں اُلجھ جاتی ہیں۔ اس خاتون سے تمام بیگمات حسد کرتی ہیں۔ ہم نے بادشاہ کی دوسری بیگم مخدرہ علیا کو بھی دیکھا...... وہ تاج محل سے زیادہ حسین نہ تھی لیکن ہندوستانی عورتیں اسی کو زیادہ خوبصورت سمجھتی ہیں۔ اسکے سر پر ایک ہیرے کا تاج تھا جس میں جواہرات کی ایک کلغی لگی ہوئی تھی۔ یہ ایک یورپین سوداگر کی لڑکی تھی جو بادشاہ کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ انگریزی فارسی اور ہندوستانی میں اسکو پوری مہارت حاصل تھی۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ کیا تم پردے کے ساتھ زنانے میں رہنا پسند کرتی ہو۔ اُس نے سر ہلایا۔ لیکن بہت مغموم معلوم ہوتی تھی۔ شاید یہ غم سوتوں کا تھا۔ ہم اسکے بعد ملکہ زمانیہ سے بھی ملنے گئے۔ اس بیگم کا سلطنت میں بہت پولیٹیکل اثر ہے۔ کیونکہ وہ ولی عہد کی ماں ہے۔ اور کہتے ہیں کہ بادشاہ پر

اسکا ایسا رعب داب ہے کہ وہ کبھی کبھی اسکو گوشمالی بھی دیدیتی ہے۔

قرۃ العین

اصلی نام زرین تاج ہی حاجی ملا محمد صالح قزوینی کی بیٹی تھی۔ جو ایران کے نامور علما کے خاندان کا ایک معزز رکن تھا۔ اسکا زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل سے تعلق رکھتا ہی۔ ملا صالح ایک مشہور فقیہ تھا اور اسکے گھرانے کے لوگ بڑے بڑے عالم و فاضل تھے۔ اس کا بھائی حاجی ملا محمد تقی (قرۃ العین کا چچا) قزوین کا مجتہد تھا۔ جس کی عزت وعظمت کا سکہ چاروں طرف ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ ملا محمد تقی کا بیٹا ملا محمد بہت بڑا عالم تھا اور علمی دنیا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ غرض قرۃ العین ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئی جسکا گھر بھر عالم و فاضل تھا۔ اسلیے منجملہ اُن قابلیتوں اور قوتوں کے جو فطرت نے نہایت فیاضی سے اس خاتون کے دماغ میں ودیعت کی تھیں۔ اس کی عالی خاندانی نے بھی اس کی ترقیات میں بہت کچھ مدد دی۔

قرۃ العین کو علم سے ایک طبعی مناسبت تھی اور اُسپر اُس کی منبظر غور و خوض کی عادت علم کا بیحد شوق اور حصول علم میں سخت محنت و کوشش نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ برخلاف عام طبیعتوں کے بچپن سے علمی چرچوں کے سوا اسے اور کوئی شغل نہیں تھا۔ قاعدہ کی بات ہی کہ جب چند علم دوست اشخاص ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو ضرور علمی مباحثے چھڑ جاتے ہیں اسی طرح جب قرۃ العین کے عزیز و اقارب ایک جگہ جمع ہوجاتے تو اسی قسم کے علمی تذکرے اور مباحثے ہوتے۔ قرۃ العین ان میں نہایت شوق سے شریک ہوتی اور نہایت غور سے ان باتوں کو سُنتی۔

اسکا عالم باپ اور فاضل چچا جو اس کی ہونہار طبیعت سے خوب واقف تھے اور

اور اس کی دماغی ترقی کو نہایت پیار و محبت سے دیکھتے تھے۔ اسے اس قسم کے مباحثوں میں حصہ لینے اور اپنی رائے دینے کا ضرور موقع دیتے۔ اسکے نفیس اور پاکیزہ دلائل نہایت وقعت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے اور بجائے خود اسقدر بینظیر ہوتے کہ پھر کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

حصول علم و فضل میں اس کی ان تھک کوششوں کا نیک قابل تعریف نتیجہ بہت جلد برآمد ہوا تھوڑے ہی عرصہ میں اسنے وہ حیرت انگیز ترقی کی کہ اُسکے خداداد حسن اور عصمت و حیا کے ساتھ اس کی علمی واقفیت اور قابلیت و بلند خیالی کا شہرہ تمام شہر قزوین میں ہوگیا۔ اور یہ خاندان کی سرتاج اور شہر قزوین کی مایۂ ناز و افتخار سمجھی جانے لگی۔ سچ یہ ہے کہ قرۃ العین نہ صرف اپنے خاندان اور اپنے ملک کی موجب افتخار سمجھی جانے کے قابل ہے۔ بلکہ یہ حسین۔ باحیا۔ عصمت مآب اور عالم و فاضل خاتون تمامی عورات ذات کے لیے مایۂ نازش اور وجہ تفاخر ہے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان کو اس معزز بی بی کی برگزیدہ ذات پر فخر و ناز ہے۔

اسی زمانہ میں قرۃ العین کی شادی ملا محمد سے جو حاجی ملا محمد تقی کا بیٹا اور قرۃ العین کا چچیرا بھائی تھا ہوئی۔ لیکن افسوس کہ اس باہمی مناکحت کا انجام اچھا نہیں ہوا جسکا ذکر آگے آئے گا۔

قرۃ العین کے علمی مشاغل بدستور اُسی جوش و خروش کے ساتھ جاری تھے اور وہ ہمہ تن انھیں اشغال میں مستغرق رہتی تھی۔ بلکہ اب مذہبی اور علمی امور میں اس کی دلچسپی بہت کچھ بڑھ گئی تھی۔ لیکن اب اُس کی زندگی میں بہت بڑا تغیر واقع ہونے کو تھا۔ اور ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہونے کا وقت آچکا تھا۔ انھیں دنوں میں اُسے خبر ملی کہ ایک نوجوان شیرازی مرزا علی محمد نے مہدویت کا دعویٰ کیا ہے اور ایک انبوہ کثیر اُسکا پیرو ہوگیا ہے۔ اسنے بھی مرزا علی محمد سے جسنے اپنا لقب باب اختیار کیا تھا سلسلۂ خط و کتابت قائم کیا اور چند ہی روز کی خط و کتابت کے بعد باب کی تعلیم کو سچے دل سے قبول کرلیا۔ اور صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کی اشاعت و

ترویج میں بیدریغ کوشش شروع کر دی۔ یہانتک کہ ہی غرض سے اس نے سفر اختیار کیا اور کھلم کھلا بڑے دھڑلے سے وعظ کہنے لگی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہاں نہایت اختصار سے یہ بیان کر دینا کہ مرزا علی محمد باب کون تھا؟ اسنے مہدویت کا دعویٰ کیسے کیا؟ اس کی تعلیم کیا تھی؟ خالی از دلچسپی نہو گا۔

مرزا علی محمد کا باپ تجارت کا پیشہ کرتا تھا اور اپنے وطن شیراز میں نہایت کامیاب تاجر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ظالم موت نے اسے اس بات کی مہلت ندی کہ اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت کر سکتا اسکے بیوقت مرجانے اور اچانک سر سے باپ کا سایۂ عاطفت اُٹھ جانے سے مرزا علی محمد کی جو بہت ہی کمسن تھا اُس کے ماموں نے پرورش کی۔ نہایت جانکاہی و دلدہی سے اسکی تربیت کرنے کے بعد جب یہ شعور کو پہونچا ماموں نے اس کے آبائی پیشہ تجارت میں لاسے لگا دیا۔ لیکن اس کی طبیعت کو اس پیشہ کے ساتھ کچھ بھی مناسبت نہ تھی اسلیے وہ اس میں نہایت بددلی سے کچھ دنوں مشغول رہنے کے بعد شیراز سے چل کھڑا ہوا اور سیدھا کربلا پہونچا۔

یہاں حاجی سید کاظم کا جو شیخ احمد احسائی بانی فرقہ شیخیہ کے جانشین تھے بڑا شہرہ تھا اور انکے علم و فضل کا ہر طرف چرچا تھا۔ انکے درسوں میں شریک ہونے کے لیے دُور دُور سے لوگ آتے تھے۔ اور بڑے بڑے عالم اس نامور بزرگ کے خوان علم کے زلّہ خوار تھے۔ مرزا علی محمد نے ان سے شرف ملاقات حاصل کی اور اس عالم متبحر کے شاگردوں کے زمرہ میں شامل ہو گیا کچھ دنوں بعد حاجی سید کاظم نے اس جہان فانی سے رحلت کی اور مرزا علی محمد کو شیراز واپس جانا پڑا۔

حاجی سید کاظم کے شاگرد اب اس تشویش میں تھے کہ کسے اس بزرگ سید کا جانشین بنائیں۔ یہ لوگ اسی تردد میں سرگردان تھے اور مرحوم کا کوئی قابل جانشین نہیں ملتا تھا۔ انھیں دنوں میں اتفاقاً ملا حسین بشروی کو جو حاجی سید کاظم کا شاگرد رشید تھا شیراز جانا پڑا اور یہاں مرزا علی محمد سے اُس کی ملاقات ہوئی۔ سلسلہ گفتگو میں اپنے اُستاد کے جانشین کے

تقرر کا ذکر آیا۔ مرزا علی محمد نے ملا بشروی سے اُن تمام باتوں کو پوچھنے کے بعد جو ایسے شخص میں ہونی چاہییں اپنے آپ کو اس عہدہ کے لیے پیش کیا۔ اولاً تو ملا بشروی کو حیرت ہوئی کیونکہ جس زمانہ میں مرزا علی محمد کربلا میں تھا اس کی لیاقت نہایت معمولی تھی۔ لیکن جب اُس نے اس دعویٰ کے ثبوت میں اپنی ایک نئی تصنیف پیش کی اور بہت عمدگی سے ملا کے ہر سوال کا معقول اور تشفی بخش جواب دیا تو ملا کو اُس کی اس حیرت انگیز ترقی پر نہایت استعجاب ہوا اُسی وقت اُس نے مرزا کو اس کی لیاقت و قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے حاجی کاظم کا جانشین تسلیم کر لیا۔ اور اپنے رفقا کو اس کی خبر کر دی۔ جنھوں نے باتفاق مرزا علی محمد کو اپنے بزرگ اُستاد کا جانشین اور اپنا پیرو مرشد تسلیم کیا۔

اسکے تھوڑے ہی عرصہ بعد مرزا علی محمد نے مہدویت کا دعویٰ کیا اور نہ صرف اسی پر اکتفا کی بلکہ اپنا لقب باب اختیار کر کے ایک نئی شریعت تیار کی۔ اور ایک نئی تعلیم پھیلانے لگا۔ وہ کہتا تھا کہ انسان کی ہدایت و رہبری کے لیئے "مشیت اولیٰ" کو ہمیشہ کسی نہ کسی انسانی صورت میں حلول کرنا پڑا ہے۔ اور وہی صورتیں پیغمبر کہلائی ہیں۔ حضرت آدم سے لیکر حضرت محمدؐ تک جتنے پیغمبر گذرے ہیں اگرچہ ہم انھیں جُدا جُدا تصور کرتے ہیں اور ان کی صورتیں بھی مختلف تھیں لیکن فی الحقیقت وہ سب ایک تھے۔ اور "مشیت اولیٰ" ہی ان مختلف صورتوں کے ذریعہ سے بولتی تھی۔ اسی طرح اسکے اخیر ظہور حضرت محمدؐ کے ۱۲۷۰ برس بعد "مشیت اولیٰ" نے میرزا علی محمد باب میں حلول کیا ہے اور اب اسکے ذریعہ سے بولتی ہے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ قائم رہیگا اور ان ظہوروں کی کوئی انتہا نہیں۔ جس طرح ہر ظہور کے وقت آیندہ ظہور کی خبر دی گئی ہے اسی طرح حضرت محمد صلعم نے باب کے متعلق مسلمانوں کو آگاہ کر دیا ہے اور یہ بشارت دی ہے کہ ان کے بعد امام مہدی آنے والا ہے۔ حضرت محمد صلعم کی پیشینگوئی کے موافق اب اسکا ظہور ہو گیا ہے اور وہ مرزا علی محمد باب شیرازی ہے۔

مرزا علی محمد نے اپنے دعویٰ رسالت کی صداقت کے لیے ایک کتاب بیان قرآن مجید

کے جواب میں پیش کی۔ اسکا دعویٰ تھا کہ جس طرح قرآن شریف محمد صلعم کی رسالت کی دلیل ہی۔ اسی طرح بیان باب کے دعوے کی صداقت کا کافی ثبوت ہی۔ اس نئی تعلیم نے جسکا ہم نے نہایت ہی اختصار سے بیان کر کیا ہی۔ ملک میں ہل چل پیدا کر دی۔ تمام ملک ایران میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اکثر اسکے رفقا اور شاگرد اس سے پھر گئے اور مخالفت کرنے لگے۔ یہانتک کہ لوگ اسکے خون کے پیاسے ہو گئے اور اسے اور اسکے ساتھیوں کو سخت سخت ایذائیں پہونچانے لگے۔

قزوین کا مجتہد حاجی ملا محمد تقی اسکا بہت بڑا زبردست مخالف تھا۔ ملا تقی کو پہلے ہی سے شیخ احمد احسائی اور اُس کے مقلدین سے نفرت تھی۔ اب جبکہ اُس نے اسی فرقہ کے ایک آدمی کو اتنے بڑے بڑے حیرت انگیز دعوے کرتے ہوئے دیکھا تو اس کی دلی حقارت اور نفرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ باب کے خیالات کا وہ سخت مخالف تھا اور اُسکو اور اسکے ساتھیوں کو کافر کہتا تھا۔

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہی کہ ایک ایسے خاندان میں جس کے افراد کسی خاص فرقہ یا خیال کے سخت دشمن ہوتے ہیں ایک ایسا شخص پیدا ہوتا ہی جو اُسی خیال کا بہت بڑا حامی اور موئد ہوتا ہے اسی طرح حاجی محمد تقی کے خاندان میں جو باب اور اُس کی تعلیم کا بہت بڑا دشمن اور بابیوں اور شیخیوں سے سخت نفرت کرنے والا تھا قرۃ العین پیدا ہوئی۔

باب کے دعوے مہدویت و رسالت کرنے کے بہت پہلے حاجی سید کاظم کی زندگی میں وہ ایک بار کربلا گئی تھی۔ جہاں اس نے اس عالم متبحر اور اسکے بڑے بڑے شاگردوں سے ملاقات کی اور ان لوگوں کے علمی مجالس میں شریک ہوئی تھی۔ حاجی کاظم کے انتقال کے بعد جب اس بزرگ کے شاگرد اس تشویش و پریشانی میں تھے کہ کسے اپنے اُستاد کا جانشین قرار دیں۔ قرۃ العین نے حاجی کاظم کے شاگرد رشید ملا حسن ابتروی کو جس سے کربلا میں شناسائی ہو گئی تھی خط لکھا کہ جب وہ اپنی تلاش میں کامیاب ہوں اور کوئی مرشد کامل ملے

توضرور مطلع کریں۔

اسی اثنا میں جب ملا ابشروی نے شیراز کا سفر کیا اور میرزا علی محمد سے ملاقات کی اور اسے اپنا پیر و مرشد اور اپنے بزرگ استاد کا جانشین تسلیم کیا جسکا ذکر اوپر ہو چکا ہی تو اُسنے فوراً قرۃ العین کو خبر کی کہ جس بزرگ کے ہم منتظر تھے اور جس کی تلاش میں سرگردان تھے اُسے پا لیا۔ اس کے ساتھ ہی ملا حسن بشروی نے قرۃ العین کا خط باب کو بتلایا جس نے اس معزز خاتون کی لیاقت اور قابلیت۔ علم و فضل۔ مذہبی اور علمی امور سے دلچسپی کی جسکا اس خط سے بخوبی پتہ چلتا تھا نہایت تعریف کی اور اُسے اپنے اصحاب میں شامل کیا۔

اسکے بعد جب میرزا علی محمد نے مہدویت کا دعوی کیا اور صرف دعوی مہدویت ہی پر اکتفا نہ کر کے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا یعنی رسالت کا دعوی کرنے لگا اُسوقت قرۃ العین کا اس سے سلسلہ خط و کتابت قائم ہو چکا تھا۔ قرۃ العین نے اس نئی تعلیم اور نئی شریعت کو بدل و جان قبول کر لیا اور اس کی بیحد دلدادہ اور اس کی اشاعت و ترویج میں نہایت جوش سے کوشاں ہو گئی۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اس نے اسی غرض سے گھر بار تک چھوڑا اور اس نئے مذہب کے پھیلانے میں ہمہ تن مستغرق ہو گئی۔

سب سے پہلے وہ اس غرض سے کربلا گئی اور وہاں اپنی خداداد فصاحت اور لیاقت کے وہ کرشمے دکھلائے کہ ہر روز اسکے لکچر سُننے کو ایک مجمع کثیر جمع ہو جاتا اور روزانہ بہت سے لوگ اس نئی تعلیم اور شریعت کے دائرہ میں داخل ہونے لگے۔ علمائے شہر نے حاکم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور شکایت کی کہ یہ نوجوان عورت کربلا میں کفر پھیلا رہی ہے اور اپنی فصاحت خداداد اور اپنے حسن دلاویز سے شہر کے نوجوانوں کو ورغلا کر گمراہ کر رہی ہے۔ گورنر نے اس کی گرفتاری کا حکم دیدیا۔ قرۃ العین کو پہلے ہی سے اس کی خبر مل گئی۔ اور وہ اُسی وقت کربلا سے بغداد روانہ ہو گئی۔

بغداد پہنچکر اولاً وہ مفتی سے ملی اور اپنے خیالات نہایت عمدگی سے بیان کیے اور

اپنا بغداد آنے کا مقصد بھی ظاہر کیا۔ مفتی نے بغداد کے گورنر سے اس بارہ میں رائے طلب کی اور باتفاق یہ طے پایا کہ اس کے بارے میں گورنمنٹ سے اجازت لیجائے سیلطنت عثمانیہ نے اس بات کی اجازت نہیں دی۔ لہذا قرۃ العین کو مجبوراً بصد مایوسی بے نیل مرام بغداد سے واپس ہونا پڑا۔

اس جوانمرد پُرجوش خاتون نے ہمت نہ ہار کر ہمدان کا قصد کیا اور نہایت جوش و خروش سے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ ہمدان میں بھی اسکے لکچر بے اثر نہ ہے اور ایک معقول جماعت کو جس میں اکثر بڑے بڑے عالم تھے بابی بنا لیا۔

میرزا علی محمد اس کی ان تمام بے نظیر انتھک کوششوں اور انکے نتائج سے نہایت خوش ہوا۔ اور جب بعض کم فہم اور کوتاہ اندیش بابیوں نے اس سے استفسار کیا کہ آیا ایک عورت کا اس طرح وعظ کرنا اور کھلم کھلا لکچر دینا اچھا ہے۔ تو اُس نے نہایت جوش سے اسکی تعریف کی اور اسکو جناب طاہرہ کے معزز لقب سے ملقب فرمایا۔ چنانچہ ابتک وہ اسی نام سے بابیوں میں یاد کی جاتی ہے۔

ہمدان سے قزوین واپس آنے کے بعد قرۃ العین کو ایک ایسا بڑا خیال پیدا ہوا جس سے اس جوانمرد عورت کی اولوالعزمی۔ ہمت۔ جوش اور جرات کا کسی قدر پتہ چلتا ہے۔ اُس نے قصد کیا کہ طہران جا کر محمد شاہ۔ شاہ ایران کو بابی بنا لے۔ اس عظیم الشان ارادہ سے وہ قزوین سے طہران روانہ ہوگئی۔ ابھی وہ طہران نہیں پہنچی تھی کہ اس بات کی خبر حاجی محمد صالح (قرۃ العین کے باپ) کو ہوگئی۔ اُسنے فوراً بہت سے آدمی بھیجے تاکہ قرۃ العین کو راستہ ہی سے لوٹا لیں۔ یہ لوگ بڑی ہی مشکل سے اسے قزوین واپس لائے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ قرۃ العین کا خاندان فرقہ بابیہ کا سخت مخالف تھا اسلیے قرۃ العین کی ان کارروائیوں نے اُسکے تمامی خویش و اقارب کو اُس سے برانگیختہ کر دیا۔ اُسکے عزیز اس سے برگشتہ ہوگئے اور وہ جو ابتک اپنے خاندان کا گل سرسبد تھی کانٹے کی طرح

کھٹکنے لگی۔ یہانتک کہ اُس کو اپنے شوہر ملا محمد سے جو اسکا چچازاد بھائی تھا قطع تعلق کر لینا پڑا۔

انھیں دنوں میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے قرۃ العین کا قزوین میں رہنا دوبھر ہو گیا اس کی تفصیل یوں ہو کہ مجتہد قزوین ملا محمد تقی۔ قرۃ العین کا چچا شروع ہی سے باب کا اور اس کی تعلیم کا سخت مخالف تھا۔ لیکن جب اس کی پیاری بھتیجی اور عزیز ہو خود بابیوں کے زمرہ میں شامل ہو گئی اور نہایت جوش سے مذہب باب کی اشاعت میں سعی بلیغ کرنے لگی تو اسکے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔

جب وہ خیال کرتا تھا کہ خود اُسکے خاندان کی ایک لائق فائق عالم اور فاضل خاتون جو اُس کی آنکھوں کا تارا اور خاندان کی سرتاج تھی باپ کی تعلیم کو قبول کرتی ہو اور کفر و الحاد کے پھیلانے میں اس کی شریک غالب ہو گئی ہو تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا تھا اور جب اسکو اس کی عزیز از جان بھو اور بھتیجی کی خداداد قابلیت اور لیاقت کا خیال آتا کہ ہائے اسکے خاندان کا ایک بیش بہا زیور مفت ہاتھ سے جا رہا ہو تو دنیا اُس کی آنکھوں میں تاریک ہو جاتی اور وہ خون کے آنسو رونے لگتا۔ اس کی بیخودی اور از خود رفتگی اور غضب و غصہ یہانتک ترقی کر گیا کہ وہ عام طور پر باب اور شیخ احمد احسائی پر لعنت بھیجنے لگا۔ بابی اس کی اس ناپسندیدہ حرکت سے سخت برافروختہ ہو گئے اور اس کے قتل کے درپے ہو گئے۔

۱۸۴۷ء میں ایک روز موقع پا کر میرزا صالح نے تین چار اور بابیوں کی شرکت سے قزوین کی ایک مسجد میں ملا محمد تقی کو قتل کر ڈالا۔ اس جرم میں کئی بابی ماخوذ ہوئے اور قتل کیے گئے۔ میرزا صالح قید میں سے بھاگ گیا۔ ملا محمد نے اپنے باپ کے قتل کا الزام قرۃ العین پر لگایا۔ اس لیے وہ گرفتار کر لی گئی۔ لیکن تحقیقات میں وہ سراسر بیجرم اور بالکل بیخطا ثابت ہوئی اور رہا کر دی گئی اس الزام سے بری ہونے کے بعد اسے قزوین میں رہنا ناممکن معلوم ہونے لگا اسلیے اُسنے اپنے پیارے وطن کو چھوڑنے پر آمادہ ہو کر خراسان کا قصد کیا۔

خراسان میں چند روز رہنے کے بعد وہ بدشت گئی اور وہاں سے مازندران پہنچی۔ اپنے نئے مذہب کی ترویج و اشاعت کا جوش اُسے ایک جگہ دم نہیں لینے دیتا تھا اور بعض جگہ ہموتی کو پسپا کرنے والی مخالفتیں اُسے ٹھہرنے نہیں دیتی تھیں۔ بالمختصر وہ کچھ دن اس شہر میں، کچھ روز اس قصبہ میں گذارتی اور وعظ کرتی پھرتی تھی کہ انھیں دنوں میں شاہی فوج اور بابیوں میں لڑائی شروع ہوئی۔ اس نے دوران جنگ میں نور میں رہنا پسند کیا اور لڑائی کے ختتام تک وہیں باطمینان رہی۔

جنگ کے ختم ہونے کے بعد نور کے باشندوں نے اُسے حکام کے سپرد کر دیا جنھوں نے قرۃ العین کو پابزنجیر طہران بھیجدیا۔ ایک وقت وہ بھی تھا جبکہ وہ ایک عظیم الشان ارادے سے طہران چلی تھی اور اسکے باپ نے بہزار منت و سماجت واپس بلایا تھا۔ اُسوقت وہ آزاد تھی لیکن اب وہ اسی بادشاہ مرحوم کے فرزند شاہ ناصر الدین قاچار کے دربار میں ایک قیدی اور مجرم کی حیثیت سے پابزنجیر شاہی گارڈ کی حراست میں پیش ہوئی۔

شاہ ایران کو اس کی حالت زار پر رحم اور اُس کے حسن و جمال پر ترس آیا۔ لہذا اُسنے اس جمال صوری و معنوی سے آراستہ و پیراستہ خاتون کو بہت پیار و ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھ کر فرمایا کہ مجھے اس کی صورت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ لیکن چونکہ بابیوں اور شاہی افواج میں لڑائی ہو کر کوئی زیادہ دن نہیں گذرے تھے اسلیے احتیاطاً قرۃ العین کو توال شہر محمد خاں کلانتر کی حفاظت میں رکھی گئی۔ اور ایک عرصہ تک وہیں رہی۔ وہ یہاں کسی سخت قید میں نہ تھی بلکہ اکثر بابی مختلف طریقوں سے اس سے ملتے رہتے تھے۔

وہ یہاں بھی اپنے کام سے غافل نہیں رہتی تھی اور اکثر اوقات جب کبھی شہر کی عورتیں کوتوال کے گھر میں کسی تقریب یا جشن میں جمع ہوتیں۔ قرۃ العین اپنی پُرزور فصیح تقریر شروع کر دیتی اور سبھوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ اسکا وعظ ایسا دلچسپ اور اس کا لکچر ایسا دلکش ہوتا کہ تمام سامعین پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا۔ خدائے تعالیٰ نے اُس کے بیان میں

وہ طاقت اور زور عنایت فرمایا تھا کہ جبتک وہ لکچر دیتی حاضرین اپنے آپکو بھی بھول جاتے لیکن افسوس اُسے یہاں بھی قرار نہ ملا اور چین سے نہ رہ سکی۔

انھیں دنوں میں ایک نہایت خوفناک واقعہ پیش آیا جس سے بابیوں پہ مصیبتوں کی گھٹا چھاگئی۔ تمام ملک ایران میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ بابیوں کے مصائب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس فرقہ کے سر پر ایک بڑی آفت آئی اور بابیوں کی بربادی کے آثار نظر آنے لگے۔ اس افسوسناک حادثہ کا اثر یہاںتک پہنچا کہ بابی ہونا سخت جرم سمجھا جانے لگا۔

وہ ہوش ربا سانحہ یہ تھا کہ ۱۸۵۲ء میں ۱۵۔ اگست اتوار کے روز صبح کے وقت شاہ ناصر الدین جو اسوقت نیاوران میں جو کوہ البرز کے دامن میں واقع ہے فروکش تھے شکار کے قصد سے گھوڑے پر سوار باہر نکلے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد تین شخص عرضی دینے کے حیلے سے شاہ کے پاس آئے اور قریب پہنچکر ایک نے پستول چلایا جو خالی گیا۔ دوسرے نے شاہ موصوف کو گھوڑے پر سے نیچے گرا دیا اور چاہتا تھا کہ گلا کاٹ ڈالے کہ شاہی ملازمین نے پہنچکر پھرتی سے قاتل ہی کا سر اُڑا دیا اور بادشاہ کو موت کے مُنہ سے چھڑا لیا۔ جس نے شاہ کو زمین پہ دے مارا تھا اور قتل کیا چاہتا تھا وہ فتح اللہ بابی تھا اسلیے فوراً احکام جاری کیے گئے کہ تمام بابی گرفتار کر لیے جائیں اور اس فرقہ اور اس خیال کے جتنے آدمی کیا مرد اور کیا عورت کیا بچے اور کیا بوڑھے بلا امتیاز سب یکدم گرفتار کر لیے گئے۔

اب یہ قرار پایا کہ ان میں سے جو اس خیال سے تائب ہو جائے اور باب پر لعنت بھیجے وہ چھوڑ دیا جائے۔ اور جو ایسا کرنے میں پس و پیش کرے وہ بلا درنگ تلوار کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ ان قیدیوں میں خود باب اور بابیوں کے بڑے بڑے پیشوا موجود تھے۔ انکے مصائب و آلام کی کوئی حد نہیں رہی تھی طرح طرح کی تکلیفیں دیجاتی تھیں جسے یہ نامراد گروہ بخندہ پیشانی گوارا کر رہا تھا۔ لیکن اُنکے استقلال میں ذرہ بھر فرق نہ آتا تھا۔ وہ اپنے خیالات پر ثابت قدم تھے۔ وہ اس طرح مرنے کو قابل فخر سمجھتے تھے اور یوں اپنی عزیز زندگی منقطع

کرنے اور جان شیریں سے ہاتھ دہونے میں انھیں ذرا دریغ نہ تھا

بیچاری قرۃ العین بھی اس اثر سے بحیثیت ایک پرجوش بابی ہونے کے بچ نہ سکی۔ اور بابیوں کے بڑے بڑے علمار کے ساتھ اسے بھی مندرجہ بالا غرض کے لیے دربار شاہی میں حاضر ہونا پڑا۔ جب محمد خاں کلانتر کو قرۃ العین کے پیش کرنے کا حکم ہوا وہ خوش خوش اپنے گھر آیا اور قرۃ العین سے کہنے لگا کہ اب تمھاری رہائی کا زمانہ آپہنچا۔ کل صبح کو تم دربار شاہی میں اپنے مذہب کے پیروؤں کے ساتھ پیش کی جاؤگی۔ اور تم سے صرف یہ سوال کیا جائیگا کہ کیا تم بابی ہو۔ اسپر صرف تمھارے "نہیں" کہہ دینے سے تمھیں چھوڑ دیا جائیگا اور اتنا کہدینے میں کوئی نقصان سوائے سراسر فائدہ کے نہیں ہوگا۔

قرۃ العین نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ میں سمجھتی ہوں کہ کل کا دن مجھے اس سے بھی زیادہ مبارک اور نیک ہوگا جیسا کہ تم سمجھتے ہو۔ کیونکہ کل مجھے اپنی اس صداقت کا ثبوت دینے کا بہترین موقع ملیگا جو جناب کی طرف سے میرے دل میں جلوہ افگن ہے۔ میں ضمیر کی آزادی کو جو ایک غیر مترقبہ نعمت ہے ترک کرنا نہیں چاہتی۔ میں موت سے نہیں ڈرتی بلکہ مجھے اس طرح مرنا دل سے پسند ہے۔ اگر میں ضمیر کے خلاف کام کروں اور تمھاری رائے پر عمل کروں تو یقیناً بچ جاؤنگی۔ لیکن مجھے یہ منظور نہیں۔ مجھے منظور ہے کہ ضمیر کی آزادی قائم رکھنے کے لیے اپنی قیمتی اور عزیز زندگی قربان کر دوں۔ اور اس کے بحال رکھنے کے لیے اپنی گراں قدر جان نثار کر دوں۔ لیکن مجھے یہ ہرگز منظور نہیں کہ اپنے ایمان کے خلاف کوئی کام کردں

محمد خاں نے بہتیرا سمجھایا لیکن اس کی ایک پیش نہ گئی اور وہ اولوالعزم عورت اپنے خیال پر ثابت قدم رہی۔

دوسرا روز آیا اور قرۃ العین محمد خاں کے ہاں سے اُس ستم رسیدہ گروہ میں پہنچا دی گئی جس کے ساتھ وہ دربار شاہی میں پیش ہوئی وہاں اُس سے وہی سوال کیا گیا کہ کیا وہ بابی ہے۔ اسکا قرۃ العین نے نہایت بیباکانہ وہی جواب دیا جو وہ محمد خاں کلانتر کوتوال شہر

سے ایک روز قبل کہہ چکی تھی اور نہایت فصاحت اور عمدگی سے اپنے عقائد بھی بیان کیے اسکے ساتھ ہی اُس نے اس نئے مذہب کی خوبیاں بیان کرنی شروع کیں۔ اس کی قدرتی فصاحت جوش زن ہوئی اور دربار میں ایک سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ اسکا لکچر ایک دریائے فصاحت و بلاغت تھا جو بڑے زور شور سے بے اختیار اُمڈا چلا آتا تھا۔ مجلس میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا اور سب لوگ ساکت تھے۔

اس کی تقریر کے ختم ہونے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک یہی حالت رہی۔ آخر کار نہایت افسوس و رنج کے ساتھ مجبوراً اس کے قتل کا فتویٰ دیا گیا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ وہ جلادی گئی۔ لیکن درحقیقت اُسکا گلا گھونٹ کر اُس کی لاش باغ ایلخانی کے اندھے کنوئیں میں ڈالدی گئی اور اوپر سے پتھر بھر دیئے گئے۔

یوں اس لائق ہوشیار۔ ثابت قدم اور خوبصورت خاتون کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ گو اس کی موت نہایت ہیبتناک تھی مگر وہ اپنی اس بہادرانہ موت سے دنیا کو ایک اعلیٰ درجہ کی شجاعت و جوانمردی کا نمونہ دکھلا گئی۔ اس کی ایسی افسوسناک موت نے اُسکے فضائل پر کوئی پردہ نہیں ڈالا بلکہ اُس سے اس کی عظمت اور عزت اور بھی دوبالا ہو گئی۔ اس معزز اور فخر بنی نوع انسان خاتون کی قابلیت اور خوبی کی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیگی۔ اور اس جوانمرد عورت کا نام ہمیشہ دلی عظمت کے ساتھ لیا جائیگا۔ لوگ اس کی ہمت و استقلال اور اس کی لیاقت و قابلیت کے ثنا خواں رہیں گے اور اسکے کارناموں کو دیکھ کر وجد کرینگے۔

فطرت نے قرۃ العین کو نہایت فیاضی سے جہاں جمال صوری و معنوی سے ہر طرح آراستہ فرمایا تھا اور بے نظیر قابلیت و لیاقت۔ برگزیدہ صفات۔ بڑی بڑی خوبیاں عنایت فرمائی تھیں وہاں سے شاعرانہ طبیعت بھی عطا فرمائی تھی۔ لیکن افسوس کہ اسکا کلام بالکل تلف ہو گیا۔ ہم ذیل میں اس کی تین غزلیں درج کرتے ہیں۔ جو بہزار کوشش ہاتھ آئی ہیں۔

وھوھذا

جذبات شوقک الجمت بسلاسل الغم والبلا
ہمہ عاشقان شکستہ دل کہ دہند جان بہ ولا

اگر آن صنم ز سر ستم پے کشتن من بیگناہ
لقد استقام بسیفہ فلقد رضیت بما رضا

سحر آن نگار ستمگرم قدمے نہادہ بہ بسترم
واذا رأیت جمالہ طلع الصباح کانما

نہ چو زلف غالیہ بار او نہ چو چشم فتنہ شعار او
شدہ نافۂ ہمہ ختن شدہ کافرے ہمہ خطا

تو کہ غافل از مئ شاہدی پے مرد عابد زاہدی
چکنم کہ کافر جاحدی ز خلوص نیت اصفیا

بمراد زلف معلقی پے اسپ و زین مغرقی
ہمہ عمر منکر مطلقی ز فقیر فارغ بے نوا

ز و ملک و جاہ سکندری من و رسم و راہ قلندری
اگر آن خوش است تو درخوری و گر این بد است مرا سزا

بگذر ز منزل ما و من بگزین بملک فنا وطن
فاذا فعلت بمثل ذا فلقد بلغت بما تشا

دیگر

لمعات وجھک اشرقت و شعاع طلعتک اعتلا
ز چہ رو الست بربکم نہ زنی بزن کہ بلے بلے

بجواب طبل الست تو ز ولا چہ کوس بلا زدند
ہمہ خیمہ زد بدر دلم سپہ غم و حشم بلا

من و عشق آن مہ خوبرو کہ چو زد صدائے بلا برو
بنشاط و قہقہہ شد فرو کہ انا الشہید بکربلا

چو شنید نالہ مرگ من پے ساز من شدہ و برگ من
فقضے الی مہرو لا و بکے علی مجلجلا

چہ شدہ کہ آتش حیرتے ز نم بقلۂ طور دل
فسکنتہ و دککتہ متدکدکا متزلزلا

پے خوان دعوت عشق او ہمہ شب ز خیل کروبیاں
رسد این صفیر مہینے کہ گروہ غمزدہ الصلا

تو کہ فلس ماہیٔ حیرتی چہ زنی ز بحر وجود دم
بنشیں چو طاہرہ دمبدم بشنو خروش نہنگ لا

دیگر

گر بتو افتدم نظر دیده بدیده رو برو	شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بمو
از پے دیدن رخت ہمچو صبا فتادہ ام	خانہ بخانہ در بدر کوچہ بکوچہ کو بکو
دور دہان تنگ تو عارض عنبرین خطت	غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو
مہر ترا دل حزیں بافتہ بر قماش جاں	بخیہ بہ بخیہ نخ بہ نخ رشتہ بہ رشتہ پو بہ پو
میرود از فراق تو خونِ دل از دو دیدہ ام	دجلہ بدجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

در دلِ خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا
صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تو بہ تو

عزیز النساء بیگم

عزیز النساء خواجہ فرید الدین احمد دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ وزیر اعظم اکبر شاہ ثانی کی بڑی صاحبزادی اور فدائے قوم سر سید مرحوم کی والدہ معظمہ تھیں۔

عزیز النساء نہایت لائق۔ عقلمند و عالی دماغ بی بی تھیں۔ قرآن مجید بامعنی کسیقدر فارسی پڑھی ہوئی تھیں۔ عربی خط لکھ سکتی تھیں۔ لیکن بول بہت کم سکتی تھیں۔ اپنی نواسیوں اور پوتیوں کو انھوں نے خود قرآن مجید اور معنے وغیرہ پڑھائے۔ اور بعض کو تھوڑی سی فارسی بھی پڑھائی۔ جب کوئی بچہ اُن کو سبق سُناتا تھا۔ یا مطالعہ اُن کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تھا تو وہ تین سوت کی لڑیں جو ایک لکڑی میں بندھی ہوتی تھیں۔ اپنے پاس رکھ لیتی تھیں۔ اگرچہ وہ خفا تو اکثر ہوتی تھیں لیکن کبھی مارتی نہ تھیں۔

ان کا دستور تھا کہ جو کچھ گھر میں آتا۔ روپیہ۔ پیسہ۔ گاؤں کا یا دیہات کا غلہ۔ مکانوں کا کرایہ۔ قلعہ کی تنخواہ۔ باغوں کا میوہ وغیرہ۔ سب میں سے بحساب پانچ فیصدی کے خدا کے نام پر علیحدہ کرتی تھیں۔ اور اپنی بہنوں۔ بھانجیوں غرضکہ کُل کنبے پر تاکید تھی کہ اسی طرح پانچ فیصدی

کے حساب سے خدا کی راہ پر دیا کریں۔ جسقدر روپیہ اس طرح جمع ہوتا تھا اس سے غریب پردہ نشین عورتوں کو جو معاش سے تنگ ہوتی تھیں۔ امداد کرتی تھیں۔ جوان لڑکیوں و بیوہ عورتوں کے نکاح کرتی تھیں۔ اور مفلس و غریب خاندانوں کی جو لڑکیاں جوان ہوتی تھیں اور بیوہ ہو جاتی تھیں اُن کو دوسرا نکاح کرنے کی نصیحت کرتیں۔

غریب رشتہ داروں کے گھر جاتیں۔ اور خفیہ طور پر کسی حیلہ سے اُن کی امداد کرتیں۔ بعض رشتہ دار ایسے بھی تھے۔ جنھوں نے ایسی عورتوں سے شادی کی تھی جنسے ملنا لوگ معیوب سمجھتے تھے۔ مگر اُن کا قول تھا۔ کہ حکم خدا سے صلہ رحم سب پر مقدم ہے۔ وہ خود اُنکے گھر جاتیں اُن کی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں۔ اور اُنکے ساتھ سلوک کرتیں۔

تعویذ۔ گنڈے اور جھاڑ پھونک۔ نذر و نیاز۔ منت وغیرہ پر اُن کو بالکل اعتقاد نہیں تھا بلکہ وہ اسپر ایمان رکھنا شرک اور خدا پر ایمان رکھنے کے بالکل خلاف سمجھتی تھیں۔ اُنھوں نے کبھی کوئی منت یا نذر و نیاز کسی کے لیے نہیں مانی۔ اور نہ کبھی تاریخوں یا دنوں کی سعادت و نحوست پر اعتقاد رکھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ شاہ غلام علی صاحب کی مرید تھیں۔

باوجودیکہ اُن کا تمام خاندان شاہ عبد العزیز صاحب کا مرید تھا۔ انکے ہاں تعویذ گنڈوں کا چرچا تھا۔ لیکن شاہ غلام علی صاحب کے ہاں اس قسم کا چرچا بالکل نہیں تھا۔ جب کوئی اُنکے پاس حاجت لیجاتا تو وہ دعا کے لیے ہات اُٹھاتے اور سب حاضرین سے کہتے "دعا کرو خدا اس کی حاجت پوری کرے" یہی عقیدہ عزیز النسا کا بھی مستحکم تھا۔

ایک امر جو نہایت صبر و استقلال کا اُنسے ظہور میں آیا (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسقدر صابر مستقل مزاج و فرشتہ خصلت بی بی تھیں) وہ نہایت ہی عجیب ہے۔ اور بہت ہی کم اس کی نظیر مل سکتی ہے۔

سید محمد خاں انکے بڑے بیٹے نے سینتیس (۳۷) برس کی عمر میں انتقال کیا۔ وہ اُنکے زمانۂ بیماری میں ہمیشہ اُنکے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ آخر ایک دن وقتِ صبح انکا انتقال ہو گیا

سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے۔ جو رنج والم اُن کو ہوا ہوگا ظاہر ہے۔ کہ اس سے زیادہ کسی کو نہوا ہوگا۔ بے اختیار ان کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ کہ اُسی حالت میں اُنھوں نے کہا۔ "کہ خدا کی مرضی" اور اُٹھ کر وضو کیا اور نماز فجر ادا کی۔ اشراق تک مصلے ہی پر بیٹھی رہیں۔

اتفاق سے انکے کسی رشتہ دار کی لڑکی کی شادی اُسی زمانہ میں ٹھہر چکی تھی۔ سب سامان شادی کا ہوگیا تھا۔ کہ یہ حادثہ گذرا۔ موافق دستور کے اُن لوگوں نے شادی ملتوی کرنی چاہی۔ لیکن جب اُنھوں نے سُنا تو تیسرے دن بیٹے کے انتقال کے اور ایسے سخت صدمہ کے اُنکے گھر گئیں۔ اور کہا کہ "میں شادی میں آئی ہوں۔ کیونکہ تین دن سے زیادہ ماتم رکھنے کا حکم نہیں ہے۔ شادی کے ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہوگا۔ جو امر خدا کو منظور تھا۔ وہ تو ہوگیا۔ اب شادی کو ہرگز ملتوی مت کرو۔ میں خود تمہارے گھر شادی میں آئی ہوں۔ اور شادی کی اجازت دیتی ہوں۔ تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے"

اگر ان باتوں پر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ عزیز النسار کسقدر عالی دماغ۔ نیک صفات۔ عمدہ اخلاق۔ دانشمند۔ دوراندیش فرشتہ خصلت بی بی تھیں۔ ایسی ماں کا ایک بڑے بیٹے پر جس کی اُس نے تربیت کی ہو کیسا اثر پڑتا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ ایسی نیک بی بی کو اخیر عمر میں تکلیف پہونچی وہ زمانہ غدر میں لوگوں سے کہتی تھیں کہ "انگریز تھوڑے دنوں میں پھر آجاوینگے۔ تم سب اپنے گھروں میں خاموش بیٹھے رہو۔ جو لوگ فساد میں شریک نہونگے انگریز اُن کو کچھ نہیں کہنے کے"۔

اُن کو یقین کامل تھا کہ "انگریز بجز اُنکے جنھوں نے فساد کیا ہے کسی کو تکلیف نہیں دینے کے"۔ جب زمانہ فتح دہلی قریب ہوا۔ اور کشمیری دروازہ فتح ہوگیا۔ سب زن و مرد شہر سے باہر چلے گئے۔ لیکن وہ اسی یقین پر کہ انگریز بے گناہوں کو نہیں ستانے کے مع اپنی بہن کے جو نابینا تھیں اپنے گھر سے نہیں نکلیں۔ مگر افسوس اُن کا خیال غلط نکلا۔ اور جب دہلی

فتح ہوئی تو سپاہی گھروں میں گھس آئے۔ تمام گھر لوٹ لیا۔ وہ مع اپنی بہن کے گھر کو چھوڑ کر اس کوٹھری میں چلی آئیں جس میں زیبا لاوارث بڑھیا رہتی تھی۔ آٹھ دس دن اُنھوں نے نہایت تکلیف سے بسر کیے۔

اس عرصہ میں سر سید جو میرٹھ میں آ گئے تھے۔ میرٹھ سے دہلی پہنچے اور اُنکے پاس گئے۔ اُسوقت تین دن سے اُنکے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ دو دن سے پانی بھی ہوچکا تھا۔ اور بہت تکلیف تھی۔ سر سید لکھتے ہیں کہ "میں نے کوٹھری کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور آواز دی۔ اُنھوں نے دروازہ کھولا۔ پہلا لفظ جو اُن کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ "ہیں تم یہاں کہاں آ گئے۔ یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں۔ تم چلے جاؤ۔ ہم پر جو گذرے گی گذریگی"۔ میں نے کہا کہ آپ خاطر جمع رکھیے۔ مجھے کوئی نہیں ماریگا۔ میرے پاس سب حاکموں کی چٹھیاں ہیں۔ میں ابھی قلعہ کے انگریزوں اور دلّی کے گورنر سے ملکر آیا ہوں۔ اُنکی طمانیت ہوئی اور معلوم ہوا کہ دو دن سے پانی مطلق نہیں پیا ہے۔ میں پانی کی تلاش کو نکلا، پانی اُس طرف کہیں نہیں ملا۔ ناچار قلعہ سے ایک صراحی پانی کی لیکر گھر گیا۔ اپنی والدہ اور خالہ کو تھوڑا تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ اُنھوں نے خدا کا شکر کیا۔

اب میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کروں میرٹھ لیجانے کے لیے۔ سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کیے۔ لیکن کہیں سواری نہیں ملی۔ آخر کار حکام قلعہ نے اجازت دی۔ کہ شکرم جو سرکاری ڈاک لیکر میرٹھ کو جاتی ہے۔ مجھکو دیدی جائے۔ میں شکرم لیکر گھر پر آیا۔ اپنی والدہ اور خالہ کو اُس میں بٹھا کر لایا۔

اس تکلیف سے ان کو صفرا کی نہایت شدت ہو گئی۔ جو دوا یا غذا دی جاتی تھی۔ قے ہو جاتی تھی۔ آخر کار اسی مرض میں یکم ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ ہجری مطابق ۱۸۵۷ء کے بمقام میرٹھ اُنھوں نے انتقال کیا۔

عزیز النسا بیگم صاحبہ کی چند نصیحتیں۔

۱۔ دُکھ بیماری میں علاج کرنا دوا دینا صرف ایک حیلہ ہی۔ شفا دینے والا خدا ہی۔ اگر دوا اور حکیموں کے علاج سے لوگ مرا نہ کرتے تو سب لوگ خدا کو بھول جاتے۔

۲۔ اگر سیتلا کے پوجنے سے لڑکے لڑکیاں سیتلا کی بیماری سے نہ مرتے تو تمام دنیا بجز اُن کے جنکو خدا بچاتا کافر ہو جاتی۔

۳۔ منت نذر و نیاز تعویذ گنڈا کرنا۔ خدا پر ایمان رکھنے کے خلاف ہی۔

۴۔ ہر بات میں خدا سے دعا کرنی چاہیے۔ وہی جو چاہیگا کریگا۔

۵۔ مصیبتیں جو انسانوں پر پڑتی ہیں۔ اُن میں بھی خدا کی کچھ حکمت ہوتی ہی۔ لیکن بندے اُس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔

۶۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں ہی۔ کبھی کچھ ہی۔ اور کبھی کچھ ہی۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اُسکو نباہ سکو۔

۷۔ جہاں دوستی ہی۔ اسکو پورا کرنا چاہیے۔ یہ تمھارا فرض ہی۔ اُس دوست کو دوستی کا پورا کرنا اُسکا فرض ہی۔ تم دوسرے شخص کے فرض کے ادا کرنے کے ذمہ دار مت ہو۔ تم کو بدستور اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ اس سے تم کو کیا۔ کہ دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں۔ چاہے وہ دوست بے اتفاقی سے پیش آئے تو تم مت اُسکے ساتھ بے اتفاقی سے پیش آؤ۔

۸۔ اگر کسی نے ایک دفعہ تمھارے ساتھ نیکی کی۔ اور پھر بُرائی کرے۔ یا دو دفعہ بھلائی کی ہو۔ اور دو دفعہ بُرائی کرے۔ تو تم کو آزردہ نہونا چاہیے کیونکہ ایک دفعہ کی نیکی اور ایک دفعہ کی بھلائی۔ یا دو دفعہ کی نیکی اور دو دفعہ کی بُرائی برابر ہوگی۔ مگر نیکی ایسی چیز ہی کہ اس کے بعد نیکی کرنے والا کیسی ہی بُرائی کرے۔ اُس کی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

سکندر بیگم

انکے والد نواب نظر محمد خاں ہیں جو وزیر محمد خاں کے بیٹے تھے۔ ۱۲۳۱ھ میں جب وہ بھوپال کے رئیس ہوئے تو اُنھوں نے نواب غوث محمد خاں کی بیٹی قدسیہ بیگم سے شادی کی۔ ۱۲۳۳ھ میں انکے بطن سے سکندر بیگم پیدا ہوئیں۔

ابھی یہ دو سال کی بھی نہیں ہوئی تھیں کہ انکے والد عین جوانی کے زمانہ میں اتفاقیہ طور پر گولی سے ہلاک ہو گئے۔ مرتے وقت وہ وصیت کر گئے تھے کہ میرے بعد قدسیہ بیگم ریاست کی مختار رہیں۔ اور جب میری بیٹی سکندر بیگم بڑی ہو تو اخوان ریاست میں سے جسکے ساتھ اسکا عقد کیا جائے وہی رئیس ہو۔

۱۲۵۰ھ میں جب وہ سترہ سال کی عمر کو پہونچیں تو انکے چچازاد بھائی نواب جہانگیر محمد خاں کے ساتھ ان کا عقد کیا گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد حسب قرارداد جہانگیر محمد خاں نے ریاست طلب کی۔

قدسیہ بیگم نے جو مختار ریاست تھیں نامعلوم وجوہ سے مخالفت کی۔ آخر اس معاملہ نے طول کھینچا اور نوبت جدال و قتال تک پہونچی۔ یہانتک کہ گورنمنٹ نے درمیان میں پڑ کر جہانگیر محمد خاں کو ریاست دلوادی۔ اور قدسیہ بیگم کے لیے اُن کی حین حیات تک کے واسطے پانچ لاکھ سالانہ کی جاگیر الگ کرادی۔

اگرچہ نواب جہانگیر محمد خاں کو ریاست مل گئی اور وہ مسند نشین ہو گئے لیکن انکی طبیعت ان بیگمات سے رنجیدہ ہو گئی۔ روز بروز ناچاقی بڑھتی جاتی تھی۔ اور رفتہ رفتہ یہانتک نوبت پہونچی کہ آخر مجبور ہو کر قدسیہ بیگم مع سکندر بیگم کے اسلام نگر کے قلعہ میں چلی گئیں۔ اور وہیں اُنھوں نے رہنا شروع کیا۔

نواب جہانگیر محمد خاں ایک سپاہی منش اور فیاض آدمی تھے۔ تدبیر ملکی سے کم سروکار رکھتے تھے۔ انکے عہد میں انتظام میں ابتری رہی جس کی بدولت ریاست چند سال کے عرصہ میں تقریباً بیس لاکھ روپیے کی قرضدار ہوگئی۔

ابھی ان کی جوانی ہی کی عمر تھی کہ وہ مرض الموت میں گرفتار ہوئے۔ سکندر بیگم ان کی عیادت کے لیے اسلام نگر سے آئیں اور دیکھ کر پھر وہیں لوٹ گئیں۔ آخر ۱۲۶۰ھ میں جہانگیر محمد خاں انتقال کر گئے۔

ان کے مرنے کے بعد حسب تجویز نواب گورنر جنرل بہادر یہ طے پایا کہ نواب مرحوم کی بیٹی نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ رئیسہ بھوپال ہوں۔ جسوقت وہ کتخدا ہونگی تو اُن کا شوہر رئیس ہوگا۔ اور اُن کی شادی کے زمانہ تک کے لیے میاں فوجدار محمد خاں نواب قدسیہ بیگم صاحبہ کے بھائی مختار ریاست قرار دیئے گئے۔

خانصاحب موصوف کے زمانہ میں ریاست کا کاروبار اور بھی ابتر ہوگیا۔ خانہ جنگی اور شورش برپا ہوئی۔ اور ریاست پر تقریباً چار لاکھ روپیے کے قرضہ کا بار اور بڑھ گیا۔ بالآخر ۱۲۶۳ھ میں انہوں نے استعفا دیکر سکندر بیگم صاحبہ کو نیابت کا خلعت عطا ہوا۔

نواب سکندر بیگم صاحبہ نے جسوقت ریاست کی باگ ہاتھ میں لی ہے اُسوقت اسکی حالت نہایت خراب تھی۔ نہ کچھ قواعد وضوابط تھے۔ نہ انتظام کا کوئی آئین و طریقہ تھا نہ دادخواہی کے لیے عدالتیں تھیں۔ علاوہ بریں تقریباً چوبیس لاکھ روپیہ کا قرضہ تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر زرخیز پرگنے ریاست کے سودخوار مہاجنوں کے قبضہ میں تھے اور ریاست کی آمدنی صرف گیارہ لاکھ سالانہ رہ گئی تھی۔[1]

[1] سراج الاقبال تاریخ بھوپال میں مولانا عباس لکھتے ہیں کہ ریاست بھوپال کی کل آمدنی چالیس لاکھ روپیہ سالانہ ہے۔ لیکن تاج الاقبال تاریخ بھوپال میں جو خود وہاں کی رئیسہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کی تصنیف ہے کل سالانہ آمدنی تقریباً ستائیس لاکھ لکھی ہے۔

ارکان و اعیان ریاست زیادہ تر بہادر اور جنگجو لوگ تھے جو نہ انتظام و تدبیر ملکی سے اچھی طرح واقف تھے نہ قانون و ضابطہ کی پابندی کو پسند کرتے تھے[۱]

ایسی جماعت میں پرورش پاکر نواب سکندر بیگم صاحبہ کا محض اپنی کوشش سے ریاست کو ترقی دیکر باقاعدہ اور منتظم بنا دینا ان کی بے نظیر ذاتی قابلیت کی دلیل ہے۔

انگریزی پیمایش کی رو سے کل زمین ریاست بھوپال کی ۶۷۴ء۶ میل مربع ہے۔ سکندر بیگم صاحبہ نے تمام ریاست کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تین ضلعے اور تینوں ضلعوں میں ۳۱ پرگنے قائم کیے۔ ہر ہر ضلع میں ناظم۔ اور ہر ہر پرگنہ میں تحصیلدار، تھانہ دار عملہ وغیرہ متعین فرمائے۔

تمام ریاست کی جریب سے پیمایش کرائی۔ ہر ہر گاؤں کی حدبندی کی۔ اور وصول تحصیل کے قوانین مرتب کیے۔ گزشتہ سالوں کے ناتمام اور پراگندہ حسابوں کو صاف کیا مال کے لیے اصول اور ضابطے تیار کیے۔ دیوانی اور فوجداری کے قوانین کی الگ الگ ضخیم ضخیم کتابیں لکھائیں۔ اور ریاست کو ایک منظم اور مرتب قانون پر چلایا۔

---

[۱] غدر سے پیشتر کا زمانہ جبکہ انگریزی تسلط اچھی طرح نہیں ہو چکا تھا۔ بدنظمی کی وجہ سے ہندوستان میں ایک قسم کی طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ بالخصوص وسط ہند میں مرہٹوں کی دست برد اور امیر خاں وغیرہ کے پیہم حملوں سے ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ خانان بھوپال جو ایک بہادر قبیلہ کے فرزند ہیں ان شورشوں کی وجہ سے ہمیشہ شمشیر بکف رہتے تھے۔ چنانچہ خان والا وزیر محمد خاں کی تمام عمر ہی جنگ و پیکار میں بسر ہوئی اور اطمینان سے نہ بیٹھ سکے۔ اُس زمانہ کی ایک یادگار بھوپال میں اب تک موجود ہے یعنی گٹکا کیونکہ ان لوگوں کو اکثر دور دراز مقامات تک دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اسلیے چھالیا اور کتھا کتر کے پاس رکھ لیتے۔ لڑائیوں و حملوں میں بروقت ضرورت اسی کو موتھ میں ڈالکر پیاس کو تسکین دیتے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ معرکوں سے واپس آکر جب ایک دوسرے سے ملنے کے لیے جاتے تو وہی گٹکا بطور تواضع کے پیش کرتے۔ یہانتک کہ اسکا عام رواج ہو گیا اب ہر بھوپالی کے رومال کے پلو میں گٹکے سے بھرا ہوا ایک بٹوہ اور ایک ڈبیا میں حقہ ضرور ساتھ ہوتا ہے چار ٹکے کی مزدوری کرنے والیاں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

اُن کو خلائق کی آسائش اور رعایا کی بہبودی کا اسقدر خیال تھا کہ اپنا عیش و آرام ترک کر کے تین چار بار تمام ریاست میں دورہ کیا۔ رعایا کی حالت خود اپنی آنکھوں سے دیکھی اُن کی ضروریات کو سمجھا اور اُن کا بندوبست کیا۔

وہ مثل مردوں کے فنون سپہ گری اور شہسواری میں طاق تھیں۔ گھوڑوں اور ہاتھیوں پر بیٹھ کر بے پردہ اور بے نقاب دورے کرتی تھیں۔ اُن کا رعب اور جلال ہی اُنکے لیے بہت بڑا پردہ تھا۔

ان کی اس گرمی تن دہی اور جانفشانی سے رعایا خوش حال اور ریاست سرسبز ہوگئی۔ مالیہ میں ترقی ہوئی۔ سالانہ آمدنی گیارہ لاکھ سے چوبیس لاکھ تک پہنچ گئی۔ تمام قرضہ ادا کر دیا گیا۔ اور وہ محالات جو بطور رہن کے مہاجنوں کے پاس تھے واگذاشت ہوئے۔

انھوں نے کمال فراست اور مردم شناسی سے اپنے لیے ایک نہایت قابل۔ مدبر اور خیر خواہ وزیر تلاش کیا۔ یعنی مولوی جمال الدین خانصاحب جنھوں نے بیدار مغزی اور دیانت داری کے ساتھ ریاست کی خدمت کی اور بیگم صاحبہ کے ارادوں اور اصلاحوں کی تکمیل میں سرگرم کوششیں انجام دیں۔

نواب سکندر بیگم صاحبہ سیاق و سباق اور فارسی کی نہایت اعلیٰ درجہ کی لیاقت رکھتی تھیں۔ خط کتنا ہی شکستہ کیوں نہو بے تکلف پڑھ لیتی تھیں۔ پہلے ریاست کا دفتر بھی فارسی ہی زبان میں تھا۔ جب گورنمنٹ نے ہندوستان کے دفاتر میں اُردو جاری کی تو اُنھوں نے بھی ریاست کے دفتر کو اُردو میں کر دیا۔

ریاست کے تمام پرگنوں میں رعایا کی تعلیم کے لیے اُردو اور ہندی کے مدرسے جاری کیے۔ ۱۸۶۰ء میں خاص شہر میں مدرسہ سلیمانیہ اپنی چھوٹی نواسی سلیمان جہان بیگم کے نام سے عربی۔ فارسی۔ اُردو۔ ہندی اور انگریزی کی تعلیم کے لیے کھولا۔

دستکاری اور صنعت و حرفت کے سکھانے کیواسطے ملکہ معظمہ آنجہانی کے نام سے وکٹوریہ مدرسہ قائم کیا۔ اس زمانہ میں مطبع کا بہت کم رواج تھا لیکن اُنھوں نے ضروریات ریاست کے لیے ایک مطبع بھی جاری کیا۔

شہر بھوپال کی یہ حالت تھی کہ نہ وہاں سڑکیں تھیں نہ روشنی کا کوئی انتظام تھا۔ تنگ تنگ گلیاں تھیں جن میں چھکڑے بھی مشکل سے گذرتے تھے۔ انھوں نے نہایت فراخ اور وسیع سڑکیں بنوائیں۔ اُن پر دو رویہ لالٹینیں نصب کرائیں۔ ریاست کے صدر مقامات کو سڑکوں کے ذریعہ سے ملحق کر دیا جسکی وجہ سے انتظام ملکی اور نیز اندرونی تجارت میں بہت آسانیاں ہوگئیں۔

پیشتر ریاست کی صورت یہ تھی کہ امرا کو جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے پاس سپاہیوں کو ملازم رکھتے تھے جو بروقت ضرورت ریاست کی خدمت انجام دیتے تھے۔

ان امیروں کی زیادہ تر یہ حالت ہوتی تھی کہ انتظام و تدبیر سے کم اور سپہگری و بہادری سے زیادہ ذوق رکھتے تھے۔ اس لیے جنگ و چپقلش پیدا ہونے کا اکثر خطرہ رہا کرتا تھا۔

بیگم صاحبہ نے اس طریقہ کو توڑ کر فوج کو تنخواہ دار ملازم قرار دیا۔ اور ماہ بماہ اُن کی تنخواہ ملنے کا بندوبست فرمایا۔ انگریزی اصول پر ان کو قواعد جنگ سکھانے کے لیے تربیت یافتہ دیسی افسر نوکر رکھے۔ سواروں و پیادوں کے لیے مختلف قسم کی وردیاں مقرر کیں جس سے فوج باقاعدہ اور شایستہ ہوگئی۔

اسی طرح پولیس کا بھی نظام مرتب کیا۔ اور اسکو اس قابل بنایا کہ وہ اپنے فرائض ادا کر سکے

الغرض وہ اپنے ان تمام کارہائے نمایاں کی وجہ سے تاریخ بھوپال میں وہی رتبہ

رکھتی ہیں جو تاریخ ہند میں اکبر اعظم کا ہے۔

خواجہ حالی تو فرماتے ہیں۔

رباعی

جس ملک کا کارخانہ دیکھو برہم — سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیر دولت — یا ہے کوئی مولوی وزیر اعظم

مگر یہاں بیگم مالک دولت ہے۔ اور مولوی جمال الدین خاں وزیر اعظم ہیں۔ جنکے زہد و اتقا کے قصے ابتک مشہور ہیں۔ جو باوجود کاروبار ریاست کے ملانوں کی طرح مسجد میں وعظ بھی فرمایا کرتے تھے۔ اور پھر ملک کا کارخانہ ایسا اعلیٰ درجہ کا جس کی تمام دنیا تعریف کر رہی ہے۔ سبحان اللہ!! مصرع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

۱۸۵۷ء میں جب غدر ہوا تو جا بجا فوجیں باغی ہوگئیں۔ گوالیار و اندور جو بڑی بڑی ریاستیں ہیں اور بھاری بھاری فوجیں رکھتی ہیں وہ بھی اپنی اپنی فوجوں کو بغاوت سے روکنے میں کامیاب ہو سکیں۔ لیکن نواب سکندر بیگم صاحبہ نے نہایت دانشمندی سے اپنی ریاست کی فوج اور نیز رعایا کو اس اثر سے محفوظ رکھا۔ چھاونی سیہور کے سپاہ نے جب بغاوت کی تو فوراً اس کی سرکوبی کے لیے بھوپال سے فوج بھیجی اور باغیوں کے ہاتھ سے چھاونی کو نہایت ہوشیاری سے بچا لیا۔

انھوں نے بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائیں۔ اور اُن کو ہر قسم کا آرام دیا۔ انگریزی فوج کے لیے کالپی کے حدود تک غلہ اور رسد پہونچائی۔ اور ساگر۔ جھانسی اور بندھیل کھنڈ تک اپنی فوج حفاظت اور امن قائم کرنے کے لیے بھیجی۔

ان کی اس وفاداری کی گورنمنٹ نے بہت قدردانی فرمائی جنوری ۱۸۶۱ء میں بمقام جبلپور لارڈ کیننگ نے ایک دربار منعقد کیا جس میں وسط ہند کے رؤسا شریک تھے اس دربار میں لارڈ صاحب ممدوح نے نواب سکندر بیگم صاحبہ کو خطاب کر کے انکی بہت

تعریف کی۔ اور اُن کی غدر کی خدمات کا اعتراف کر کے بطور صلہ کے پرگنہ بیرسیہ کی سند تملیک جس میں ۲۵۴ مواضع ہیں اور جو ریاست دہار کے ملک کا حصہ تھا اور بوجہ بغاوت کے ضبط کر لیا گیا تھا اپنے دست خاص سے عطا فرمائی۔

۱۲۷۶ھ میں بیگم صاحبہ کی درخواست کے مطابق گورنمنٹ نے ان کی بیدار مغزی کے سبب سے خوشنودی کے ساتھ ان کو بھوپال کی مستقل رئیسہ کر دیا۔ اور وہ باقاعدہ مسند نشین ہوئیں۔ نواب شاہجہاں بیگم نے جو اپنے باپ کی وراثت کے لحاظ سے رئیسہ تسلیم کی جا چکی تھیں کمال سعادتمندی سے ولی عہد رہنا منظور کیا۔

۱۲۷۸ھ میں لارڈ کیننگ نے پھر بمقام الہ آباد دربار منعقد فرمایا۔ اس میں بیگم صاحبہ کو اسٹار آف انڈیا کا تمغہ اور خطاب عطا کیا گیا۔

دربار سے فارغ ہو کر بیگم صاحبہ بنارس۔ جون پور۔ فیض آباد۔ لکھنؤ۔ کانپور۔ آگرہ متھرا وغیرہ کی سیر کرتی ہوئی دہلی تشریف لائیں۔ ان تمام مقامات میں گورنمنٹ کی طرف سے انکے اعزاز کا پورا لحاظ رکھا گیا۔

دہلی پہونچکر شاہی عمارات دیکھیں اور متبرکہ مقامات کی زیارت کی۔ جامع مسجد دہلی جو غدر کے بعد اس جرم پر بند کر دی گئی تھی کہ مسلمانوں نے بھی اس میں حصہ لیا تھا۔ بیگم صاحبہ کی استدعا پر کھل گئی۔ اور عام طور پر مسلمانوں کو اُس میں نماز پڑھنے کی اجازت ملی۔

دہلی سے پھر جیپور تشریف لے گئیں۔ مہاراجہ صاحب جیپور نے شاہانہ مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔

بعد ازاں اجمیر میں آکر حضرت خواجہ کی زیارت کی۔ وہاں سے قطع مراحل کرتی ہوئی بھوپال پہونچیں۔ اور خطاب ملنے کی خوشی میں ایک شاندار دعوت کا جلسہ کیا۔

۱۸۶۳ء میں جب آگرہ میں دربار ہوا تو اُس میں وفاداری اور حُسن انتظام کے صلے میں ایک نہایت گراں بہا خلعت بیگم صاحبہ کو عطا کیا گیا۔

نواب سکندر بیگم صاحبہ مذہب کی بڑی پابند تھیں۔ جب ریاست کے انتظام سے فارغ ہوئیں اور اس طرف سے اطمینان ہوا تو اُنھوں نے خیال کیا کہ میرے اوپر حج فرض ہی اسلیے اُسکا ادا کرنا ضروری ہی۔

اس زمانہ میں ریل بھوپال سے بہت فاصلہ پر تھی۔ یعنی قریب برہان پور کے مقام ہرگانوں میں ریلوے اسٹیشن تھا۔ پھر سمندر کا سفر نہایت خطرناک کیونکہ زیادہ تر بادبانی جہاز چلتے تھے اور دخانی جہاز بھی اسقدر محفوظ نہ تھے جتنے کہ اب ہوتے ہیں۔

باوجود اسقدر سفر کی دشواریوں کے عالی ہمت بیگم نے فریضہ حج ادا کرنے کا عزم بالجزم کرلیا۔

۱۲۸۰ھ میں تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمیوں کا قافلہ ساتھ لیکر جن میں اُن کی والدہ قدسیہ بیگم اُن کے ماموں میاں فوجدار محمد خاں اور مدار المہام مولوی جمال الدین خانصاحب بھی تھے وہ بیت اللہ کو روانہ ہوئیں۔

دو جہاز بادبانی اور ایک دخانی کرایہ کرکے یہ قافلہ مکہ معظمہ میں پہونچا اور حج کے مناسک ادا کیے۔ بدوؤں کی شورش وغیرہ کی وجہ سے مدینہ منورہ نہ جاسکیں صرف حج کرکے واپس آگئیں۔ وہاں ان ماں بیٹیوں نے تقریباً چار لاکھ روپیہ مصارف خیر میں صرف کیے۔

بیگم صاحبہ نے سفر حج کا روزنامچہ بھی تفصیل کے ساتھ مرتب کیا۔ لیڈی صاحبہ کرنیل اسبورن صاحب پولٹیکل ایجنٹ بھوپال نے اسکو انگریزی میں ترجمہ کرکے چھپوایا ہے۔

۱۸۶۶ء میں آگرہ میں عالیشان دربار ہوا جس میں وسط ہند کے جو اسی والیان ملک شریک تھے۔ وائسرائے نے خصوصیت کے ساتھ نواب سکندر بیگم صاحبہ اور مہاراجہ سندھیا کے حسن انتظام اور کارگزاری کی تعریف فرمائی۔ اور دوسرے والیان ملک سے توقع

ظاہر کی کہ وہ ان کی تقلید کرینگے۔

واپسی میں دہلی۔ فتحپور سیکری۔ متھرا۔ بھرت پور۔ دھولپور۔ گوالیار۔ دتیا۔ جھانسی وغیرہ مقامات کی سیر کرتی ہوئی بھوپال میں داخل ہوئیں۔

اس سیر وسفر کے تھوڑے عرصہ کے بعد بیمار ہوئیں اور اکیاون سال کی عمر میں ۱۴ رجب ۱۲۸۵ھ میں عالم بقا کو رحلت فرمائی۔ باغ فرحت افزا میں جو اُنھیں کا تعمیر کردہ ہی دفن ہوئیں۔ بحیثیت مختار ریاست و مستقل رئیسہ کے ۲۳ سال تک اُنھوں نے فرماں روائی کی۔

بیگم صاحبہ باوجود اس شانِ جلالت کے نہایت سادہ مزاج اور پابند شرع تھیں۔ اُنھوں نے وصیت کی تھی کہ میری تجہیز و تدفین میں کوئی رسم خلاف شرع نہ کیجائے اور نہ قبر پر گنبد ہو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ قبر پر صرف سنگ مرمر کا ایک محجر لگا دیا گیا ہی۔

اُنھوں نے اپنی زندگی کا بہت بڑا فرض رعایا کی بہبودی اور ترقی کو سمجھا تھا۔ وہ دن رات انھیں کی بہتری کے خیالات اور اذکار میں منہمک رہتی تھیں۔ اسی وجہ سے رعایا بھی ان پر قربان تھی۔ اور وہ اپنی اس خیرخواہ فرماں روا کو بیحد عزیز رکھتی تھی۔ باوجود اس ہردلعزیزی کے اُن کا رعب و جلال بھی بہت تھا۔

ان کو مردم شناسی کا بڑا ملکہ تھا۔ اور وہ جوہر کی بڑی قدردان تھیں۔ اسی وجہ سے انکے عہد میں بھوپال میں جہاں علم و فن سے کمتر لوگ واقف تھے بعض بعض اچھے اچھے اہل علم و فضل آئے اور اُن کی قدر کی گئی۔

سیر و سفر میں اُنھوں نے جو عمارتیں دیکھی تھیں اُن میں سے دہلی کی جامع مسجد اُن کو بہت پسند آئی تھی۔ بالکل اسی کے نمونہ پر بھوپال میں موتی مسجد کی بنیاد ڈالی۔ تمام مسجد سنگ سُرخ کی اور اندرونی حصہ سنگ مرمر کا رکھا۔ اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ وہ انتقال کر گئیں بعد میں نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے اسکو مکمل کرایا۔

شاہجہان بیگم

انکے والد جہانگیر محمد خاں تھے۔ جس زمانہ میں ان کی والدہ سکندر بیگم نواب جہانگیر محمد خاں کی ناچاقی کی وجہ سے قلعہ اسلام نگر میں چلی گئی تھیں۔ اسی زمانہ میں قلعہ مذکور میں ۲۔ جمادی الاول سنہ ۱۲۵۴ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔

اپنے والد کے انتقال کے بعد جب وہ بھوپال کی رئیسہ ہوئیں تو ان کی عمر صرف سات آٹھ سال کی تھی۔ ان کی تمام تر تعلیم و تربیت ان کی والدہ سکندر بیگم کے زیر اہتمام ہوئی۔

انھوں نے اُردو فارسی۔ حساب وغیرہ میں اچھی لیاقت حاصل کی۔ اس کے علاوہ فنون سپہگری مثلاً شہسواری۔ نیزہ بازی وغیرہ میں بھی مہارت پیدا کی۔ وہ خود کہتی ہیں۔

تا چراغ عقل در فانوس دل افروختم
عجب و نخوت جملہ اسباب جہالت سوختم

شہسوارم نیزہ بازم تیر اندازم شگرف
در شب تاریک اکثر پاے موران دوختم

از کرمہاے الٰہی درمیان چند سال
علم دین و نحو و صرف و ہندسہ آموختم

نظم و نثرم بر کمالاتم گواہ عادلست
منت ایزد را کہ گنج شائگان اندوختم

جب ان کی عمر ۱۹ سال کو پہونچی تو ان کی شادی ریاست کے سپہ سالار نواب امراؤ دولہ باقی محمد خاں کے ساتھ ہوئی۔

چونکہ نواب سکندر بیگم صاحبہ اس قانون سے کہ بیگم کا شوہر ریاست کا مستقل رئیس ہو بہت کچھ تلخیاں اور تکلیفیں اُٹھا چکی تھیں۔ اس لیے انھوں نے اپنی بیٹی کا نکاح کرنے سے پہلے ہی یہ معاملہ گورنمنٹ سے طے کر لیا کہ ریاست کی مستقل رئیسہ بلحاظ وراثت کے نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ ہی رہیں اور اُن کا شوہر برائے نام نواب ہو۔

اس شادی کے کچھ دنوں بعد غدر رہوا جس میں نواب سکندر بیگم صاحبہ نے نہایت دانشمندی سے ریاست کو اپنے قابو میں رکھا اور اس کی حفاظت کی۔ جس سے گورنمنٹ بہت خوش ہوئی۔ اس لیے بعد غدر کے ۱۲۷۶ھ میں نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے باوجود مستقل رئیسہ ہونے کے کمال سعادتمندی سے اپنی محترمہ، مدبرہ اور منتظمہ والدہ ماجدہ کو ریاست کی حکومت سپرد کی اور خود اُن کے سایۂ عاطفت میں ولی عہد رہنا منظور کیا۔

۱۲۷۴ھ میں ان کی پہلی بیٹی نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ بالقابہا موجودہ فرمانروائے ریاست بھوپال پیدا ہوئیں۔ اور ۱۲۷۸ھ میں دوسری بیٹی سلیمان جہاں بیگم صاحبہ کی ولادت ہوئی۔ لیکن ابھی ان کی پانچ سال کی بھی عمر نہ ہوئی تھی کہ ۱۲۸۳ھ میں انتقال کر گئیں۔

۱۲۸۴ھ میں نواب امراؤ دولہ باقی محمد خاں حج سے بیمار ہو کر واپس آئے اور قضا کر گئے اور اسکے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نواب سکندر بیگم صاحبہ نے وفات پائی۔

ان پیاپے جانکاہ صدموں نے نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کی نگاہ میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ دیا۔ چنانچہ اُنھوں نے نہایت شکستہ دلی کے ساتھ فرمایا ہے

اے چرخ چہ کردی بسلیمان و سکندر   کز تو ہوس عیش بود شاہجہاں را

نواب سکندر بیگم صاحبہ مرحومہ کی رسم عزاداری کے بعد دوبارہ ۱۲۸۵ھ میں وہ سریرآرائے ریاست ہوئیں۔

صدر نشینی کے بعد اُنھوں نے دیکھا کہ ریاست کی انتظامی حالت بہت ابتر ہے۔ نواب سکندر بیگم صاحبہ اپنی آخری زندگی میں چونکہ سفر حج وغیرہ اور بیماری کی وجہ سے کام نہ کر سکی تھیں اسوجہ سے حکم طلب کاغذات کے انبارہ کے انبار دفتر میں جمع ہو گئے تھے۔ رعایا کے ہزاروں مقدمات ملتوی پڑے ہوئے تھے۔ خزانۂ ریاست پر سات لاکھ کے قرض کا بار تھا۔

نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے نہایت تن دہی اور جانفشانی سے نظم ونسق شروع کیا۔ حکم طلب کاغذات پر احکام لکھوا کر دفتر سے نکالا۔ ساڑھے تیرہ ہزار غیر منفصلہ مقدمات کی مسلیں جو پڑی ہوئی تھیں اور جس سے رعایا سخت مشکل میں گرفتار تھی نہایت عمدگی سے تقسیم عمل کے اصول پر چھانٹ چھانٹ کر جن جن محکموں کے متعلق تھیں سپرد کی گئیں۔ اور انکے بہت جلد حسب ضابطہ فیصل کر دینے کی بابت احکامات صادر کیے گئے جہاں جہاں عملہ ناکافی تھا وہاں وہاں اضافہ کیا۔ اور ایک خاص محکمہ۔ محکمہ تحقیقات سنین ماضیہ کے نام سے قائم کیا۔ جو اس بات کی دیکھ بھال رکھے اور نیز امداد کرے کہ وہ مقدمات جلد اور باقاعدہ طے کر دیئے جائیں۔ اس طرح پر وہ مقدمات منفصل ہو گئے اور خوش اسلوبی کے ساتھ ریاست کا کاروبار چلنے لگا۔

قرضہ بھی تین چار سال کے اندر بیباق کر دیا۔ اور ریاست اس بھاری بوجھ سے سبکدوش ہو گئی۔

اُنھوں نے بھی اپنی محترم والدہ کی طرح ریاست کے مختلف اوقات میں دورے کیے اور رعایا کی حالت سے واقفیت حاصل کر کے ان کی ضروریات کا بندوبست فرمایا۔ انتظام میں بہت کچھ اصلاحیں کیں جس سے رعایا کو آرام ملا۔ اور سرکار انگریزی نے اس کی مدح و تعریف فرمائی۔

انھوں نے تمام ریاست کا کمپاسی پیمایش کی رو سے بندوبست کرایا جس سے اُس کے محاصل میں اضافہ ہوا۔ اور رعایا کے ساتھ ہر طرح کی ممکن رعایتیں برتیں کاشتکاروں اور ٹھیکہ داروں کو معافیاں دیں۔

انھوں نے قانون میں حسب ضرورت ترمیم کی اور ازسرنو اسکو نہایت عمدگی سے مرتب کرایا۔ عدالت کے لیے جوڈیشل محکمے قائم کیے۔

فوجی معاملات کی طرف بھی انھوں نے توجہ فرمائی۔ چونکہ وہ خود حوصلہ مند اور بہادر

تھیں اسلیے فوج سے اُن کو دلچسپی تھی۔

انھوں نے اپنے لیے باڈی گارڈ کا ایک رسالہ مرتب کیا۔ جو ہر لحاظ سے نہایت شاندار تھا۔ ریاست میں پہلے بیلوں کا توپ خانہ تھا انھوں نے اسپی توپ خانہ قائم کیا۔ سواروں کی حالت درست کی اور ان کی تنخواہ میں اضافہ فرمایا۔ لاکھوں کے صرفہ سے رجمنٹ اعانت شاہی قائم کی۔

رفاہ عام کے کاموں کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتی تھیں۔

انھوں نے مفصلات میں پختہ سڑکیں بنوائیں جو علاقہ جات غیر سے جا کر مل گئی ہیں۔ جہاں پانی کی تکلیف تھی وہاں کنوے کھدوا دیئے۔ رعایا کے آرام کے لیے جا بجا گھاٹ بنوا دیئے۔

ملکہ معظمہ کی پنجاہ سالہ جبلی کی یادگار میں ڈیڑھ لاکھ روپیے کے صرفہ سے ایک نہر تیار کرائی جس سے شہر کے وہ حصّے بھی سیراب ہو گئے جہاں پانی کی سخت ضرورت تھی۔ محکمہ وکسنیشن مقرر کیا۔ پرگنوں میں یونانی ڈاکٹری شفاخانوں کا بندوبست فرمایا۔ خاص بھوپال میں بہت سے یونانی شفاخانے اور پرنس آف ویلز ہاسپٹل کھولا۔ لیڈی لینسڈاؤن ہاسپٹل کا افتتاح کیا۔ جس میں عورتوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ نیز اس میں دائیوں کو تعلیم دی جاتی ہے جو ریاست میں مفصلات کی عورتوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔

مزدوری پیشہ طبقے کے لیے سات لاکھ کے صرفہ سے ایک عظیم الشان کاٹن مل قائم کی۔

انھوں نے ریاست میں ڈاکخانے جاری کیے۔ تاربرقی کے نہونے سے بہت تکلیف اور کاروباری اور تجارتی دقتیں تھیں۔ ہزاروں روپیہ صرف کر کے تاربرقی کا سلسلہ جاری کرایا۔

بھوپال میں ریلوے نہ تھی۔ علاوہ آمد و رفت اور تجارتی تکالیف کے اس کے

نہ ہونے سے ایک دقت یہ تھی کہ قحط کے زمانہ میں جبکے یہاں اکثر حملے ہوتے رہتے تھے۔ سخت تکلیف کا سامنا ہوتا تھا۔ اس لیے یہ تجویز کی گئی کہ ریلوے نکالی جائے۔ چنانچہ بڑی پٹری کی لائن ۱۳۰۲ھ میں اٹارسی سے نکالی گئی جو بلنیا۔ جھانسی اور گوالیار ہوتی ہوئی ٹونڈلہ سے ملادی گئی۔ اس ریلوے کے لیے بیگم صاحبہ نے پچاس لاکھ روپیے دیئے جس سے علاوہ بہت سے آرام اور آسانیوں کے یہ بھی ہوا کہ ایک بڑی رقم ان روپیوں کے آمدنی کی ہر سال ریاست کے خزانہ میں داخل ہوتی ہے۔

۱۸۹۶ء میں بھوپال سے ایک شاخ اجین کو نکالی گئی۔ حدود ریاست میں اس ریلوے کی تعمیر کا صرفہ اُنیس لاکھ تھا جو ریاست کے خزانہ سے دیا گیا۔ اس کی آمدنی بھی سالانہ ریاست کو ملتی ہے۔

ریاست کی خاص علامتوں میں سے ایک علامت سکہ بھی ہے اور ہر رئیس کو اپنے نام کا سکہ محبوب ہوتا ہے۔ ریاست بھوپال میں بھی ایک جداگانہ سکہ خاص ریاست کا رائج تھا جو وہیں کے دارالضرب میں مسکوک ہوتا تھا۔ مگر انگریزی روپیے سے تبادلہ میں اسپر مختلف اوقات میں مختلف بٹہ لگتا تھا۔ جس سے تجارت کے معاملات میں پیچیدگیاں پڑجاتی تھیں۔

نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے محض رعایا کے آرام کے خیال سے اس سکہ کو اٹھادیا اور اسکے بجائے ۱۳۱۵ھ سے سکہ انگریزی ریاست میں جاری کردیا۔

انھوں نے بھوپال میں انگریزی تعلیم کے لیے ایک ہائی اسکول کھولا۔ ایک بہت بڑا مدرسہ جہانگیریہ اپنے محترم باپ جہانگیر محمد خاں کے نام سے جاری کیا جس میں سینکڑوں طلبا کو تعلیم کے لیے وظیفے دیئے جاتے تھے۔ نیز نواب صدیق الحسن خاں مرحوم کے مزار پر بھی ایک مدرسہ قائم کیا۔ پرنس آف ویلز کے نام سے ایک صنعت و حرفت کا اسکول کھولا۔ جس میں دری بافی، نواڑ، چکن، قالین، خیمہ دوزی، سلائی کا کام وغیرہ بہت سی چیزیں

سکھائی جاتی ہیں۔

اپنے نام سے ایک مطبع شاہجہانی قائم کیا جہاں سے ہفتہ وار ایک اخبار عمدۃ الاخبار کے نام سے جاری کیا۔

ان کی ان تمام کوششوں پر گورنمنٹ نے بہت خوشنودی ظاہر کی۔ اور ان کی معدلت گستری اور رعایا پروری کی کیفیت سنکر ملکہ معظمہ نے ازراہ قدردانی ۱۲۸۹ھ میں جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ اور پھر ۱۲۹۶ھ میں کراون آف انڈیا کا خطاب عطا فرمایا۔ کلکتہ اور بمبئی کے درباروں میں نہایت اعزاز و احترام کے ساتھ وہ شریک کی گئیں۔

۱۲۹۳ھ کے دہلی دربار میں ملکہ معظمہ کی طرف سے ان کو نشان شاہی اور تمغہ قیصر ہند عطا ہوا۔

جنگ روم و روس میں انھوں نے دولاکھ روپئے مسلمان مجروحین جنگ کی تیمارداری اور ان کی بیواؤں اور یتیموں کی پرورش کے لیے بھیجے تھے اس کے صلے میں سلطان عبدالحمید خاں نے تمغہ شفقت درجہ اول اور شکریہ کے خطوط بھیجے۔

ان کے عہد میں ریاست کا اعزاز بہ نسبت سابق کے بہت بڑھ گیا۔ بڑے بڑے انگریزی حکام وہاں آنے لگے۔ لارڈ فریڈرک رابرٹس کمانڈر انچیف افواج ہند۔ لارڈ لینسڈاون، لارڈ ایلگن اور لارڈ کرزن اپنے اپنے عہد میں بھوپال میں رونق افروز ہوئے اور بیگم صاحبہ کی شاہانہ مہمان نوازی کی بہت تعریف فرمائی۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کے پہلے شوہر نواب باقی محمد خاں ۱۲۸۴ھ میں انتقال فرما گئے۔ اس کے بعد بعض خیرخواہوں نیز سرکاری افسروں نے بیگم صاحبہ کو نکاح ثانی کا مشورہ دیا۔

باوجود اسکے کہ نکاح ثانی ہندوستان کے مسلمانوں بالخصوص امرا کے گھرانوں میں ہندوؤں کے اثر سے اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ لیکن انھوں نے اسکا کچھ خیال

نہیں کیا اور شرع شریف کے حکم کے مطابق نواب صدیق الحسن خانصاحب سے جو ریاست کے میر دبیر تھے اور بلحاظ سیادت خاندانی وفضل وکمال وسیرت وصورت کے پسندیدہ معلوم ہوئے بمنظوری گورنمنٹ نکاح ثانی کرلیا۔

لیکن چونکہ یہ نکاح ایک غیر کفو کے شخص سے ہوا تھا اسلیے قدرتاً کچھ ایسے خانگی جھگڑے پیش آئے کہ جس سے بیگم صاحبہ اور اُنکے قریب ترین اعزہ میں سخت ناچاقی واقع ہوگئی۔ یہانتک کہ وہ شہر چھوڑ کر تاج محل میں چلی گئیں۔ اور پھر ایک چوتھائی صدی یعنی مرتے دم تک شہر میں آئیں۔ اور نہ اُن عزیزوں سے ملنا گوارا کیا۔

عالی دماغ لوگوں کی زندگی کا خاتمہ اکثر درویشی پر ہوتا ہی۔ چنانچہ بیگم صاحبہ کی طبیعت پر بھی آخری زندگی میں درویشی بہت غالب آگئی تھی۔ تلاوت۔ ریاضت اور عبادت میں اُنکے اوقات بسر ہوتے تھے۔

ان کے زمانہ میں شہر میں جو اسلامی شان اور رونق تھی وہ ابتک زمانہ میں مشہور ہی خانقاہیں آباد تھیں اور مسجدیں معمور۔

ان کا زمانہ بھوپال کے لیے بالکل ایسا ہی تھا جیسے کہ باغ میں بہار کا زمانہ ہوتا ہے ان کی داد ودہش اور فیاضی کی وجہ سے دیار وامصار کے لوگ کھنچے ہوئے بھوپال میں چلے آتے تھے۔ شام اور عرب تک کے اہل علم کو وہاں کی کشش کھینچ لاتی تھی اور سب کا دامن آرزو ان کی فیاضی سے مالامال ہوتا تھا۔

نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کا نمایاں وصف فیاضی ہی جو کہ انسان کے اخلاق میں سب سے بہتر خلق شمار کیا گیا ہی۔ وہ غریبوں کو سیکڑوں من غلہ تقسیم کراتی تھیں اُنھوں نے سدابرت اور لنگر خانے جاری کر رکھے تھے۔ بہت سے غریبوں کے لیے گذارہ مقرر تھا۔ کئی ایک محکمے اسی قسم کی امداد کے لیے قائم تھے۔ بالخصوص محکمہ مصارف جہاں سے سیکڑوں اہل استحقاق کو ماہوار تنخواہ ملا کرتی تھی۔

۱۸۹۶ء کے سخت قحط میں اُنھوں نے بڑی فیاضی کی۔ ہزاروں آدمیوں کی جانیں بچائیں۔ بہت سے خاندانوں کو بربادی سے محفوظ رکھا۔ علاقہ جات غیر کی قحط زدہ رعایا جو ان کی ریاست میں آگئی اسکو بھی بھوک کی تکلیف سے بچایا

وہ کسی کو محروم کرنا جائز نہیں رکھتی تھیں۔ اور یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے۔ اُنھوں نے خود فرمایا ہے اور سچ فرمایا ہے ؎

رستیم شجر وار بگلزار امارت　　　غیر از کرم وجود نباشد ثمر ما

ان کو بھی اپنے ہمنام بادشاہ شاہجہاں کی طرح عمارت کا بہت شوق تھا۔ بھوپال کے باہر شاہجہاں آباد ایک پورا شہر کا شہر تعمیر کرایا۔ تاج محل۔ عالی منزل۔ نواب منزل اور بے نظیر وغیرہ بہت سی عالیشان عمارات وہاں کی قابل دید ہیں۔

تاج المساجد کی تعمیر شروع کی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اسکے مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ انتقال فرما گئیں۔ یہ مسجد اسقدر عالیشان ہے کہ باوجود اسکے کہ ابھی پوری نہیں ہوئی ہے سولہ لاکھ روپیے اس کی تعمیر میں خرچ ہو چکے ہیں۔ سات لاکھ روپیہ کے صرفہ سے انگلستان میں اسکے لیے بلورین فرش تیار کرایا گیا۔ لیکن علمار نے اسپر نماز ناجائز قرار دیدی۔ کیونکہ نماز پڑھتے وقت آدمی کی پوری صورت اس میں نظر آتی ہے۔

بیگم صاحبہ کے اندر علمی اور ادبی مذاق بھی تھا۔ ان کی تصنیفات سے کئی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں امرا اور رؤسا کی زیادہ تر تصانیف ان کی قدردانی اور ہنر پروری کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ لیکن کم سے کم اس سے ان کی علمی دلچسپی کا ثبوت ضرور ہوتا ہے۔

بیگم صاحبہ کی علمی دلچسپی اسوجہ سے اور ترقی کر گئی تھی کہ انکے شوہر مولوی صدیق حسن خاں علم و فضل میں یکتاے روزگار تھے۔ ان کی سیکڑوں تصنیفیں اردو

فارسی اور عربی میں ہندوستان سے لیکر مصر و عرب و روم تک شائع ہوئیں۔
علاوہ بریں بیگم صاحب کے دربار میں بہت سے علما و فضلا کا مجمع رہتا تھا جن میں سے اکثر صاحب تصنیف تھے۔ وہ اُنسے فرمائش کر کر کے کتابیں لکھواتی تھیں۔ اور انعام واکرام سے مالامال کر دیتی تھیں۔
اُنھوں نے ایک کتاب تہذیب نسواں و تربیۃ الانسان عورتوں کی ضروریات کے لیے لکھی ہے۔
دوسری کتاب خزانۃ اللغات ہے اس میں اُردو الفاظ کی فارسی۔ عربی۔ ترکی انگریزی اور سنسکرت سب کچھ لکھدی ہے۔
تاج الاقبال فی تاریخ بھوپال۔ ریاست کی تاریخ میں اُنھوں نے لکھی۔ یہ کتاب فارسی اُردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں ہے۔ اگرچہ اس کتاب کا مواد سکندر بیگم نے جمع کیا تھا لیکن جس خوبی کے ساتھ وہ ترتیب دیا گیا ہے اسکے لحاظ سے وہ قلم نہایت عزت کے قابل معلوم ہوتا ہے جس نے اُسکو لکھا۔
اس میں آغاز ریاست سے اپنی مسند نشینی کے چار سال بعد تک کے واقعات لکھے ہیں اسکے بعد انھوں نے تیس سال تک جو مواد تاریخی جمع کیا۔ کثرت مشاغل سے اپنی زندگی میں اُسکو شائع نہ فرما سکیں۔ اور افسوس ہے کہ اُنکے بعد وہ قیمتی سرمایہ ضائع ہو گیا۔
بیگم صاحبہ شاعر بھی تھیں۔ انکے دربار میں شعرا کا بھی اچھا خاصا مجمع رہتا تھا۔ وہ پہلے شیریں تخلص کرتی تھیں۔ پھر تاجور بدل دیا تھا۔
اُنھوں نے ایک مثنوی صدق البیان لکھی ہے۔ اور مثنویوں کی طرح اس میں کوئی مسلسل قصہ شروع سے آخر تک نہیں ہے۔ بلکہ کہیں ہولی کا بیان ہے۔ کہیں بسنت کا۔ کہیں برسات کا کہیں دیوالی وغیرہ کا۔ یہ مثنوی انکے افتاد مزاج کے بالکل مطابق ہے۔ کیونکہ انکو جیل پہلے

اور دہوم دھام بہت پسند تھی۔ معمولی معمولی باتوں پر بڑے بڑے جشن کر دیتی تھیں اور بیدریغ لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہا دیتی تھیں۔

اس مثنوی میں بیچ میں سلطنت دہلی کا بیان بھی لکھا ہی۔ لیکن یہ عجیب بات ہی کہ اس میں امیر تیمور کا مقابلہ پرتھی راج سے دکھایا ہی۔ معلوم ہوتا ہی کہ یہ اُسوقت کی تصنیف ہے جبکہ صحیح تاریخی معلومات اُن کو حاصل نہیں تھیں۔

اس مثنوی کے علاوہ انکے دو دیوان غزلیات وغیرہ کے ہیں۔ دیوان شیریں اور دیوان تاج الکلام۔ لیکن ہم کو افسوس ہے کہ یہ ناموزوں زیوران کے شاہانہ قلم پر کیوں باندھا گیا۔

نموناً حمد الہیٰ میں ایک غزل دیوان تاج الکلام سے نقل کرتے ہیں۔

اپنی قدرت سے نمایاں حق نے کیا جلوہ کیا ۔۔۔ حور و غلماں جن و انسان و ملک پیدا کیا
صورت و سیرت بنائی مختلف ہر ایک کی ۔۔۔ خلق کا نقشہ مرتب جس طرح چاہا کیا
اپنی قدرت سے کیے پیدا بہت انواع خلق ۔۔۔ پر بشر کا سب سے بڑھ کر منصب و رتبہ کیا
حضرت انساں کو بخشی دانش و فہم و ذکا ۔۔۔ اپنے وصفوں کا نمونہ اس میں سب پیدا کیا

تاجو رہی حمد کے لائق وہی ذات قدیم
جس نے قدرت سے زبان خلق کو گویا کیا

دیوان کے آخر میں بہت سی پہیلیاں لکھی ہوئی ہیں۔ چونکہ اس سے ذہانت کا اندازہ ہوتا ہی اس لیے اس میں سے چند ہم درج کرتے ہیں۔

پہیلی سوئیں

کوٹ کے نر کو نار بنائیں ۔۔۔ توڑیں تاڑیں ملیں ملائیں
اینچیں کھینچیں کاٹیں بال ۔۔۔ بھوجن کر لو میرے لال

پہیلی مشک

چھوٹا سا مُنہ بڑا سا پیٹ　　جل کو دیکھے جاوے لیٹ
وہ تریا ہے ایسی ڈھیٹ　　چلتے مَش کی لاگے پیٹ

پہیلی ڈولی

چار خصم کی ہے اک نار　　ٹکے ٹکے پر پھرے بزار

پہیلی چراغ

عجب تلیا پیمر سا ور رین ہی رین بہا ے　　اے سکھی میں تو سے پوچھوں پل پل کو کھائے

فارسی کے اشعار بھی کہتی تھی ۔ اگرچہ ان کے فارسی اشعار کا کوئی مجموعہ نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن بہت سے تذکروں مثلاً شمع انجمن ۔ نگارستان سخن ۔ صبح گلشن روز روشن ۔ اختر تاباں ۔ ماہ درخشاں ۔ طور کلیم اور حدیقہ عشرت وغیرہ میں انکے اشعار دیکھنے میں آئے ۔ کتاب تذکرۃ الخواتین میں بیگم صاحبہ کی یہ غزل مندرج ہے۔

ہر دم زحسن یارِ من ریزد تجلاے دگر　　چشم بود در ہر نظر محو تماشاے دگر
خوبانِ دنیا گو ہمہ، خوبند از سر تا بپا　　نامِ خدا آں دلربا دارد سراپاے دگر
از بوریاے زاہداں، بوے ریا آید بجاں　　بہر نماز عاشقاں باید مصلاے دگر
باور مکن قولِ عدو، ساغر کجا و شیشہ کو　　اے محتسب ایں ہے وہو دارم زصہباے دگر
من میدوم سوے حرم، دل میکشد سوے صنم　　من میروم جاے دگر دل میرود جاے دگر
جانم تنگ آمد از و، یارب چساں سازم بدو　　من می‌زنم راے دگر او می زند راے دگر
اے عشق بے پروا بیا، تا وارہم از ماسوا　　جز درد تو نبود مرا در دل تمناے دگر

شاہجہانم بے گماں، ہم تاجور در ہندیاں
جز یادِ داور در جہاں، دارم نہ سوداے دگر

۱۳۱۹ھ میں ۶۵ سال کی عمر میں ۴۴ برس ریاست کرنے کے بعد انتقال فرمایا۔

اور اپنے باغ نشاط افزا میں دفن ہوئیں۔

نواب سلطان جہاں بیگم

علیا حضرت ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ تاج الہند جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ جی۔ سی۔ آئی۔ اے فرمانروائے بھوپال

ہر ہائنس کے والد ماجد نواب امراؤ دولہ باقی محمد خاں اور والدۂ ماجدہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ ہیں۔ ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۹ جولائی ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئیں۔

اسی سال ہندوستان میں غدر سے امن و امان ہو چکا تھا۔ اور اس ملک کی حکومت کمپنی کے ہاتھ سے ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھ میں منتقل ہوئی تھی۔ ہر ہائنس کی نانی نواب سکندر بیگم صاحبہ نے ان کی ولادت پر بڑی خوشی کی۔ چھ مہینے تک جشن رکھا۔ غربا اور مستحقین کو انعام و خلعت عطا کیے اور طرح طرح سے خوشی کا اظہار کیا۔

ان کی ولادت کے بعد ہی نواب سکندر بیگم صاحبہ مستقل رئیسہ تسلیم کی گئیں۔ اور ۱۲۷۵ھ میں بیرسیہ کا پرگنہ گورنمنٹ کی طرف سے ملا، اور پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اسٹار آف انڈیا کا تمغہ ان کو عطا ہوا۔ بعد ازاں خلعت بھی پایا۔ ان وجوہات سے وہ ہر ہائنس کو نہایت مبارک سمجھتی تھیں اور بڑی شفقت کے ساتھ تربیت فرماتی تھیں۔

۵ سال کی عمر میں نہایت دھوم دھام سے بسم اللہ کی تقریب ہوئی اور ہر ہائنس کی تعلیم کا ضابطہ معین کیا گیا۔

کلام مجید۔ تفسیر۔ خوشخطی۔ فارسی۔ انگریزی اور پشتو ان تمام چیزوں کی تعلیم شروع ہوئی

اس کے علاوہ آبائی فنون سپہگری مثلاً سواری بانک وغیرہ بھی سکھلائے جانے لگے۔

ہر ہائنس کو مصوری سے خاص دلچسپی تھی۔ اور وہ دلچسپی ابتک قائم ہے۔ اگرچہ مہمات ریاست اور کثرت مشاغل سے وقت نہیں ملتا ہے لیکن پھر بھی وہ اس کی مشق جاری رکھتی ہیں۔

چنانچہ ۱۳۱۲ھ میں حج سے واپسی کے موقع پر بمبئی سے دو ایک پارسی لیڈیوں کو جو اس فن میں مہارت رکھتی تھیں اپنے ساتھ ریاست میں لائیں۔ اور انسے اس فن کی مشق بہم پہنچائی۔ اب وہ بلا مدد غیر کے تصویریں بنالیتی ہیں۔

۱۲۸۴ھ میں ان کے نامور باپ کا انتقال ہوگیا۔ اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۱۲۸۵ھ میں جبکہ ہر ہائنس کی عمر دس سال کی تھی۔ نواب سکندر بیگم صاحبہ کا بھی سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اُن کی تعلیم و تربیت اُن کی والدہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کی زیر نگرانی جاری رہی اسی سال یعنی ۱۲۸۵ھ میں جب ان کی والدہ صدر نشین ہوئیں تو ان کو ولی عہدی کا خلعت ملا باوجود کم سنی کے اس موقع پر بر سر دربار شکریہ ادا کرتے ہوئے اُنھوں نے ایک مختصر سی تقریر کی جسکو سُنکر اُن کی جرأت اور لیاقت سے لوگوں کو تعجب ہوا۔

۱۲۸۸ھ میں انکے کلام مجید ختم کرنے کے موقع پر نشرہ کی رسم بڑی شان و شوکت کے ساتھ کی گئی۔ ایک مہینہ تک شب و روز جشن رہا اور تقریباً تین لاکھ روپیہ اس تقریب میں نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے صرف کیا۔

ہر ہائنس کی شادی کے لیے نواب سکندر بیگم صاحبہ نے نہایت دوراندیشی کے ساتھ اپنی زندگی ہی میں جلال آباد کے ایک اپنے ہی ہم قبیلہ نوجوان نواب احمد علی خانصاحب کو جو نجیب الطرفین خوش رو۔ خوش وضع او خوش اخلاق تھے منتخب فرمالیا تھا۔ اور اپنی ہی نگرانی میں انکی تعلیم و تربیت بھی کی تھی۔

۱۲۹۱ھ میں جب ارکان ریاست سے مشورہ اور گورنمنٹ سے استصواب وغیرہ کے تمام مراحل

طے ہوگئے تو ۲۳ - ذی الحجہ کو نواب صاحب موصوف کے ساتھ نہایت دھوم دھام سے عقد کیا گیا - دو کرور کا مہر قرار پایا - اور چالیس ہزار سالانہ کی جاگیر نوشہ کو عطا ہوئی - اس تقریب میں ساڑھے چھ لاکھ روپئے صرف ہوئے -

ہر ہائنس کے پانچ اولاد ہوئیں -

(۱) بلقیس جہاں بیگم صاحبہ - ولادت ۲۴ رمضان ۱۲۹۲ھ

(۲) نواب محمد نصراللہ خان بہادر (جو اب ولی عہد ریاست ہیں) ولادت ۱۷ ذیقعدہ ۱۲۹۳ھ

(۳) صاحبزادہ حاجی حافظ کرنیل محمد عبیداللہ خان بہادر 〃 〃 〃 ۱۲۹۵ھ

(۴) صاحبزادی آصف جہاں بیگم صاحبہ 〃 ۲۵ شعبان ۱۲۹۷ھ

(۵) صاحبزادہ محمد حمیداللہ خان بہادر 〃 ۹ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ

بلقیس جہاں بیگم ساڑھے بارہ سال کی ہوکر ۱۳۰۵ھ میں والدین کو داغ مفارقت دے گئیں - اور اسی طرح صاحبزادی آصف جہاں بیگم نے بھی ۱۴ سال کی عمر میں ۱۳۱۲ھ میں انتقال فرمایا -

نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے ۱۲۸۸ھ میں چونکہ مولوی صدیق حسن صاحب سے نکاح ثانی کرلیا تھا - اسوجہ سے کچھ خانگی جھگڑے ایسے پیش آئے کہ جن سے ماں بیٹی میں باہم رنجش پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے ہر ہائنس نے کامل ۲۷ سال تک رنج بھری اور تنہائی کی زندگی گذاری - نہ اپنی والدۂ ماجدہ سے مل سکتی تھیں نہ ارکان ریاست ان سے ملنے پاتے تھے -

۱۹۰۱ء میں جب نواب شاہجہاں بیگم نے وفات پائی اسوقت عنان حکومت انکے ہاتھ میں آئی - اُنھوں نے دیکھا کہ قحط اور سابقہ بدنظمیوں کی وجہ سے ریاست کی حالت نہایت ابتر تھی - آبادی تقریباً ایک ثلث گھٹ گئی تھی خزانہ میں کل چالیس ہزار روپیہ تھے - اور اس سال کی تمام آمدنی صرف اٹھارہ لاکھ تھی -

یہ دیکھ کر نہایت چستی اور جانفشانی کے ساتھ ریاست کے کام میں مصروف ہوئیں۔ اور اپنے محترم شوہر احتشام الملک عالی جاہ نواب احمد علی خانصاحب کی مدد اور مشورہ سے نہایت قابلیت کے ساتھ انتظام کرنا شروع کیا۔ لیکن ابھی ریاست ملے ہوئے پورے سات مہینے بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ قضائے الٰہی سے ۲۳ رمضان ۱۳۱۹ھ کو نواب صاحب موصوف دفعتاً انتقال کر گئے۔

ہرہائنس کے لیے یہ صدمہ نہایت سخت اور یہ موقع بڑی آزمائش کا تھا۔ مدت العمر کی خانہ نشینی کے بعد ریاست کا عظیم الشان بار انکے سر پر پڑا اور اس بار کے اُٹھانے میں جس سچے خیرخواہ اور حقیقی مشیر سے مدد کی توقع تھی وہ یکایک اس طرح اُٹھ گیا۔ اب ہرہائنس کو انکی بیوقت اور اچانک موت کے بھاری صدمہ کے ساتھ ریاست کا بوجھ بھی تنہا ہی اُٹھانا پڑا

جو لوگ ہرہائنس کی حالت سے ناواقف تھے اور کارکن فرد نواب صاحب مرحوم کو سمجھتے تھے ان کو نواب صاحب کے انتقال کر جانے سے ریاست کی اصلاح سے مایوسی ہو گئی تھی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد علیا حضرت نے ریاست کو ترقی دیکر اور اس کے تمام صیغوں کی اصلاح کر کے روز روشن کی طرح یہ ثابت کر دیا کہ درحقیقت اصلی کارکن فرد انہیں کی ذات والاصفات تھی۔ اُنھوں نے اپنی خاموشی اور خانہ نشینی کے ۲۷ سال بیکار نہیں کھوئے ہیں۔ بلکہ بہت غائر نظر سے ریاست کے ہر شعبہ کو دیکھتی رہی ہیں۔ نوشابہ کے اس قول کی مصداق اصل میں علیا حضرت ہیں ؎

دریں پردہ باخود بہ بازی نیم	شب و روز بے چارہ سازی نیم
من ارچہ زنم زن بسیر نیستم	زکار جہاں بے خبر نیستم

درحقیقت وہ اپنے سر میں ایک بیدار مغز رکھتی ہیں۔ اس جانکاہ غم نے اُن کے حوصلہ کو پست نہیں کیا، اور باوجود اسکے کہ وزیر ریاست نے بھی اپنے بڑھاپے کی وجہ سے استعفا دیدیا۔ ہرہائنس نے خود تن تنہا ڈیڑھ سال تک ریاست کا کام انجام دیا۔ باوجو

شدت گرما کے اُنھوں نے متعدد اضلاع میں دورے کیے۔ رعایا کی اصلی کیفیت اپنی آنکھوں سے
دیکھی اور بہت کچھ ان کی شکایات کا سدِّباب کیا۔

ایک فوری بندوبست پنجسالہ تمام ریاست میں کرایا جس میں متاجروں کے ساتھ ساڑھے
پانچ لاکھ روپیے کی مالیہ میں رعایت کی تاکہ رعایا خوشحال رہے۔

ریاست کے تمام صیغوں کی طرف اُنھوں نے اپنی توجہ مبذول فرمائی۔ سب سے پہلے اسکی
مالی حالت کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اور جدید طریقہ سے اسکا انتظام فرمایا۔ جس کی بدولت سال
اوّل میں تقریباً تین لاکھ اور سال دوم میں ساڑھے چھ لاکھ روپیے کی آمدنی میں بیشی ہوئی۔
اخراجات کی زیادتی پر نظر کرکے بعض فضول دفاتر کو شکست کر دیا۔ صیغہ مناصب سے بہت سے
غیر مستحق تنخواہ پا رہے تھے اس میں تخفیف فرمائی۔

محکمۂ عدالت کی طرف بھی توجہ کی۔ اور وکلاء کے امتحان کا طریقہ مقرر کیا۔ بعض قوانین
مجریہ ریاست کو ازسرِنو مرتب کرایا۔ اور ریاست کے اسٹامپ کی اصلاح کی۔

فوج کی طرف جو خصوصیت کے ساتھ ان کی دلچسپی کا مرکز ہے زیادہ توجہ منعطف فرمائی۔ اور
علاوہ رسالہ باڈی گارڈ کی اصلاح کے ریاست کی تمام فوج کو اس قابل بنادیا کہ وہ بھی انگریزی سپاہ
کی طرح بروقت ضرورت گورنمنٹ کی خدمات کرسکے۔ ایک فوجی مدرسہ بھی قائم کیا۔

پولس کی اصلاح کی، اور ۲۰۵ آدمی کی جمعیت کو فوج سے نکالکر ماونٹیڈ پولس کا اضافہ کیا۔
جدید چوکیات قائم کیں جن سے جرائم کی کمی ہوئی۔ اسکے ساتھ ہی جیل میں بھی اصلاح کی۔ لوکل
سیلف گورنمنٹ کے اصول پر شہر بھوپال میں جماعت انتظامیہ قائم کی۔ جس کی کارروائیوں کی
اشاعت کے لیے ایک ہفتہ وار گزٹ سرکاری مطبع سے نکالنا شروع کیا۔

ریاست میں ذرائع آبپاشی مہیا کرنے کے لیے ڈھائی ہزار روپیے ماہوار کے صرفہ سے
ایک محکمہ قائم کیا۔ اور صنعت و حرفت کو رواج دینے کے لیے بھی ایک کمیٹی قائم کی۔

سب سے زیادہ جس چیز کی طرف علیا حضرت نے توجہ فرمائی وہ تعلیم ہے۔ چونکہ وہ خود تعلیم یافتہ

تھیں اس لیے تعلیم کی بے انتہا حامی ہیں اُنھوں نے عملاً اس کی مثال قائم کی اور اپنی اولاد کو نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلوائی۔ اپنے چھوٹے صاحبزادے کو علی گڑھ کالج میں بھیجا ہے جہاں وہ تعلیم پارہے ہیں۔

ریاست میں اخوان و اراکین ریاست کے بچوں کی تعلیم کے لیے الیگزنڈرا ہائی اسکول کھولا مسلمان لڑکیوں کے لیے ۱۳۲۱ھ میں مدرسہ سلطانیہ اور ہندو لڑکیوں کے لیے برجیسیہ کنیا پاٹ شالا قائم کیا۔

غریب عورتوں کی بسر اوقات کے لیے صنعت و حرفت کے نام سے ایک مدرسہ چندہ سے قائم کرایا تاکہ ریاست کے لوگ آپ اپنی مدد کرنے کے عادی ہوں۔ اس میں بھی زیادہ اپنی ہی امداد شامل رکھی۔ اس مدرسہ میں جو عورتیں کام سیکھنے کے لیے داخل ہوتی ہیں اُن کو عہ سے ہے تک ماہوار وظیفہ دیا جاتا ہے۔

صاحبزادی آصف جہاں بیگم مرحومہ کے نام سے طب یونانی کی تعلیم کے لیے مدرسہ طبیہ آصفیہ قائم کیا۔ اور تاکہ عمدہ یونانی دوائیں دستیاب ہوسکیں یونانی ادویہ کی بھی ایک دُکان کھلوائی۔

ہرہائنس کی تعلیمی کوشش کا دائرہ صرف اپنی ریاست ہی تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ ان کا بارانِ فیض تمام ہندوستان پر برسا۔ ہندوستان کی کوئی مفید اسلامی انجمن یا درسگاہ شاید ہی انکے رشحات فیض سے محروم رہی ہو۔ علی گڑھ کے حامیان تعلیم نسواں کے لیے آپ کی امداد کامیابی کا ذریعہ ہوئی۔ ندوہ اور دیوبند کے مدرسوں میں نہیں کے نسیم فیض نے ایک تازہ روح پھونکی۔ الغرض انکی فیاضیوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ اور علمی خدمات و امداد کے لحاظ سے اسوقت علیا حضرت کا سایۂ فیض ہندوستان کے مسلمانوں کے سر پر سایۂ ہما سے کم نہیں ہے۔

ہرہائنس اپنے زمانہ ولی عہدی سے شاہی درباروں میں شریک ہوتی رہی ہیں ۱۸۷۵ء

میں اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ جا کر کلکتہ کے اُس دربار میں شرکت فرمائی جو پرنس آف ویلس نے عطائے خطابات کے لیے منعقد فرمایا تھا۔ پھر انہیں کے ہمراہ ۱۸۷۷ء کے دہلی کے قیصری دربار میں اور ۱۸۸۳ء میں کلکتہ کے لارڈ رپن کے دربار میں شریک ہوئیں۔

یکم جنوری ۱۹۰۳ء میں شہنشاہی دربار دہلی میں بحیثیت رئیسہ ریاست شرکت فرمائی ہوئیں۔ ۲۴۔ جون ۱۹۰۴ء کو بتقریب سالگرہ ملک معظم ایڈورڈ ہفتم ان کو جی سی آئی ای کا خطاب ملا۔ ۱۳۲۱ھ میں وہ مثل اپنی نانی سکندر بیگم صاحبہ کے ایک بڑا قافلہ ہمراہ لیکر حج کے لیے تشریف لیگئیں۔ حجاز میں سلطنت عثمانیہ کی طرف سے آپ کا نہایت اعزاز و احترام کیا گیا۔ اور بخیر و عافیت ذیقعدہ حج ادا کر کے واپس تشریف لائیں۔ واپسی پر اپنا ایک سفرنامہ حج بھی مفصل مرتب فرمایا جو شائع ہو گیا ہے۔

۱۹۰۷ء میں امیر حبیب اللہ خاں شاہ افغانستان کی آمد کے موقع پر آگرہ میں جو دربار ہوا اُس میں بھی تشریف لیگئی تھیں۔ امیر صاحب نے پشتو اور فارسی میں گفتگو فرمائی۔ اور علیا حضرت کی ملاقات سے بہت خوش ہوئے اور یہ شعر پڑھا ؎

نہ انجیر شد نام ہر میوۂ　　نہ مثل زبیدہ است ہر بیوۂ

۱۹۱۱ء میں ملک معظم جارج پنجم کی رسم تاجپوشی کی شرکت کے لیے انگلینڈ تشریف لیگئیں اور نہایت اعزاز کے ساتھ شرکت فرما ہوئیں۔ لندن کے علاوہ پیرس، جینوا، بوڈاپسٹ وغیرہ یورپ کے مشہور شہروں کی سیر کی۔ مصر کو بھی دیکھا اور قسطنطنیہ بھی تشریف لیگئیں وہاں سلطان المعظم اور سلطانہ سے ملاقات فرمائی۔

ہر ہائنس کے اس سفر کے مفصل حالات ان کی چھوٹی بہو شاہ بانو صاحبہ نے سفرنامہ سلطانی کے نام سے شائع کیے ہیں۔ اسی سال پھر دہلی کے دربار تاجپوشی میں شریک ہوئیں اور جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب پایا۔ اس موقع پر محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ بھی دہلی میں تھا اسکے صیغہ تعلیم نسواں کے اجلاس میں بہ ہمدردی اسلام و حمایت تعلیم نسواں تشریف لائیں

اور کرسی صدارت پر رونق بخش ہو کر ایک پر مغز تقریر فرمائی۔

ہر ہائنس نے تاریخ بھوپال میں ایک کتاب تزک سلطانی دوسری گوہر اقبال شائع کی نیز اُن کی خود نوشت سوانحعمری کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہی۔ رفاہ عام کے خیال سے انھوں نے اس سال دو کتابیں اور بھی شائع کی ہیں۔ ایک بچوں کی پرورش اور دوسری تندرستی۔

ہر ہائنس کو بھی مثل اپنی والدہ ماجدہ کے تعمیر سے شوق ہی۔ اپنے لیے شہر سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کی ٹیکری پر نہایت عالیشان کوٹھی تعمیر کرائی ہی۔ جہاں اور بہت سی عمارتیں بنگئی ہیں اور اب احمد آباد اُس کا نام رکھا ہی۔ شہر کے مشرق میں عجائب خانہ نہایت عالیشان تعمیر کرایا ہے۔

ٹیلیفون بھی بھوپال میں جاری کیا۔ اور برق کا محکمہ قائم کیا جس سے برقی روشنی ہوتی ہے اور پنکھے چلتے ہیں اسکا ایک شعبہ علیگڈہ کالج میں بھی بھیجا اور ہر ہائنس کے فیض سے یہاں بھی برقی پنکھے چلنے لگے۔

اب شمسی حساب سے وہ اپنی زندگی کے ۵۵ سال اور قمری حساب سے ۵۷ سال گذار چکی ہیں اور اپنے حکومت کے فرائض کو نہایت عالی ہمتی۔ تندہی اور دانشمندی کے ساتھ ادا کر رہی ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی رعایا ہی کے دلوں میں محبوب ہیں بلکہ ہندوستان کے تمام لوگوں اور بالخصوص مسلمانوں میں نہایت ہر دلعزیز ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مبارک زندگی کو عرصہ تک قائم رکھے۔ اور اقبال میں ترقی عطا فرماوے۔ آمین

فاطمہ علیہ خانم

فاطمہ علیہ سلطنت ٹرکی کے سابق ناظر عدالت اور مشہور مورخ جودت پاشا کی بیٹی ہے۔
اکتوبر ۱۸۶۲ء میں بمقام قسطنطنیہ پیدا ہوئی ابھی تین برس کی عمر تھی کہ باپ ولایت حلب کا
حاکم مقرر ہوا ہونہار بیٹی کی لیاقت و شرافت کے آثار اول ہی سے ایسے ظاہر تھے کہ
باپ اسکا گرویدہ ہو گیا تھا حلب جاتے وقت اپنی جگر گوشہ کو قسطنطنیہ میں چھوڑ جانا اُس کا دل
گوارا نہ کر سکا آخر اپنے ساتھ اسکو بھی لیگیا۔ دو برس جب تک وہاں حاکم رہا اپنے ساتھ رکھا
بعد دو برس کے جب پھر قسطنطنیہ کی تبدیلی ہوئی اور واپس آیا تو چند لائق اُستادوں اور
اُستانیوں کو فاطمہ کی تعلیم کے لیے مقرر کیا اور خود اپنے سرکاری کاموں میں جو نہایت ذمہ داری
کے تھے مصروف ہو گیا یہانتک کہ بیٹی کی عمر اب چودہ سال کی ہو گئی جب ولایت یانیہ کی حکومت پر
سرفراز ہوا یہ بھی اُسکے ہمراہ گئی لیکن اسکے زیادہ عرصہ تک ساتھ نہ رہ سکی۔ تھوڑے عرصہ بعد
باپ پھر قسطنطنیہ کو واپس بلا لیا گیا اور حکومت سوریہ اسکو تفویض ہوئی فاطمہ پھر اُسکے ساتھ
گئی اور ایک معقول مدت تک دمشق و شام میں رہی ایک موسم جاڑے کا بیروت میں بھی بسر
ہوا بعد اسکے اپنے باپ کے ساتھ قسطنطنیہ کو واپس آئی۔

چھوٹی عمر میں قرأت کے اصول اور لکھنا پڑھنا سیکھا۔ ترکی کتابوں کے ساتھ عربی فارسی
بھی لائق اُستادوں سے پڑھتی رہی اور ان زبانوں کے حاصل کرنے کے بعد پیرس کی ایک
معلمہ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور اُس میں کمال پیدا کیا جسوقت کہ اپنے باپ کے ساتھ ولایت
سوریہ کا سفر کیا ہی علم ادب کی تمام شاخوں یعنی بدیع۔ بیان۔ عروض۔ نحو وغیرہ کی تحصیل
میں مصروف تھی علوم عقلیہ یعنی توحید۔ کلام۔ منطق ریاضی ہندسہ اور حساب اپنے باپ ہی
سے پڑھتی رہی۔ علم موسیقی کے تمام انواع یعنی اصول و فروع کو بڑے بڑے ماہرین فن

ترک. عرب. فرانسیسی اور ایرانیوں سے حاصل کیا اور وہ ملکہ بہم پہونچایا کہ تمام زمانہ اسکے کمال کو مانتا ہے۔

ان مختلف علوم کی شاخوں میں مہارت و کمال حاصل کرنے میں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امور خانہ داری کی تعلیم اور تجربہ کا اُسے موقع نہ ہوا ہوگا نہیں وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتونوں کے اس زیور سے بھی آراستہ ہی اور تمام امورِ خانہ داری میں اسکو ایسا سلیقہ حاصل ہے کہ اپنے ہمسروں اور قرب جوار کی شریف خاتونوں پر اس کی فوقیت مسلّم ہی۔

علم انشار اور کلام میں اس محترم خاتون کا کمال اس درجہ کا ہی کہ ایک خاص طریقہ کی موجد ہی مگر چونکہ ابتدا میں وہ چند ایسے اشغال میں جو مستورات کی زندگی کا لازمہ ہیں زیادہ مشغول رہی اسلیے اپنی تصانیف کی اشاعت کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکی۔ یہانتک کہ حضرت سلطان عبد الحمید خان ثانی کا عہد حکومت شروع ہوا۔ جو ترکوں میں علوم و فنون کی اشاعت اور چرچے کے لیے بڑا مبارک زمانہ خیال کیا جاتا ہی۔ خصوصاً دار السلطنت قسطنطنیہ میں علوم و فنون کی ہر طرح کی رونق اور گرم بازاری جب ترقی کے اعلیٰ زینے پر پہونچی تو بعض خاتونیں بھی آثار علمی کی اشاعت اور تصنیف و تالیف میں حصہ لینے لگیں اُنکے مقابلہ میں فاطمہ علیہ نے بھی اپنی لیاقت و کمال کے جوہر دکھانے شروع کیے اور ان میں سبقت حاصل کرنے کے واسطے پہلا کام فاطمہ علیہ نے فرانس کے ایک نامی مصنف اور مشہور ادیب جارج اونا کی ایک فرانسیسی تالیف کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا اور ترجمے کا نام "مرام" رکھا۔

یہ ترجمہ اس عمدگی کے ساتھ انجام دیا ہی کہ اصل کتاب کا اسلوب اور سیاق عبارت ترکی میں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہی اور ترجمہ ترکی میں اصل تالیف کے برابر لطیف ہے۔ یہ ترجمہ اسکے علم و فضل کا پہلا نمونہ ہی مگر بنظر حجاب اس میں اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔

نام چھپانے سے شاید یہ مطلب بھی ہو کہ ترجمہ کی نسبت پہلے اُس زمانے کے علمار

اور ادیبوں کی راے دریافت کرے۔ چنانچہ ترجمہ ابھی پورا نہیں چھپا تھا چند جز شائع ہوئے تھے کہ ترکی میں نئی روشنی کے آدمیوں نے جو وہاں طرز جدید کے موجد کہلائے جاتے ہیں اس کی نسبت اپنی پسندیدگی کی راے ظاہر کرنی شروع کی۔ علامہ مدحت آفندی نے جو ترجمان حقیقت، کے مہتمم ہیں تمام ترجمے کے ابواب کو شائع کیا اور صاحبان علم و فضل کو اس کی طرف شوق دلایا۔ چونکہ مترجم کا نام معلوم نہ تھا اور ترجمہ ایسا نایاب تھا اخبارات اور رسالوں میں بہت دن تک سلطنت عثمانیہ کے آدمیوں میں مترجم کے متعلق اٹکل پچو بحثیں ہوتی رہیں مگر احمد مدحت آفندی وغیرہ ترکی فاضلوں کی کوشش نے آخر اس نام کو پردہ سے نکالا اور دنیا پر ثابت ہو گیا کہ جارج اونا کے مشہور و معروف سالے کا کوئی مترجم نہیں ہے بلکہ مترجمہ ہے اور وہ جودت پاشا کی بیٹی فاطمہ علیہ ہے۔

ترکی مشہور مصنف احمد مدحت آفندی کے اصرار پر اور کمال خوشنودی ظاہر کرنے پر فاضلہ مترجمہ نے اپنا نام ظاہر کیا اور اس سے بہت علمی مباحثے کیے جن میں متعدد مقالے لکھے گئے اور ترجمان حقیقت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے تھے اس ذریعہ سے اور بھی زیادہ فاطمہ علیہ کی شہرت اُسکے معاصرین میں ہوئی۔ جب یورپ کے تمام ملکوں میں اسکی شہرت کا آوازہ پہونچا اور پیرس کی سیاح لیڈیوں نے اسکے حالات سُنے تو جب کبھی کوئی یورپ کی فاضلہ حرم سلطانی کی بیگمات اور خواتین سے ملنے کے لیے آتی تو وہ فاطمہ علیہ سے بھی ضرور ملتی اور فاطمہ علیہ اور ان سیاح لیڈیوں میں ایسے علمی تذکرے اور باتیں ہوتیں کہ جن سے اس کی علمی فضیلت کا نقش انکے دلوں پر جم جاتا۔

فاطمہ علیہ اور پیرس کی تین فاضلہ سیاح لیڈیوں میں چند بڑے بڑے مباحثے ہوئے ہیں جن کو فاطمہ نے ایک رسالہ کی صورت میں لکھ کر شائع کیا ہے اور اسکا نام "نسار الاسلام" رکھا ہے۔

یہ رسالہ پہلے ترجمان حقیقت ایک اخبار میں شائع ہوا اور اسکے بعد

ثمرات الفنون نے جو بیروت سے نکلتا ہی ترکی سے عربی میں ترجمہ کرکے چھاپا۔ اُردو۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی اسکے ترجمے شائع ہوئے جس سے فاطمہ کے نام اور شہرت کو اور رونق ہوئی۔

یہ رسالہ اُن تصنیفوں میں جو پردہ نشین خواتین کی طرف سے آجتک شائع ہوئے ہیں سب سے اعلیٰ درجہ کا ہی اور مصنفہ کے حسن بلاغت اور اعلیٰ درجہ کی طباعی کا نمونہ خیال کرنا چاہیے۔ ایک اور تصنیف اس کی بنام "محاضرات" عثمانی ترکوں کے حالات میں شائع ہوئی ہے۔

خدا نے اس فاضلہ مصنفہ کو نہ صرف ریاضی و فلسفہ، طبیعات، تاریخ، موسیقی وغیرہ علوم اور مختلف زبانوں کی مہارت سے بہرہ مند فرمایا ہی بلکہ علوم مشرقی اور مغربی کے باہم میل جول سے جو اس کی ذات اور لیاقت میں یکجا موجود ہیں ایک خاص جدت اور طرز اس کی تصنیفات میں پیدا کر دی ہی جو اُسکے وجود کو پردہ نشین خواتین اسلام میں قابل ناز اور باعث فخر قرار دیتی ہی۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ جامع علوم مشرقی و مغربی ہی اسکو یورپ کی فاضلہ عورتوں پر بھی فوقیت دیجا سکتی ہی۔

تمّت
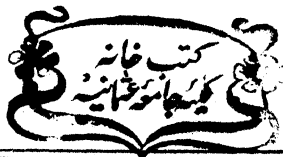
حیات جامی

مولانا عبدالرحمٰن جامی فارسی کے مشہور شاعر کی مکمل اور نہایت دلچسپ سوانح
مصنفہ اسلم جیراجپوری ... ... قیمت

حیات حافظ

خواجہ حافظ شیراز کی سوانح عمری جو ملک میں عام مقبولیت حاصل کر چکی ہے جس
خواجہ حافظ کی زندگی کے حالات کے علاوہ بہت سی تاریخی فالیں جو اُن کے دیوان
نکالی گئیں، درج ہیں۔ مصنفہ اسلم جیراجپوری ... ... قیمت

تاریخ القرآن

قرآن کے ابتدائے نزول سے لیکر اس زمانہ تک کے تاریخی حالات اس میں ہیں۔
اپنے نوعیت کی ایک کتاب ہے۔ مصنفہ اسلم جیراجپوری ... ... قیمت ۸/

جہان آرا

شاہجہاں بادشاہ کی فاضل بیٹی جہان آرا بیگم کی سوانح عمری، اسکے سیاسی، مذہبی،
تمدنی اور علمی کارنامے ... ... قیمت ۸

الفرائض

اہل سنت والجماعت کے قانون وراثت کے متعلق یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اُردو میں اس طرح
تفصیل کے ساتھ کوئی دوسری کتاب اس فن میں موجود نہیں ہے نہایت مکمل اور آسان ہے قیمت

ملنے کا پتہ
اسلم جیراجپوری، علی گڑھ کالج